

# بوکاشی دیوتا

www.urdunovelspk.com

حمید اللہ مغل



## عرض مصنف

کہانی لکھنا ایک مشکل فن ہے، اور اگر کہانی ”ایمانداری“ سے لکھی جائے تو یہ اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ مصنف اور مصنف میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اچھا مصنف وہی ہے جو اپنی تخلیق کے ساتھ انصاف کرے یہ ”انصاف“ مجھے بھائی طاہر جاوید مغل کی تحریروں میں نظر آیا۔ جی ہاں! طاہر بھائی ہی وہ ہستی ہیں جن کی خوبصورت اور لا جواب تحریروں نے مجھے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ میں غیر محسوس انداز میں ان کے لفظوں کی صورت گری کا پرستار بننا چلا گیا اور پھر ایک دن مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں لکھ سکتا ہوں، میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ بھائی طاہر کی سرپرستی میرے لفظوں کے ساتھ سفر کرتی رہی۔ جب کبھی میرا قلم تھکا، ہاتھ نے لکھنے سے انکار کیا تو بھائی طاہر نے حوصلے کی شفیق چھڑی سے اُسے ہانکا اور میرا قلم قرطاس پر روشنائی بکھیرتا چلا گیا۔ میری زیر نظر کہانی ”پر بت کے اس پار“ کے نام سے ایک مقامی ہفت روزہ میں سلسلہ وار شائع ہوتی رہی ہے۔ اس کہانی کے نام کے بارے میں بھائی آفتاب ہاشمی مخمضے کا شکار تھے۔ نام ”بوکاشی دیوتا“ انہیں زیادہ پسند تھا۔ اُنہی کے مشورے کے پیش نظر کہانی کا نام ”بوکاشی دیوتا“ رکھا جا رہا ہے۔ اچھی کہانی کبھی بوزھی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ یہ ہر دور میں پڑھی جاتی ہے ہر زمانے سے اپنی تعریف کا خراج وصول کرتی ہے۔ میں اپنی کہانی کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مصنف تو تخلیق کے قلم سے ایک تصویر بناتا

ہے۔ اس کو بیکار یا شاہکار بنانے والا قاری ہوتا ہے۔

میں یہاں 'HIN' کا ذکر کرنا ضروری سمجھوں گا جس کے تعاون کی صورت میں ۱۲ منزل تک پہنچا۔

## THANK YOU HIN

میں محترم علی سفیان آفاقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے میری کہاں کتابی صورت میں شائع کرنے کی اجازت دی۔

اور آخر میں بھائی آفتاب ہاشمی کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے میری کہانی کو کتابی شکل میں، سرورق سے لے کر پس ورق تک خوبصورت انداز میں پیش کیا، خدا کرے وہ اپنے نام طرح اپنے کام میں بھی چمکتے رہیں روشنی دیتے ہیں۔

## پیش لفظ

رسائل و جرائد کے لئے حمید اللہ مغل اب ایک جانا پہچانا نام بنتا جا رہا ہے۔ وہ ”مختصر“ کے علاوہ قسط وار کہانیاں بھی بڑی مہارت سے لکھ رہا ہے۔ اسرار اور تحیر اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ زیر نظر کہانی میں نے شروع سے آخر تک پڑھی ہے۔ کچھ عام نوعیت کی خامیوں سے قطع نظر یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ خاص طور سے ایسے قارئین جو مہم جوئی، اسرار اور سسپنس میں لپٹی ہوئی کہانیاں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ مصنف کی اس کوشش کو ضرور سراہیں گے۔

یہ کہانی ہمیں ہمارے ماحول سے جدا کر کے ایک الگ دنیا میں لے جاتی ہے اور کچھ انوکھے واقعات اور مناظر سے روشناس کراتی ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ جدید علوم حرف آخر نہیں ہیں۔ ستاروں سے آگے اور بھی جہاں ہیں اور ان جہانوں سے آگے تاروں اور کہکشاؤں کے مزید سلسلے ہیں۔ انسان کا ذہن اور اس کی کارکردگی بہت محدود ہے۔ ہم آگاہی کے ایک وسیع و عریض سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ ہم اور ہماری

سائنس سب کچھ جانتے ہوئے بھی ابھی کچھ نہیں جانتے۔ اس کہانی میں بھی اس حقیقت کا اعتراف موجود ہے اور اس کے علاوہ دلچسپی کے وہ سارے لوازمات بھی ہیں جو آج کے قاری کو پسند ہیں۔

امید ہے کہ حمید اللہ مغل قلم کے ساتھ ناطہ برقرار رکھے گا اور اس کی تحریر میں مزید نکھار آئے گا۔

طاہر جاوید مغل

”یہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ تمام عمر سمجھ ہی نہیں آئی اس کی۔ انسان تمام عمر خواہشات کے پیچھے بھاگتے گزار دیتا ہے۔ کچھ خواہشات پوری ہوتی ہیں، کچھ میں حسرت اور ناامیدی ہاتھ آتی ہے۔ میرا نام علی نواز خان ہے۔ مجھ سے بڑے تین بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کے ہو چکے ہیں۔ چونکہ میں سب سے چھوٹا ہوں، اسی لیے کنوارہ ہوں۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آ سکی کہ ماں دوسری اولاد کی نسبت مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتی ہے۔ رات دو بجے بھی گھر پہنچوں تو میرے لیے کھانا لے بیٹھی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات تو میں چڑ جاتا ہوں۔“

”ماں! اتنی بار کہا ہے یہ سب نہ کیا کرو۔ مجھے گلشن ہونے لگتی ہے۔“

”کیا نہ کیا کروں بیٹا؟“ وہ ہمیشہ کی طرح حلیمی سے کہتیں۔

”یہی جو آپ مجھے اضافی پروڈکول دیتی ہے۔ مدر بھائی، شہباز بھائی، ریاض بھائی بھی تو ہیں۔ آپ ان سے اتنا پیار کیوں نہیں جتاتیں؟“

”بھولے پتر! ماں کے لیے سب ایک سے ہوتے ہیں۔ تو بن بیابا ہے نا اس لیے تیرے اتنے نخرے دیکھتی ہوں۔ کل کو بیوی والا ہو جائے گا تو تیری شکل بھی کئی کئی دنوں بعد نظر آیا کرے گی۔“

سلمیٰ بیگم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئی جیسے اپنے آنسو اندر ہی اندر پی رہی ہو۔ پھر کھکھار کے بولی۔ ”پھر میں فارغ ہو جاؤں گی۔ تیری فکر بھی میرے سر سے اتر جائے گی۔“

”ماں! تو اب بھی بے فکر ہو سکتی ہے۔ میری راہیں تکتا چھوڑ دے۔ خواہ مخواہ اپنا جی جلاتی رہتی ہے۔ میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں۔“

”میرے لیے تو‘ تو بچہ ہی ہے ناں..... میرا پیارا سا منا۔“ وہ میرا سراپنی گود میں لیتے ہوئے کہتی۔ میری جان جل جاتی۔ مجھے ماں کے ایسے رویے سے بے حد کوفت ہوتی۔ میں جھٹ سے اپنا سر ماں کی گود سے نکال لیتا۔ اگر ماں کے رُتے کا خیال نہ ہوتا تو میں ماں کو جھڑک دیتا۔ میرے منہ



بغیر نہیں جی سکتا۔

تین سال میں نے فراق کے کرب میں گزارے۔ پھر انکل مدثر کا خط مجھے نئی زندگی دے گیا۔ انہوں نے مجھے زمبابوے بلایا تھا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میں نے جلدی جلدی سامان تیار کیا اور دو ہفتے کے اندر اندر زمبابوے پہنچ گیا۔ کہتے ہیں انسان ایک خواہش کرتا ہے۔ ابھی وہ پوری نہیں ہونے پاتی کہ دوسری خواہش سینے میں مچلنے لگتی ہے۔ میں نے شروع میں ذکر کیا تھا کہ انسان کی کچھ خواہشات پوری ہوتی ہیں کچھ میں حسرت اور ناامیدی ہاتھ آتی ہے۔ میری زمبابوے پہنچنے کی خواہش پوری ہو گئی تھی مگر دوسری خواہش کے ناقص رہنے کا قلق بہت جان لیوا تھا۔ رابعہ کے تمام پاکیزہ اور لطیف جذبے شاہنواز کے نام ہو چکے تھے۔ میں منجھدار میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ بڑی پر شور اور شوریدہ سرلہریں تھیں جنہوں نے میرا گھیراؤ کیا تھا۔ میں نے بمشکل ایک سال وہاں گزارا۔ جتنی جلدی مجھے یہاں آنے کی تھی اس سے کہیں زیادہ جلدی اب واپس جانے کی تھی۔ جیسے تیسے میں وہاں سے واپس آ گیا۔ رابعہ کا شاہنواز سے التفات اور مجھ سے بے رخی مجھ سے سب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سو میں نے اس سے خیر اختیار کیا تھا۔ میں وہاں سے دوڑ آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رابعہ سامنے ہوگی نہ اس کا غم جلانے کا مگر میں غلطی پر تھا۔ رابعہ کا جادو پہلے سے بھی زیادہ سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ میں نے اپنے دل کو بہت سمجھایا۔ اپنے خیالات کو نئی نیچ پہ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے لگا۔ کھلاڑی کی حیثیت سے میں نے ایک جاب جوآن کر لی۔ فارغ وقت میں بھی میں سخت اور مشقت طلب ورزشیں کرتا رہا۔ اکثر میں برف باری کے موسم میں اسکرود چلا جایا کرتا وہاں میرے ماموں رہتے تھے۔ میں برف کے اندر رہ کر بغیر مونے کپڑے پہنے ورزشیں کرتا۔ اپنے جسم سے عجیب عجیب انتقام لیتا۔ کبھی بے دریغ برف پے کے برسانے لگتا۔ کبھی خود کو کندھوں تک برف میں دھنسا لیتا۔ میری ساری ریاضتیں ساری محنتیں اپنی جگہ مگر رابعہ ایک لمحہ کے لیے بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ اس کا تصور جیسے میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ جب برف سے میرا سارا وجود ڈھکا ہوتا تو میرے ذہن کے درپے سے چلپاتی دھوپ کا منظر ابھرتا۔ ایک مترنم ہنسی گنگنائی ایک مدھر آواز بولتی۔ وہ رابعہ کی آواز ہوتی وہ رابعہ کی بہتے چشموں کی سی ہنسی ہوتی۔ میں تمسلا کر رہ جاتا۔ بے دریغ اندھا دھند برف پر کے برسانے لگ جاتا اور پھر روتے روتے نڈھال ہو جاتا۔ رابعہ کا غم میری جان کا روگ بن گیا تھا۔ میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہاں کہنا چاہوں گا کہ میری سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ میں رابعہ کو بھول جاؤں۔ اُس سے میری شادی نہیں ہو سکتی تھی

سے کچھ نکلتے نکلتے رہ جاتا اور میں پیر پختا ہوا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ مبادا میرے منہ سے کوئی غلط لفظ نہ نکل جائے۔

میں یہاں آپ کو بتاتا چلوں میں مارشل آرٹ میں بلک بیلٹ ٹوڈان ہوں۔ میں نے جاپان میں آٹھ سال اس کی بہت ٹھ تر بیت حاصل کی ہے۔ مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کھیل کا منجھا ہوا کھلاڑی ہوں۔

جاپان سے واپس آنے کے بعد میں زمبابوے اپنے دور کے خالو کرنل مدثر کے پاس چلا گیا۔ وہ وہاں فارسٹ ڈیپلپمنٹ کے شعبے میں جونیئر آفسر تھے۔ جب وہ پاکستان میں ہوا کرتے تھے تو ہمارے ہی محلے میں رہا کرتے تھے۔ میرا اور مجھ سے بڑی بہن صائمہ کا زیادہ وقت انہی کے گھر میں گزرتا تھا۔ کرنل مدثر کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کا نام رابعہ تھا۔

رابعہ انتہا کی نفیس اور پیاری بچی تھی۔ رابعہ کا فسٹ کزن شاہنواز بھی انہی کے گھر رہا کرتا تھا۔ ہم چاروں مل کر خوب اودھم مچایا کرتے تھے۔ طرح طرح کے کھیل کھیلتا ہمارا روزانہ کا مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ کرکٹ، کیرم، لوڈو سے لے کر بانسے، اخروٹ اور گلی ڈنڈا تک سارے کھیل ہمارے مشاغل میں شامل ہوتے تھے۔ لڑپڑنا اور پھر خود ہی مان بھی جانا ہمارے ”کھیل“ میں شامل ہوا کرتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی لمبی دوپہروں میں گھر کے کارنر پر بنے چھوٹے سے باغیچے میں ہمارے دبے دبے قہقہے گونجتے تھے۔ ویران چھتوں اور اُداس منڈیوں پر ہماری ان سنی بولیاں رنگتی تھیں۔ سادوں کی بارش میں جامن کے درخت کے نیچے مونے مونے رس بھرے جامن ہمیں دعوتِ نظارہ دیتے تھے۔

یہ دھوپ چھاؤں چلتی رہی اور پتا بھی نہ چلا زندگی کے آٹھ سال بیت گئے۔ رابعہ اپنے ابو کے ساتھ زمبابوے چلی گئی۔ دھوپ چھاؤں کو اندھیرے کی دیز تہہ نے ڈھانپ لیا۔ میں جس طرف بھی دیکھتا اندھیرا ہی اندھیرا دیکھائی دیتا۔ یہ خواہشیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ انسان کو توڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ رابعہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو دل نے اور طرح سے دھڑکن شروع کر دیا۔ رابعہ کی موجودگی میں یہ پتا ہی نہیں تھا کہ میں کس حد تک اُسے چاہنے لگا ہوں۔ کہنے والے شاید ٹھیک کہتے ہیں کہ فراق کے آتش کدوں میں عشق پیتا ہے اور وصال کے برف زاروں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ میں آٹھ سال رابعہ کے پاس رہا، اس کے ارد گرد رہا..... مجھے کسی قسم کی بے چینی، کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا مگر جو نئی رابعہ نظروں سے اوجھل ہوئی میرے دل کے نہاں خانے میں چھپا عشق زبردست انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ مجھے نہیں خبر ایسا کیوں ہوا؟ مگر میں ایک بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میں رابعہ کے

کیونکہ وہ دل و جان سے شاہنواز کو چاہتی تھی۔ اُس کے تمام دل گداز جذبے شاہنواز کے نام تھے مگر میں ہر کوشش کے باوجود رابعہ کی محبت دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ مجھے زمبابوے سے واپس آئے دو سال بیت چکے تھے۔ یہ دو سال میں نے کس طرح گزارے یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ وہ کون سا جتن تھا جو میں نے رابعہ کو بھلانے کے لیے نہ کیا ہو مگر پتا نہیں قدرت کو کیا منظور تھا۔ ماں شادی کے لیے زور لگا رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میری زندگی میں ہی تو دولہا بن جائے تو میں آرام سے سرسکوں گی۔

ماں کی ایسی بات سن کر میں آنسوؤں سے رو دیا کرتا تھا۔ میں ماں کو کہتا تھا کہ ماں ایسی بات مت کیا کر..... ابھی تو تُو نے میرے بچوں کو کھلانا ہے۔ ماں میری بات سن کر ہاتھ گھما دیا کرتی تھی جیسے کہتی ہو کہ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ اگر میں شادی کر لیتا تو شاید رابعہ کا خیال ذہن میں کچھ ہلکا پڑ جاتا مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں کسی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں منافق نہیں بننا چاہتا تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ رابعہ کی محبت میرے دل سے نہ جاسکے گی۔ رابعہ کا خیال دل میں ہوتے ہوئے کسی اور سے شادی کرنا مجھے ہرگز گوارہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا کہ جیسے رابعہ صرف میرے لیے بنی ہے۔ اُس کی شادی کسی اور سے ہو جائے۔ یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا مگر جو نبی رابعہ کا رویہ مجھے یاد آتا تو تمام جذبات جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھار کو بیٹھے بٹھائے اتنی طبیعت بے چین ہوتی کہ دل چاہتا بھاگ کر زمبابوے پہنچ جاؤں اور ایک نظر رابعہ کو دیکھ لوں۔

ماں میری یہ حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی مگر بے چاری آگے سے بولتی کچھ نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ میں بہت جلد بُرا مانا جاتا ہوں۔ ماں کی محبت میرے دل میں بہت زیادہ تھی مگر پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا تھا کہ ماں کی چھوٹی سی بات بھی تاؤ دلا دیتی تھی۔ ایک دن اس بات کا ذکر میں نے محلے کی مسجد کے مولانا صاحب سے کیا تو انہوں نے بہت اچھا جواب دیا۔ بولے۔ ”بیٹا! خدا ناراض ہو تو ماں کی ہر بات کڑوی لگتی ہے۔“

اُن کے جواب سے میں اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ اُس دن کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ کوشش کر کے پانچوں وقت نماز مسجد میں ادا کیا کروں گا اور اگر ماں کی کوئی بات مان نہیں سکتا تو کم از کم آگے سے بدتمیزی نہیں کیا کروں گا۔

ایک دن رات کا کھانا کھاتے ہوئے ماں مجھ سے بولی۔ ”بیٹا! کل رات میں نے ایک خواب دیکھا..... کہ میں تیرے بچے کو کھلا رہی ہوں۔ بہو بھی میرے ساتھ چار پائی پر بیٹھی ہے۔“

”ماں! اس کا مطلب ہے میری شادی قریب قریب ہی ہے۔“ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔“

”کیا مطلب ماں؟“ میں ایک دم چونکا۔

”لڑکی دیکھ آئی ہوں میں..... ماشاء اللہ بہت خوبصورت ناک نقشے کی ہے۔ بہت شریف اور خاندانی لوگ ہیں۔“

”بس..... ماں..... میں نے وہیں ماں کو روک دیا۔“ ماں میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”بیٹا! اتنا کیوں ستاتا ہے مجھ کو۔ تیرے من میں کیا ہے..... تُو بتاتا کیوں نہیں مجھ کو؟“

”ماں! کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

”دیکھ بیٹا! آج تجھے بتانا ہی پڑے گا۔ ماں ہوں میں تیری..... تُو ساری دنیا کو جھٹلا سکتا ہے ایک ماں کے دل کو نہیں جھٹلا سکتا۔ کسی سے پیار کرتا ہے تو..... نام بتا اُس کا.....“ میں نے غور سے دیکھا۔ ماں کی آنکھوں کے اندر کہیں نمی کروٹیں لے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ نمی آنکھوں کے کنوروں سے پھلک پڑتی، میرا ظرف جواب دے گیا۔ میں نے اپنا دل ماں کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔ وہ بہت جلد سے میری ساری باتیں سن رہی تھیں۔ پھر کچھ دیر سوچتے ہوئے بولیں۔

”دیکھ میرے لال! دنیا میں کچھ بھی آخری نہیں ہوتا۔ ہر چیز کا بدل اس دنیا میں ضرور ہے۔ سوائے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے۔ رابعہ اگر تجھے نہیں ملی تو کوئی غم نہیں ہو سکتا ہے کوئی رابعہ سے بڑھ کر تجھے اچھی لگنے لگے..... تو اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ دے۔ یہ دنیا بڑی ہے یہاں پر ایک سے ایک بڑھ کر ایک خوش نصیبی ہاتھ کھولے کھڑی ہے۔ تیرا دامن ضرور خوشیوں سے بھرے گا۔“

ماں بولے جا رہی تھی اور میں سنتا جا رہا تھا۔ ماں اپنے حساب سے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ ماں تھی اس کے دل میں مامتا ترپتی تھی۔ وہ اپنے بچے کو خوش دیکھنا چاہتی تھی مگر وہ بے چاری اپنے بچے کی خوشی نہیں جان سکتی تھی۔ جس پر بیتی ہے پتا اُسے ہی چلتا ہے۔ ماں کا اب پڑھایا ہوا سبق میں پچھلے دو سال سے دُھرا رہا تھا مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ میں نے یہاں تک بھی کوشش کر کے دیکھی تھی کہ رابعہ کے منفی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اُس سے نفرت کرنے کی کوشش کی تھی اور بُری طرح ناکام ہوا تھا۔ شاید بچپن کے آٹھ سال میرے لاشعور میں پختہ تھے۔ یہ عشق یہ جان لیوا محبت شائد لاشعور کی کارستانی تھی جس سے لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں جان چھڑا نہیں پا رہا تھا۔ رابعہ اب بھی مجھے وہ چھوٹی سی بچی نظر آتی تھی جس نے دو پونی ٹیل کی ہوئی تھیں اور ماتھے کے عین درمیان میں چمکتی ہوئی بندیا لگائی ہوئی تھی۔ رابعہ کے بچپن کی بہت سی تصاویر میری دراز میں پڑی ہوئی تھیں۔ میں اکثر اوقات انہیں

دیکھتا رہتا تھا۔ تب میں اپنے بچپن میں پہنچ جاتا تھا۔ اس دوران ماں مجھے نواز کہہ کر بلاتی تو میں بُری طرح چونک کر حال میں واپس آ جاتا کیونکہ ماں مجھے بچپن میں نوئی کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا۔ ماں نے مجھے ٹھیک نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

وہ میری زندگی کا بہت ہی خوشگوار دن تھا۔ اُس دن انکل مدر کا زمبابوے سے پیغام آیا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں نہایت ضروری کام سے بلایا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں نک رہے تھے۔ اُدھر ماں کے چہرے پر برسوں کی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں جوش میں آ کر ماں کی ٹانگیں داب رہا تھا اور اُن مہربان آنکھوں سے آنسو پٹ پٹ گر رہے تھے۔

”تو پھر چلا جائے گا۔“ ماں معصومیت سے بولی۔

”ماں..... میں ہمیشہ کے لیے تھوڑا جا رہا ہوں۔“

”جاتو رہا ہے ناں..... پتا نہیں کب واپسی ہو.....؟ تیری شکل.....“

”بس ماں!“ میں نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تجھے کتنی دلفنہ کہا ہے ایسی باتیں مت کیا

کر..... تیرے تین بیٹے تو تیرے پاس ہیں ناں۔“

”پر تو تو نہیں ہو گاناں۔“

”میرے ہونے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟“

”ایک ماں سے ایسی بات کیوں کرتا ہے؟“

”ماں! میں تجھے حقیقت بتا رہا ہوں۔“

”ماں سے اُس کا بچہ جھین رہا ہے۔ حقیقت کیسی؟ جھوٹ کیا؟ نہیں بیٹا! جا..... میں تجھے

کیوں روکوں گی.....؟ کبھی ماں بھی اپنے بچے کی ترقی میں رکاوٹ بنی ہے؟ تو کامیاب ہو گا تو میرا

کلیج ٹھنڈا ہو گا۔ جا میرے لال.....“ ماں نے مجھ سے چہرہ پھیر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ماں نے ایسا

کیوں کیا ہے۔ آج سوچتا ہوں تو کلیج منہ کو آتا ہے۔ یہ مائیں بھی کیا ہوتی ہیں؟ اپنے سے جدا کرنا

بھی نہیں چاہتی مگر مستقبل کا سوچ کر جدا بھی کرتی ہیں۔ یہی ملی جلی کیفیت میری عظیم ماں کی بھی تھی۔

انہیں انکل مدر کے خط سے معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے وہاں ایک زبردست نوکری کی آفر ہو رہی ہے۔

اس لیے اس قابل قدر ماں نے سینے پر پتھر رکھ لیا تھا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وقت

رضخت جب میں نے سب بہن بھائیوں، بھتیجے، بھتیجیوں، بھانجے، بھانجیوں سے مل چکا تو ماں کتنی دیر

مجھے ساتھ لگائے کھڑی رہی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ماں کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دھیرے سے اُس کے کان میں بولا۔

”ماں! انشاء اللہ میں ایک سال کے اندر واپس آ جاؤں گا اور دیکھنا تمہاری بہو کو بھی ساتھ لے

کر آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تیرے سے۔“ ماں نے میرے چہرے پر بوسوں کی برسات کر دی۔ اُن

بوسوں میں ممتا کی ازلی تڑپ اور پیاس چھپی ہوئی تھی۔ مجھے یکا یک پتا نہیں کیا ہوا میں پھوٹ پھوٹ

کر رونے لگا۔ ایئر پورٹ پر کھڑے لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں روتا جا رہا تھا اور ماں کے

آنچل میں اپنا چہرہ چھپاتا جا رہا تھا۔

میرے اس طرح جذباتی ہونے نے وہاں رقت آمیز منظر باندھ دیا تھا۔ یکا یک بڑے بھائی

جان آگے بڑھے ساتھ ہی چھوٹی بہن بھی آگے بڑھی اور ان دونوں نے مجھ کو ماں سے جدا کیا۔ بھائی

جان تو باقاعدہ ناراض ہونے لگے۔

”علی نواز! کیا پاگل ہو گیا ہے؟ اتنے لوگ یہاں کھڑے ہیں۔ کیوں خود کو اور ہمیں تماشا بنا رہا ہے۔“

چھوٹی بہن مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔ وہ خود بھی آنسوؤں سے دو رہی تھی۔ میں نے

جاتے ہوئے آخری بار مڑ کر ماں کی طرف دیکھا تو مجھے دھچکے سا لگا۔ ماں پر سکون سی میری طرف دیکھ

کر مسکراتے ہوئے مجھے ”خدا حافظ“ کہہ رہی تھی۔ میں نے بھی جوابی ”خدا حافظ“ کہا اور بیگ تھام

کے اندر داخل ہو گیا۔ بورڈنگ کارڈ لیتے اور جہاز تک پہنچتے میرا ذہن ماں کی طرف سے اُلجھا رہا مگر

جونہی جہاز نے سرزمین پاکستان کو چھوڑا میرے سینے میں طمانیت کی ایک لہری دوڑتی چلی گئی۔ میں

اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ میرے سینے میں ایک عجیب سی ترنگ جاگ رہی تھی۔ میں نے ماں

سے کیا ہوا عہد وفا کر کے دکھانا تھا۔ میں نے رابعہ کو اپنی دلہن بنا کے ماں کے پاس لانا تھا۔ مجھے یوں

محسوس ہو رہا تھا جیسے ماں کی دعائیں میرے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ ان دعاؤں نے میرا حوصلہ پہاڑ

بھتا بلند کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب میں زمبابوے پہنچا تو موسم بڑا ابر آلود تھا۔ انکل مدر مجھے ایئر پورٹ پر ریسیو کرنے آئے

تھے۔ رابعہ کو ساتھ نہ دیکھ کر مجھے مایوس ہوئی مگر میں نے اپنا دل بُرا نہیں کیا۔ ابھی تو نہ جانے مجھے کتنے

بڑے بڑے امتحانوں سے گزرنا تھا۔

میری کہانی شاید یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ انسان کی اپنی پلاننگ، اپنی سوچیں ہوتی ہیں مگر

ایک پلاننگ اوپر والے کی بھی ہوتی ہے جو ہر پلاننگ سے بھاری ہوتی ہے۔ انسان ”سیاہ“ سوچتا ہے اور اُسے ”سفید“ ملتا ہے۔ انسان ”سفید“ سوچتا ہے اور اُسے ”سیاہ“ ملتا ہے۔ مجھے دور دور تک بھی خبر نہیں تھی کہ حالات کا دھارا مجھے کدھر دھکیلنے والا ہے۔ آنے والا وقت میرے لیے کیا کیا عجائبات لانے والا ہے۔ گزرتی ساعتوں میں میری زندگی کے کتنے اہم اور خوفناک فیصلے ہو رہے ہیں۔ میں انکل کے ساتھ گھر پہنچا تو گھربالکل ویران تھا۔ رابعہ کہیں نہیں تھی۔ میرا دل بچھ سا گیا۔ ایک تو وہ ایئر پورٹ نہیں آئی تھی دوسرا گھر سے اُس کی غیر موجودگی نے مجھے دل گرفتہ کیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اُسے میرے آنے کی خبر نہ ہو۔ خیر میں نے انکل کے بتائے ہوئے کمرے میں اپنا سامان رکھا اور کچھ دیر سنانے کے لیے لیٹ گیا۔ نہ میں نے رابعہ کے بارے میں پوچھا نہ ہی انہوں نے مجھے بتایا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو باہر شام ہو چکی تھی۔ بادل کھل چکا تھا۔ ہلکی ہلکی نم آلود ہوا تھی جو طبیعت میں چاشنی بھر رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کیے اور باہر چلا آیا۔ انکل مدر باہر باغیچے میں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ میں اُن کی برابر والی کرسی پر جا بیٹھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرائے اور دونوں ہاتھوں پر وزن ڈالتے ہوئے کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کب سے باہر بیٹھے میرے اُنھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

”آؤ علی بیٹا! اُٹھ گئے۔“

”جی ہاں! انکل۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کچھ تھکاوٹ تو اُتر گئی ہوگی۔“

”کچھ نہیں انکل! ساری تھکاوٹ اُتر گئی ہے۔“

”ہاں بھی! ماشاء اللہ جوان آدمی ہو۔ سفر وغیرہ تمہارے جیسے بندے کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ہم جیسے بوڑھے آدمی تو دو قدم چلیں تو تھک جاتے ہیں۔“ انکل چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے پھر کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

”علی بیٹا! تمہاری مارشل آرٹ کہاں تک پہنچی؟“

”بس ٹھیک جا رہی ہے۔“

”علی بیٹا! اصل میں میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے۔“ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے۔ ”کہ میں چند نو جوانوں کو مارشل آرٹ کی تربیت دلانا چاہتا ہوں اور بہت سوچ و بچار

کے باوجود اس کام کے لیے تم سے بہتر بندہ میری نظر میں کوئی اور نہیں آیا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

”اصل میں بیٹا! ٹھہرو میں تمہیں ذرا کھل کر بتاتا ہوں۔ بیٹا یہاں سے تین سو کلومیٹر دور ایک جنگل ہے جس کا نام کیمبرو ہے۔ کچھ عرصے سے وہاں بڑی عجیب و غریب وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تین مقامی باشندے اب تک ہلاک ہو چکے ہیں۔ وہ جنگل بہت گھنا اور پُر پیچ ہے۔ جنگلی جانور بھی وافر تعداد میں وہاں موجود ہیں۔“

”تو آپ کے خیال سے وہ تینوں مرنے والے جنگلی جانوروں کا نشانہ بنے ہیں؟“

”اگر یہ بات ہوتی تو کچھ غم نہیں تھا مگر مرنے والوں کی گردنیں بڑی صفائی سے کسی تیز دھار آلے سے کاٹی گئیں ہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے یہ کسی انسان کا کام ہے؟“

”یہ کہنا قبل از وقت ہو گا مگر میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ قاتل کوئی بہت غیر معمولی انسان ہے۔ ہو سکتا ہے.....“ انکل کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

میں نے دیکھا اُن کے چہرے کو ایک خوف نے ڈھانپ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد سنبھلے۔ پھر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ ”میں ان باتوں پر یقین تو نہیں رکھتا مگر حالات کا دھارا ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا انکل.....“

”بھوت پریت پر تم کس قدر یقین رکھتے ہو؟“

”میں اسے دماغ کا خلل قرار دیتا ہوں۔ ہر خطے کے انسان میں یہ خلل بدرجہ اتم موجود ہے کہ جس چیز کا سراغ لگانے میں وہ ناکام رہتا ہے اُسے بھوت پریت سے جوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنی کمزوری اور ناکامی کا سارا المیہ غیر مرئی چیزوں پر ڈال کے سرخرو ہو جاتا ہے۔“

”بیٹا بھوت پریت پر تو میرا بھی یقین اتنا ہے کہ یہ چیزیں ہیں مگر انسانوں کی زندگی میں دخل اندازی کو میں بھی نہیں مانتا مگر..... کیا کریں حالات ہی اتنے پُر پیچ ہو گئے ہیں کہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ مرنے والے تینوں بندوں کے سراپے دھڑوں سے غائب ہیں۔ خالی دھڑ ملنے کے بعد بہت سی ٹیمیں اور شکاریوں کو جنگل میں بھیجا گیا تا کہ مقتولین کے سر تلاش کیے جاسکیں مگر کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اُن سروں کی باقیات بھی ہاتھ نہیں آئیں۔ اگر انہیں کسی جنگلی جانور نے بھی کھایا ہے یا بھنبھوڑا

ہے تو اُس کی کچھ نشانیاں تو ہاتھ آئیں۔“

”انکل! ایسے جنگلوں میں آدم خور جنگلی ”حضرات“ بھی تو ہوتے ہیں۔“

میری بات سن کر انکل مسکرا دیے اور کہنے لگے۔ ”بیٹا! ایک طرف تو تم بڑے حقیقت پسند بننے ہو۔ دوسری طرف یہ آدم خور جنگلی..... بات کچھ بنتی نہیں۔“ وہ مجھے چھیڑنے والے انداز میں بولے تو میں بھی اپنے دفاع کے لیے تیار ہو گیا۔

”انکل اس بات کا حقیقت سے تعلق ہے۔ پوری دنیا میں ایسی مثالیں مشہور ہیں۔ یہیں افریقہ میں ہی اندرونی جنگوں میں ایسے کئی قبائل آباد ہوں گے۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد کا ایک واقعہ تو بہت مشہور ہوا تھا۔ کانگو کے جنگلات میں ایک جنگلی آدم خور انسان کو مار گرایا گیا۔ جب پوسٹ مارٹم کر کے اُس کے معدے کا تجزیہ کیا گیا تو اُس میں انسانی اجزا پائے گئے۔ اب اس بات میں کتنی صداقت ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو مگر تم یہ بھول رہے ہو کہ قاتل دھڑو ہیں چھوڑ گئے ہیں اور صرف لاش کا سراپے ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر یہ کام آدم خور قبیلے کا ہے تو وہ دھڑ کبھی گھنے جنگل میں چھوڑ کر روپوش نہ ہوتے۔“

مجھے انکل مدثر کی بات کا قائل ہونا پڑا۔ انکل مدثر نے ایک طویل کش لیا اور گریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔ ”علی بیٹا! میں یہ بات تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جنگل میں پُر اسرار طور پر قتل ہونے والوں میں میرا دیرینہ دوست احمد کمال بھی شامل تھا۔ اس بات کو تقریباً ایک سال بیت چکا ہے۔ میں آج تک اپنے دوست کا غم نہیں بھولا۔ میں نے ہر طرح سے قاتلوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ناکام رہا ہوں۔ تمہیں یہاں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں تم ایک زبردست جنگجو ٹیم تشکیل دو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم تلوار زنی کے بھی بے حد ماہر ہو۔ تمہاری تصویریں اور تمہاری کارکردگی مسلسل مجھ تک پہنچتی رہی ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تمہاری صورت میں غلط آدمی کا انتخاب نہیں کیا۔ مجھے قوی امید ہے کہ تم ایک زبردست گروپ بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ایسا گروپ جو ”کیمبرو“ میں چھائے پچھلے ایک سال کے خوف کو توڑ سکے۔ اس سلسلے میں میرے ایک دوست ”قطب الدین“ نے سچ جنگل کے اندر ایک میلہ بھی منعقد کیا ہے۔“

”کیسا میلہ! انکل؟“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”افریقہ کے منجھے ہوئے شکاریوں کو اس میں مدعو کیا گیا ہے۔ بہت سے شکار کے شوقین

حضرات بھی اس میلے میں شرکت کریں گے۔ اس سلسلے میں جنگل کے سچ زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

جوش و ولولے کی گرم لہریں تھیں جو میرے وجود میں پھیلنے لگی تھیں۔ جذبات کے سمندر میرے سینے میں ہلکورے لینے لگے تھے۔ رابعہ شکار کی بے حد شوقین تھی اور یہ بات تھی کہ رابعہ بھی میلے میں شرکت کرنے والوں میں شامل ہوگی۔ رابعہ کا ذہن میں آتے ہی میرے دل میں کسی نے چٹکی بھری۔ صبح کی سٹھری اور اُجلی دھوپ کی طرح رابعہ کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔

”انکل! رابعہ نظر نہیں آ رہی۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”وہ شاہنواز کے ساتھ کیمبرو میں تیاروں میں مصروف ہے۔“

”کک..... کیا کہا آپ نے رابعہ کیمبرو کے جنگل میں ہے اس وقت۔“

”تم میری بیٹی کو بزدل سمجھتے ہو.....؟“ انکل ہلکا سا تھقہ مار کے بولے۔ ”بہت بہادر ہے میری بیٹی..... شیر تک کا شکار کھیل لیتی ہے وہ۔ شاہنواز نے اپنے ساتھ ساتھ اُسے بھی بہت ٹرینڈ کر لیا ہے۔“ میں انکل کی بات سن کر دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔

ہماری وہاں سے روانگی اگلے دن سہ پہر کے وقت ہوئی۔ رات تقریباً نو بجے ہم کیمبرو کے نواح میں پہنچ گئے۔ ہم بڑی ڈائن اسٹیشن وگن میں وہاں پہنچے تھے۔ ہمارے ساتھ تقریباً چوبیس افراد اور تھے جن میں سے کچھ کو کیمبرو میں ہونے والی تیاریوں کے سلسلے میں جنگل کے اندر جانا تھا۔ اسٹیشن وگن ہم لوگوں کو اتار کر سولہ افراد کو جنگل کے اندر کی طرف چھوڑنے چل گئی۔ اسلحے کی کئی پٹیاں اور کارٹوس بھی وگن کے اندر موجود تھے۔

وہ رات بڑے کرب میں گزری۔ تمام رات چمچروں کے ڈنک جسم سے ہمکام ہوتے رہے مگر صبح نہایت اُجلی اور خوبصورت طلوع ہوئی۔ رابعہ شکاری لباس میں باہر بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ میں خوبصورت لکڑی کے بنے ہوئے ہٹ کے بیڈروم میں لیٹا کھڑکی میں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ گھنے نم آلود درختوں کے پرے سورج اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ گیلے سبزے کی سوندھی سوندھی خوشبو ہٹ کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ میں چھلانگ لگا کر بیڈ سے اُٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی ٹب میں پڑے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ اپنا حلیہ درست کیا۔ تولیے سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا۔ بالوں کو اچھی طرح سے سر پر جمایا۔ کف کھینچ کر بازوؤں کے برابر کیے اور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا ہٹ سے باہر آ گیا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ رابعہ کے سامنے جاتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اُس کی صرف یہ وجہ نہیں تھی

کہ وہ حد سے زیادہ خوبصورت تھی بلکہ اُس کی شخصیت میں ایک وقار چھپا ہوا تھا۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ذہین، فطین اور سمجھدار بھی تھی۔ اُس کی کشادہ پیشانی کے نیچے دھری ہوئی دو چمکتی آنکھیں اُس کی ذہانت کی چغلی کھاتی تھیں۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی دل نواز مسکراہٹ سے نوازا اور دھیمے سے سلام کیا۔ میں سلام کا جواب دے کر اُس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”نوئی! کیسے ہوم.....؟“ وہ مجھے پیچپن سے نوئی کہہ کر بلاتی تھی۔ مجھے اُس کے اس طرح نوئی کہنے پر غصہ آتا تھا مگر میں اُسے کہہ نہیں پاتا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو.....؟“ میں آہستگی سے بولا۔ پھر ناگواری چھپانے کے لیے میں نے گلا کھنکار کر صاف کیا اور گویا ہوا۔ ”سنا ہے شکار کا شوق آج کل بہت پروان چڑھ رہا ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ اُس کی شوخ آنکھیں یکدم چمک اٹھیں۔

”انگل تیار ہے تھے۔“

”تم یہاں رہو گے ناں.....؟“

”تم کہتی ہو تو ابھی چلا جاتا ہوں۔“

”اوکم آن! یار! میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔“

”تو پھر.....؟“

”دو دن بعد یہاں ایک زبردست میلہ منعقد ہونے والا ہے۔ بہت بڑے بڑے شکاری اس میں شرکت کریں گے۔ خوب مزہ رہے گا..... میرا دل چاہتا ہے تم بھی اس میلے میں شرکت کرو۔“ رابعہ نے عام سے لہجے میں یہ بات کہی تھی مگر میرے من میں جیسے شادیانے بج اُٹھے تھے۔

”رابعہ تم کہتی ہو تو میں اس میلے میں ضرورت شرکت کروں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا انگل مدثر نے ابھی میرے متعلق رابعہ سے بات نہیں کی تھی کہ مجھے کس غرض سے یہاں بلایا گیا ہے۔ خیر انگل اس بارے میں رابعہ کو نہ ہی بتاتے تو میرے لیے بہتر تھا۔ تھوڑی دیر بعد شاہنواز سے بھی میری ملاقات ہو گئی۔ وہ بڑے پُر تپاک انداز میں میرے ساتھ ملا۔ آخر ہمارا پیچپن اکٹھا گزرا تھا۔ ایک ساتھ کھیل کر ہم جوان ہوئے تھے۔ دو پہر کا کھانا سب نے تقریباً چار بجے کھایا۔ وہ بھنا ہوا جنگلی ہرن کا گوشت تھا۔ اتنا لذیذ گوشت میں نے ساری زندگی میں نہیں کھایا تھا۔ اُس رات انگل نے سونے سے پہلے ہی ہٹ میں کواٹل لگا کر تمام کھڑکیاں بند کر دی تھیں اور دروازے کھول دیئے تھے۔ سونے تک ہٹ میں چھبرنا پیدا ہو چکے تھے۔ پھر سونے سے پہلے تمام کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی

سے بند کر لیے گئے۔ رابعہ اپنی ایک انگریز سیٹیلی کے ساتھ اوپر والے کمرے میں سو رہی تھی۔ ان کے برابر والے کمرے میں انگل مدثر جبکہ پچھلے کمرے میں میں اور میرے برابر والے کمرے میں شاہنواز سو رہا تھا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں لائٹ جلاتا یا اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ تڑتڑ کی آوازیوں کے ساتھ زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں پے در پے لکڑی کے بنے کیمین میں ٹھک ٹھک کی آوازیوں کے ساتھ پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسی اچانک افتاد کے لیے میں قطعی طور پر تیار نہیں تھا۔ میں نے پیٹ کے بل لکڑی کے فرش پر جست کی اور تیزی سے کراٹنگ کرتا ہوا راہداری کی طرف لپکا۔ ششے ٹوٹنے کے چھنا کے اور چیزوں کی توڑ پھوڑ مجھے اپنی پشت کی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا حملہ آور پچھلی طرف سے میرے کمرے کو نشانہ بنا رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ میرا کمرہ ہٹ کے سامنے والی جانب تھا جبکہ دوسرے کمرے اُس سے ہٹ کر بنے ہوئے تھے۔ موت چنگاریوں کی صورت میں میرے دائیں بائیں حرکت رہی تھی۔ فرشتہ اجل کہیں میرے آں پاس ہی گھوم رہا تھا۔ یکا یک اوپری منزل سے طاقتور بارہا بوری کی آواز گونجی ساتھ ہی پے در پے بارود کے دھماکے ہونے لگے۔ ساتھ ہی نسوانی چیخوں کی آواز بھی اوپری منزل سے آرہی تھی۔ شاید رابعہ کی سیٹیلی واویلہ کر رہی تھی۔ حملہ آوروں کی فائرنگ مدہم پڑ گئی۔ یہی لمحہ میرے کام آ گیا۔ میں نے بھاگ کر جست کرتے ہوئے کندھے کی بھر پور ضرب اسٹور روم کی لکڑی کی دیوار پر لگائی۔ لکڑی کی دیوار ایک زبردست کڑا کے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ چونکہ میں اسٹور روم کا محل وقوع پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اُس کا انتخاب کیا تھا۔ میرا فوری فیصلہ سو فیصد ٹھیک ثابت ہوا تھا اور موت مجھے قریب سے چھوتے چھوتے گزر گئی تھی۔ اسٹور روم کی دیوار جنوبی ٹوٹی میں اسٹور روم کے وسط میں بنائے گئے زمین دوز گڑھے میں گرنا چلا گیا۔ یہ ”زمین دوز گڑھا“ بستر اور لحاف رکھنے کے کام آتا تھا۔ عام طور پر گڑھے میں گرنے والے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں مگر میں گڑھے میں گرنے کے بعد امن میں آ گیا تھا۔ گولیاں اب بھی پے در پے برس رہی تھیں مگر میں گولیوں کی رنج سے دور تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حملہ آور خاص طور پر مجھے نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ چند منٹ تک دو طرفہ فائرنگ ہوتی رہی۔ پھر حملہ آور وہاں سے فرار ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنگل کے جنوبی حصے سے آنے والے انگل مدثر کے آدمیوں کو دیکھ کر وہ لوگ وہاں سے رفو چکر ہو گئے تھے۔ وہ جنگل کے جنوبی حصے سے لینڈ روور جیپ سے رات کے تین بجے ایک اہم پیغام انگل مدثر



کے لیے لار ہے تھے۔

حملہ آور فرار ہوئے تو اوپر کی طرف سے انکل مدثر دونوں لڑکیوں کے ساتھ بھاگ بھاگ نیچے پہنچے۔ اُن کے خیال میں میرا زندہ بچ جانا ناممکن تھا۔ انہیں نے جھٹ سے میرے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ کمرے کی ہر چیز تہس نہس ہو چکی تھی۔ رابعہ کی سہیلی تو مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ سولہ سالہ ایک سفید فام لڑکی تھی۔ لڑکی کا نام رینا تھا اور وہ کیپ ٹاؤن کے ایک کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ چھٹیاں گزارنے یہاں رابعہ کے پاس آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھے مزید تلاش کرتے میں اپنی جائے پناہ سے باہر نکل آیا۔ میں نے ٹوٹی ہوئی لکڑی کی دیوار کی اوٹ سے دیکھا۔ رابعہ کے چہرے پر اہتیار رعبہ کی پریشانی ثبت تھی۔ رابعہ کی پریشانی دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ حالانکہ یہ خوشی کا کون سا موقع تھا۔ جو نبی میں ٹوٹی دیوار پھلانگ کر اُن کے سامنے پہنچا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ انکل مدثر نے مجھے باقاعدہ گلے سے لگالیا تھا۔ میں نے دیکھا رابعہ کے چہرے پر بھی اطمینان نظر آنے لگا تھا۔

”اوگاڈ“ میں بتا نہیں سکتا تمہیں اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔“  
”انکل کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔“  
یکدم رابعہ کی گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور اُس نے ٹپ کر میرا بازو تھام لیا۔ میرا دھیان اپنے بازو کی طرف نہیں گیا تھا وہاں ایک گہرا گھاؤ آیا تھا۔ وہاں سے مسلسل خون بہہ کر لکڑی کے فرش کو داغ دار کر رہا تھا۔ رابعہ بھاگتی ہوئی اندر گئی اور فسٹ ایڈ باکس اٹھالائی۔ پھر اُس نے بڑے تحمل اور تندہی سے میری پٹی کی۔ میں مسلسل پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا رہا۔ یکدم میری آنکھوں میں ریت کے ذرے سے چھبے لگے۔ آنکھوں میں گرم جھلسا دینے والا پانی اُمڈ آیا۔ رابعہ میرے اتنی قریب ہونے کے باوجود مجھ سے کتنی دور تھی۔ میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ رابعہ کا دل تو نہیں بدل سکتا تھا۔ جس دل میں شاہنواز کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

رابعہ میرے بازو پر پٹی کر کے ہنسی تو میں نے تشکر آمیز نظروں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایک دم شاہنواز کا خیال آیا تو میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ میرے برابر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ ”انکل! وہ شاہنواز کدھر ہے.....؟“

”بیٹا! مطمئن رہو۔ وہ رات گئے جنگل کے اندر کمپ میں چلا گیا تھا۔“

”او تھینک! اوگاڈ..... میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔“

اسی دوران باہرا سٹیشن دیگن رکنے کی آواز آئی۔ انکل نے لپک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سب ایک دم چونکے ہو گئے۔ انکل نے دلاسہ دیا اور یہ خبر سنائی کہ شاہنواز اپنے ساتھیوں سمیت آیا ہے۔ اگلے ہی لمحے ہٹ کی طرف بھاگنے کی آواز آئی۔ جھٹ سے دروازہ کھلا اور شاہنواز تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس نے فردا فردا سب لوگوں کی طرف دیکھا۔ پھر میرے بازو پر بندھی پٹی کی طرف دیکھ کر تیزی سے میری طرف لپکا۔

”کیا ہوا یہاں.....؟ علی نواز..... تم ہی بولو۔ یہ سب کیسے ہوا.....؟ کون لوگ تھے وہ.....؟“  
شاہنواز حد درجہ جذباتی ہو رہا تھا۔

انکل مدثر نے اُسے بازو سے پکڑ کر پاس بٹھالیا اور اُسے تفصیلات بتانے لگے۔ شاہنواز نے تمام تفصیل سننے کے بعد باہر کھڑے اپنے ساتھیوں کو ہٹ کے آس پاس بنی جھونپڑیوں پر پوزیشنیں لینے کا حکم دیا۔ اُس کے خیال میں آج پہلے دن پہرے دار جھونپڑیوں میں موجود نہیں تھے اور حملہ ہو گیا تھا۔ حملہ آور کون لوگ تھے؟ اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

پہلے بھی وہاں جھونپڑیوں نے واقعہ تو ہوتے رہتے تھے مگر ایسی دیدہ دلیری پہلی دفعہ دیکھنے میں آئی تھی۔ انکل مدثر کے مشورے سے شاہنواز نے چار گھوڑا سوار جنگل کے جنوب مشرق کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔ جنگل کے اُس نواح میں ایک دم سے ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ اسی دوران صبح ہو گئی۔ اگلا سارا دن حملہ آوروں کے قناعت میں گزر گیا۔ بہت سے گھوڑا سوار جنگل کے مختلف حصوں میں حملہ آوروں کو ڈھونڈتے رہے۔ شام تک یہ سلسلہ چلتا رہا مگر حملہ آوروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ خیر اس معاملے کو یہیں چھوڑ دیا گیا۔ اگلا دن مہمانوں کی آمد کا تھا۔ سب لوگ اس واقعہ کو یاد کر کے میلے کا مزہ غارت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے سب وقتی طور پر اس واقعہ کو بھول کر کاموں میں مشغول ہو گئے۔ دن دس بجے تک وہاں ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی۔ ہٹ کے سامنے چھپوں اور گاڑیوں کی ایک لمبی قطار نظر آ رہی تھی۔

یہ میلہ قطب الدین نے منعقد کیا تھا۔ اس میلے کا روح رواں ”جم کیٹی“ تھا۔ جم کیٹی کے حکم سے ہی قطب الدین نے سارے انتظامات کیے تھے۔ جم کیٹی دنگ شخصیت کا مالک فریبہ اندام انسان تھا۔ اس کی کیپ ٹاؤن میں گاڑیوں کی ایک ورکشاپ تھی۔ اُس کی شخصیت کا سب سے دلچسپ پہلو اُس کی سائڈ جیسی موٹی گردن تھی۔ دور سے دیکھنے والے کو بالکل یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سائڈ چلا آ رہا ہو۔ وہ سیام فام تھا۔ کثرت سے نوشی کی وجہ سے اُس کی آنکھوں کے نیچے گوشت ابھر آیا تھا۔

پہلی نظر دیکھنے سے ہی وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا تھا۔ وہ اپنے دو درجن بندوں سمیت ایک جلوس کی شکل میں وہاں پہنچا تھا۔ قطب الدین اُس کے سامنے کچھ بچہ جا رہا تھا۔ جم کئی اٹھارہ گھوڑے اور تین چیمپیں لے کر وہاں پہنچا تھا۔

دوسری پہنچنے والی ”ٹولی“ میں سات بندے شامل تھے۔ وہ سب تاجر لوگ تھے اور شکار اور کچھ جنگلی جانوروں کو دیکھنے کے شوق میں وہاں پہنچے تھے۔ تیسری ٹولی منجھے ہوئے شکاریوں کی تھی جبکہ ایک بڑی اسٹیشن ویگن کالج اسٹوڈنٹس کی تھی۔ جس میں آدھے لڑکے اور آدھی لڑکیاں شامل تھیں۔ کالج کے چار استاد بھی اُس میں شامل تھے۔

میں یہ سب دیکھ کر حد درجہ حیران ہو رہا تھا۔ شکار کا یہ کیسا شوق تھا جو اتنے انسانوں کو ایک جگہ اکٹھا کر رہا تھا۔ میں انکل مدثر اور شاہنواز والی ٹولی میں شامل تھا۔ میں افریقہ کے بیشتر علاقے گھوم چکا تھا۔ آس پاس کی کئی جگہیں بھی دیکھ چکا تھا جن میں زیمبیا، انگولا، تنزانیہ، کینیا، بورنڈی، کوئگو وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب میں نے تب دیکھے تھے جب کچھلی دفعہ یہاں آیا تھا۔ مصروفیت کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ سو میں پورے دس ماہ ان علاقوں کی خاک چھانتا رہا مگر اب تو میرے پاس مصروفیت ہی مصروفیت تھی۔ میں رابعہ کو اپنی دلہن بنانے کا عہدہ کر کے آیا تھا اور کسی کو عہدہ دے کر بھی آیا تھا۔ مجھے شکار کا قطعی شوق نہیں تھا مگر میں پھر بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اُس کی وجہ رابعہ تھی۔ جنگل میں جانے والے ہر شکاری ہر تاجر ہر اسٹوڈنٹ کے اپنے اپنے نارگٹ اور اپنی اپنی سوچیں تھیں مگر میرا سب کچھ رابعہ پر آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ میری ہر تان رابعہ پر آ کر ٹوٹی تھی۔ مجھے انکل نے یہاں لڑکوں کو ٹریننگ کے لیے بلایا تھا۔ ٹریننگ کے تو دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید اس میلے کے بعد میرا کام شروع ہوتا۔ بہر حال مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں میرا زمبابوے آنے کا مقصد کیا تھا۔ میں اپنی ماں کو وعدہ دے کر آیا تھا کہ رابعہ کو اپنی دلہن بنا کر لاؤں گا۔ اپنی بچپن کی محبت کو اپنے گھر کی ملکہ بناؤں گا۔

سورج نصف النہار پر تھا جب یہ ”شکار قافلہ“ جنگل کی طرف گامزن ہوا۔ چار چیمپیں، تین اسٹیشن ویگنز اور پچیس گھوڑوں پر مشتمل یہ قافلہ جنگل میں بنائے گئے رستے پر آگے پیچھے چل رہا تھا۔ گاڑیاں ایک قطار میں تھیں جبکہ گھوڑے آگے پیچھے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جنگل میں جانے والا یہ راستہ بہت خوبصورتی سے ”تراشا“ گیا تھا۔ اوپر کی طرف سے درخت کاٹ کر گاڑیوں کے گزرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سائینڈوں پر لگے درختوں کے راستے میں حائل ہونے والی شاخوں کو بھی اتنی نفاست

سے کاٹا گیا تھا کہ جنگل کی خوبصورتی بھی متاثر نہ ہونے پائی تھی اور راستہ بھی بن گیا تھا۔ ہر گاڑی کے شیشوں کے باہر لوہے کی مضبوط گرلیں لگی ہوئی تھیں۔ شاید جنگلی جانوروں کی وجہ سے یہ اقدام کیا گیا تھا۔ یہ قافلہ جنگل میں دو کوس اندر تک گیا تو آس پاس کے درختوں اور جھاڑیوں میں جنگلی جانوروں کے آثار نظر آنے لگے۔ میری طرح جو لوگ یہ منظر پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے۔ وہ آنکھ جھپکنا بھول گئے تھے۔ بھڑبھڑے، لومڑ، گیدڑ، ہرن، سور اور اسی طرح کے اور جانور نظر آتے تھے۔ پھر گاڑیوں کے انجنوں کے شور سے چشم زدن سے روپوش ہو جاتے تھے۔ بندر درختوں پر بکثرت گھوم رہے تھے۔

ایک جگہ ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ ایک بھیریا ایک خوبصورت سے ہرن کو گردن کے قریب سے پکڑے دوڑے جا رہا تھا۔ ہرن بھی مسلسل دوڑتا جا رہا تھا۔ میں نے انکل سے پوچھا۔ ”انکل! یہ بھیریا جو ہرن کے ساتھ ساتھ دوڑا جا رہا ہے۔ اسے پکڑ کے نیچے کیوں نہیں گرا لیتا۔“

”علی بیٹا! بھیریا اتنا بے وقوف نہیں ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”بیٹا! یہ بھیریا ہرن کو پوری طرح قابو کر چکا ہے۔“

”مگر انکل ہرن تو بھاگے جا رہا ہے۔“

”بھاگے نہیں جا رہا بھیریا اُسے بھاگنے پر مجبور کر رہا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں حیرانگی سے بولا۔

”بیٹا! بھیریا نے ہرن کو کان سے دبوج رکھا ہے اور وہ اپنی لمبی دم سے ہرن کی پشت پر ضربیں لگا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہرن بے چارہ اُس کے ساتھ ساتھ بھاگنے پر مجبور ہے۔“

”بھیریا اسے بھاگ کیوں رہا ہے؟“

”اپنے ٹھکانے پر لے کر جا رہا ہے اگر راستے میں مار دے گا تو اٹھا کر کیسے لے جائے گا اور اگر کسی نہ کسی صورت اٹھا کر لے بھی جائے تو راستے میں اُسے کسی اپنے ہی بھائی بند سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ اس لڑائی سے بچنے کے لیے یہ ہرن کو اپنی مطلوبہ خفیہ جگہ پر لے جائے گا اور مزے سے تناول کرے گا۔“

”وٹ امیزنگ! انکل!.....“ میں حیرت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

”کسی بے چارے کی جان جا رہی ہے اور تمہارے لیے یہ سب امیزنگ ہے۔“ رابعہ میری

طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ بے چاری بے چارہ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں ترچھی نگاہوں سے رابعہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں بے چاری یا بے چارے کی بحث میں نہیں پڑ رہی۔ ایک جاندار کی جان جانے کی بات

کر رہی ہوں۔“

رابعہ کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔ میں رابعہ سے بات کرنا چاہتا تھا کہ سچ میں شاہنواز بول اٹھا۔

”علی نواز! رابعہ سے یہ پوچھو کہ اگر اُسے کسی کی جان جانے کا اتنا ہی دکھ ہوتا ہے تو وہ شکار کیوں کھیلتا

ہے؟“ شاہنواز ڈرائیونگ کرتے ہوئے چور نظروں سے رابعہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

رابعہ آستین چڑھا کر ایک دم سے سیدھی ہو گئی۔ ”شاہنواز صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے

عرض ہے کہ میں صرف خطرناک جانوروں کا شکار کھیلتی ہوں۔ معصوم جانور تو مجھے جان سے زیادہ

پیارے لگتے ہیں اور..... جو میں خطرناک جانوروں کا شکار کھیلتی ہوں۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ ب

چھوٹے، معصوم اور کمزور جانوروں کی زندگیاں لے لیتے ہیں۔“

”بندر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ رابعہ چونکتے ہوئے بولی۔

”اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ میں نے بندر کے بارے میں کہا ہے بندریا کے بارے میں

نہیں کہا۔“ شاہنواز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ مجھے بھی اُس کی اس بات پر ہنسی آ گئی۔

رابعہ رو دینے والے انداز میں بولی۔ ”پاپا! یہ دیکھیں شاہنواز پھر مجھے چھیڑ رہا ہے۔“

”بھئی تم لوگ اپنے معاملات اپنے تک ہی رکھا کرو۔ مجھ بوڑھے کو سچ میں کیوں گھسیٹتے ہو۔“

انکل مدثر دور بین سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔

”شاہنواز! یہ بندریا والا کیا معاملہ ہے؟“ میں شرارت سے بولا۔

رابعہ مجھ پر آنکھیں نکالنے لگی۔ پھر پھنکار تے ہوئے بولی۔ ”یک نہ ٹخد دو ٹخد۔“

”یہ کیا کہا تم نے ایک نہ شیدائی دو شیدائی۔“ شاہنواز آنکھیں کبیر کے بولا۔

میرے سینے میں درد کی ٹیس سی اٹھی۔ ”ایک نہ شیدائی دو شیدائی۔“ میں رابعہ کے پیار میں

شیدائی تھا اور شاہنواز بھی رابعہ کا شیدائی تھا۔ یکا یک میری آنکھوں میں نمی لہرا گئی۔ کتنی اچھی جوڑا

تھی۔ شاہنواز اور رابعہ کی۔ کتنا اچھا جوڑا ملایا تھا قدرت نے۔ میں کیوں آن پکا تھا ان کے سچ میں

نے اپنا چہرہ اُن سے موڑ لیا اور باہر جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ جنگلی جانور درختوں کے پتوں سچ بھاگ

رہے تھے۔ پھدک رہے تھے اچھل کود کر رہے تھے۔ کتنی پیاری زندگی تھی ان جانوروں کی۔ کسی کا غم تھا

نہ کوئی آس۔ سرسبز زندگی تھی، کھلی ہوائیں تھیں اور معطر فضا تھی۔

میں نے انگلی کی پور سے آنکھ کے کنارے سے نمی صاف کی اور مسکرا دیا۔ شاہنواز اور رابعہ کی

آپس میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو باتیں لگا رہے تھے۔ پھل پھڑیاں چھوڑ رہے

تھے، تھپتھپے اور چپچپیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان کی نوک جھوک مسلسل جاری تھی۔

بچپن میں اکٹھے کھیلتے ہوئے ہم کبھی کبھار ڈرامہ بنایا کرتے تھے۔ کوئی بچہ پولیس مین بنتا تھا،

کوئی ٹیچر بنتا تھا، ایک ہیرو اور ہیروئن ہوا کرتے تھے۔ ہیروئن ہمیشہ رابعہ بنا کرتی تھی۔ تھی ہی وہ اتنی

خوبصورت..... ہیرو بننے پر اکثر جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ پھر رابعہ کہا کرتی تھی کہ شاہنواز اور نونی میں سے

کوئی بھی ہیرو بن جائے۔ یوں ہم میں سے ایک ہیرو بن جایا کرتا تھا مگر اب اصل زندگی میں شاہنواز

ہیرو بن گیا تھا۔

زندگی بھی بڑی عجیب چیز ہے کچھ سمجھ ہی نہیں آتی اس کی۔ میں یہاں صرف اور صرف رابعہ

کے لیے آیا تھا مگر اب میرا دل رابعہ اور شاہنواز کو اکٹھے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ دل بھی قدرت کی

کارگیری کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ کئی طرح کے متضاد جذبے اس میں بیک وقت پختے ہیں۔ میرے

دل کے ایک حصے میں رابعہ کو اپنانے کی بے پناہ تڑپ تھی جبکہ دوسرے حصے میں رابعہ اور شاہنواز کو

اکٹھے دیکھنے کی تمنا تھی۔ میں دو متضاد کیفیات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ شام کا اندھیرا جنگل میں اترنے لگا

تھا۔ جب ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ یہاں جنگل میں منگل والا

معاملہ تھا۔ یہاں ایک قطار میں تین کے قریب ہٹ بنائے گئے تھے۔ دو سو میٹر قطر کا علاقہ اس

فوبصورتی سے گھیرا گیا تھا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ میں تعریف کے جذبات تھے۔ دو سو میٹر قطر کے

ملائے کو جھار جھنکار اور خاردار تاروں سے یوں گھیرا گیا تھا کہ وہ بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ گاڑیاں

حاطے میں جا کر رکیں تو پورے تیزی سے گاڑیوں سے سامان اتارنے لگے۔ گھوڑوں کے باندھنے

کے لیے احاطے کے ساتھ ہی ایک جگہ بنائی گئی تھی۔ اُس جگہ کو بھی چھ فٹ اونچی باڑ لگا کر محفوظ کر لیا گیا

نہا۔

پورے سامان اتار رہے تھے اور سب لوگ ہٹ دیکھ کر محفوظ ہو رہے تھے۔ میں گاڑیوں کے

س کھڑا باڑ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اچانک مجھے کچھ غیر معمولی سا لگا۔ سامان ہٹ میں منتقل کرنے والے

رٹرز سامان کے چھ بڑے بڑے بورے اٹھائے بڑی تیزی اور ہوشیاری سے احاطے سے باہر نکل

”احاطہ ناشر“ اصل میں یہاں کا بیس کمپ تھا۔ ہم لوگوں کو جنگل کے بہت اندر تک جانا تھا۔ یہ باتیں انکل نے مجھے گاڑی میں بتائی تھیں۔ اُن کا خیال تھا اس طرح وہ پُراسرار قاتل کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بتائیں کیوں انکل کی یہ باتیں میرے دل کو کچھ لگ نہیں رہی تھیں۔ اگر یہ لوگ قاتلوں کی تلاش میں نکلے تھے تو اتنے اخراجات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جنگل میں بیس کمپ کی صورت میں ایک ”شہر“ آباد کرنے کا کیا مقصد تھا؟ اگر یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے لیے کیا گیا تھا تو جنگلی زندگی سے ناواقف لوگوں کو ساتھ لانے کا کیا جواز تھا۔ اُن اُن میچور لوگوں میں تاجر حضرات اور پوری کالج وین شامل تھی۔ اس طرح تو وہ سب لوگ اس وقت سخت خطرے میں تھے۔

میں گہری سوچ میں بیٹھا ہی سب سوچ رہا تھا جب گوگی میرے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے سگریٹ سے چرس کی بو آ رہی تھی وہ بدبودار دھواں میرے چہرے پر پھیلتے ہوئے بولا۔

”خان صاحب! کس سوچ میں ہو.....؟“ اُس کا یہ انداز مجھے بہت بُرا لگا۔

میں تمللا کر رہ گیا۔ پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں میرے سوچنے پر کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں! دیے یہ عمر ہی بڑی سوچوں والی ہے۔ کسی کو جان کی فکر کسی کو مالی کی فکر کسی کو.....“ اُس نے فقرہ اچھوڑ دیا تھا۔ اُس کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ اُس نے ”جان کی فکر“ پر خاص طور پر زور دیا تھا تو کیا رات کو مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا یہی گوگی تھا۔ گوگی کا ذہن میں آتے ہی میرا دھیان سیدھا شاہنواز کی طرف چلا گیا۔ میرے دماغ میں زلزلے کے آثار نمودار ہوئے اور ایک جھماکے سے سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ شاہنواز رابعہ سے محبت کرتا تھا جبکہ میں بھی رابعہ کو چاہتا تھا۔ اُس نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔ اُس کی ہٹ سے راتوں رات روانگی بھی اس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ رات کے وقت ہٹ سے باہر نکل گیا تھا اور بہانہ یہ بنایا تھا کہ جنگل میں بیس کمپ کی طرف جا رہا ہے۔

میرے تن بدن میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ شاہنواز کی محبت ایک دم سے اڑن چھو ہو گئی تھی۔ میں نے غور سے گوگی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”گوگی بیٹا! مجھے سب سے زیادہ تیری جان کی فکر ہے۔ اس عمر میں ہڈیاں بڑی کچی ہوتی ہیں۔ بہت جلد ٹوٹ جاتی ہیں۔“ میں پھنکارتے ہوئے بولا۔ اُسے میرے ایسے جواب کی قطعی توقع نہیں تھی۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”خان صاحب! آپ تو بُرا ہی منا گئے ہو۔“

”خبردار! جو مجھے خان صاحب کہا۔“ میرا لہجہ بدستور زہریلا تھا۔ ”اپنے کام سے کام رکھو.....“

رہے تھے۔ سب لوگ گاڑیوں سے کافی آگے نکل گئے تھے۔ کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں تھا پورٹرز نے یہ موقع غنیمت جانا تھا مگر وہ یہ بھول بیٹھے کہ میں گاڑیوں سے دوسری طرف کھڑا یہ سب دبا رہا ہوں۔ میں خود کو اُن لوگوں سے لاطعلق رکھتے ہوئے ہٹ کی طرف بڑھ گیا وہاں خوب شور و غوغا ہوا تھا۔ شکاری حضرات جم کیٹی کے ساتھ بیٹھے تبادلہ خیال میں مصروف تھے۔ ان سے ذرا ہٹ۔ انکل مدثر اور قطب الدین ایک دوسرے سے مصروف گفتگو تھے۔ رابعہ اور شاہنواز کالج ٹور کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ میں آہستگی کے ساتھ چلتا ہوا ایک ہٹ کے باہر بنے ہوئے بیچ پر جا بیٹھا تھا۔

سے پچاس گز کے فاصلے پر شاہنواز کا خاص کارندہ ”گوگی“ بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہ چوڑ۔ شانوں والا ایک کزیل جوان تھا۔ اُس کے کان کی لو سے لے کر نیچے گردن تک ایک پُرانے زخم نشان چلا گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی رنگت ہر وقت سرخ رہتی تھی۔ پہلی نظر دیکھنے سے ہی وہ خطرناک آدمی نظر آتا تھا۔ وہ شاہنواز کا بڑا وفادار ملازم تھا۔ شاہنواز نے انڈیا سے بطور خاص اُسے پاس بلا تھا۔ وہ بیٹھا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور دھیرے دھیرے اپنی لمبی مونچھوں پر انگلی پھیر رہا تھا۔ پیچے بارہ چودہ گھنٹوں سے میرا ذہن رات والے واقع میں بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ ہٹ پر فائرنگ ہوئی اور خاص طور سے مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ یہ حملہ کس نے کرایا تھا۔ میں اس کے بارے میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا مگر ایک بات طے تھی کہ مجھ پر حملہ کرنے والے میرے آس پاس ہی موج تھے۔ میرے ارد گرد ہی اُن کی آنکھیں میری نگرانی کر رہی تھیں۔ مجھ پر حملہ کس نے کرایا اور کیوں کرایا؟ اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔ بہر حال میں نے خود کو بے حد چوکنا کر لیا تھا میں یہاں یہ ذکر کرنا ضروری سمجھوں گا کہ میں پاکستان میں مارشل آرٹ کی بنیاد پر ایک خفیہ ادارہ کی ملازمت کرتا رہا تھا۔ اس ملازمت میں میں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں مجرموں کے پیچھے بھا تھا۔ خطرناک لیروں سے دست بدست لڑا تھا۔ ڈاکوؤں کے ناک میں نکلیں ڈالی تھیں۔ موت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بدنام زمانہ ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں میں بے خطر کودا تھا۔ پریشانیاں خطرات، مشکل حالات میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ ان سے میری بڑی پرانی دوستی تھی۔

انکل مدثر نے اس جنگل کے جو حالات بتائے تھے۔ اُس کے مطابق یہاں ایک سال پہلے تین پراسرار قتل ہو چکے تھے۔ تینوں متتولین کے سر غائب پائے گئے تھے۔ اس واقع نے اس جنگل میں خاصا خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ کوئی شکاری یا مقامی باشندہ ”اندرون جنگل“ تک جانے جرات نہیں کرتا تھا۔ انکل نے مجھے بتایا تھا یہ میلہ اس خوف و ہراس کو توڑنے کی ایک کوشش ہے۔

مجھ سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“

گوگی نے آگے سے کچھ نہیں کہا۔ غور سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر مونچھوں پر ہاتھ پھیر ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر چل دیا۔ میرا پارہ ساتو آسمان کو چھو رہا تھا۔ شاہنواز کا خیال رہ رہ کر میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں نے شاہنواز کیا سمجھا تھا اور اُس نے کیسی کمینگی دیکھائی تھی۔ میرے بس میں ہوتا تو ابھی شاہنواز کو پکڑ لیتا اور مار کر لہو لہان کر دیتا مگر میری تربیت میں یہ چیز شامل تھی کہ غصے اور جلالت میں کیا ہوا اور اکثر خالی ہے۔ قتل مزاجی اور طریقے سے کیا ہوا اور کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مجھے ابھی کچھ انتظار کرنا تھا۔ ابھی چھان بین کرنی تھی۔

وہ چاندنی رات تھی۔ جرنیئر دھڑا دھڑا چل رہے تھے اور جنگل میں آباد شہر جگمگا رہا! جھونپڑے بقیہ نور بنے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود احاطے کے وسط میں آگ کا بڑا الاؤ روشن کیا تھا۔ سب لوگ اُس کے گرد جمع تھے۔ کھانا کھانے کے بعد چائے پی جا رہی تھی۔ انکل مدثر نے کھڑ ہو کر یہ اعلان کیا تھا کہ کل سے شکار کیا ہوا کھانا بکا کر لے گا۔ اُن کے اس اعلان سے ہر طرف خوشی گئی تھی۔ خاص طور پر ”نوادروں“ کے چہرے مسرت سے متمنا ٹھہرے تھے۔ ان لوگوں میں بقیہ میں شامل تھا۔ شاہنواز اور رابعہ جہاں کہیں بیٹھتے تھے ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ میر مقابل ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آگ کی اوٹ سے اُن کے متمنا تے ہوئے چہرے صاف نہ رہے تھے۔ جب سے ہم لوگ اس بیس کمپ میں پہنچے تھے۔ ایک چیز میں نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی۔ جم کئی رینا کی بڑی آؤ بھگت کر رہا تھا۔ وہ اُسے بیٹی بیٹی کہتے نہیں تھکتا تھا۔ مجھے جہاں یاد پڑتا تھا رینا رابعہ کی سہیلی تھی اور کپ ٹاؤن سے چھٹیاں گزارنے یہاں آئی تھی تو جم کئی جیسا رینا کے آگے پیچھے کیوں پھر رہا ہے؟ اس کا رینا سے رویہ ایسا تھا جیسے رینا ملکہ ہو اور وہ اُس کا غلام۔ وہ تو مجھے انکل مدثر سے بعد میں پتا چلا کہ رینا جم کئی کی بھانجی ہے۔

میں آگ کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ سب کی آنکھیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ لوگ سفر کے تھکے ہوئے تھے اور اب رات بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ تھکا تو میں بھی ہوا تھا مگر مجھے سونا تھا۔ رہ رہ کر وہ چھ بورے میرے ذہن میں آ رہے تھے جو پورٹرز نے سب کی نظروں سے بچا احاطے سے باہر درختوں کے نیچے ڈھیر کر کے اوپر درختوں کی ٹہنیاں اور پتے بکھیر دیئے تھے۔ نگاہیں فردا فردا سب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بہت سے اس الاؤ کے پاس سے اٹھنے والے تھے۔

سوں کو ابھی کچھ دیر الاؤ کے گرد بیٹھنا تھا۔ میں سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ایک چہرہ دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ رینا تھی جو مسلسل مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ گڑیا سی لڑکی اتنی پالتی مارے الاؤ سے پرے بیٹھی گھاس توڑ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا جب ہٹ میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ اور شیشے ٹوٹنے کے چھناکوں میں اس لڑکی کی چیخوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ رینا اپنی جگہ سے اٹھی اور غمگین ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کا اس عجیب انداز میں میری طرف دیکھنا اور انوکھے انداز میں میری طرف چل کے آنا کچھ پراسرار سا لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے عجیب پراسرار لہجے میں بولی۔ ”میں دیکھ رہی ہوں تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔“

میں کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ”میں دیکھ رہی ہوں بہت سی بلائیں تمہاری طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ وہ..... وہ تمہارے خون کی پیاسی ہیں۔“ رینا کی آنکھیں خوفناک انداز میں کھل گئی تھیں۔

”رینا! کیا تم غیب کا علم جانتی ہو؟“ میں اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔  
”ہاں.....! شاید.....! ویسے یہاں موجود ہوں۔“ اُس کے پراسرار لہجے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدم اٹھاتی جہاں سے آئی تھی چلی گئی۔ میں ابھی سیدھا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مجھے اپنی کمر کے پاس کچھ ریگلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے لے کر گیا تو ایک چمکدار پلپلا سا سر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اُسے جونہی گھا کر اپنے سامنے کیا زمین و آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ تقریباً تین ساڑھے تین فٹ لمبا ایک سیاہ رنگ کا سانپ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچتا۔ میرے بالکل ساتھ بیٹھے ہوئے شکاری نے پلک جھپکتے سانپ کو پھن سے قابو کر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر کئی نسوانی چیخیں برآمد ہوئیں۔ شکاری سانپ کو لے کر پرے چلا گیا اور اپنی رائفل کے رستے سے اُس کا سر پکچل دیا۔ میرے ذہن میں آمدہاں سی چل رہی تھی۔ رہ رہ کے رینا کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُس نے مجھے خبردار کیا تھا۔ کیا وہ غیب کا علم رکھتی تھی؟ کیا اُنے اگلے وقت کا اُسے پہلے سے اندازہ ہو جاتا تھا؟ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہوئی۔ سب لوگ اپنے اپنے بستر پر پڑتے ہی سو گئے۔ وہ تقریباً رات کے دو کا وقت ہو گا۔ میں آہستگی سے اپنے جھونپڑے سے نکلا اور احاطے کا چکر

کاٹا ہوا گھوڑوں کے پاس پہنچ گیا۔ ایک گیدڑ تیری سے میرے قریب سے بھاگتا ہوا درختوں پر روپوش ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں نارچ تھی اور کندھے سے طاقتور رائفل لٹک رہی تھی۔ ایک طرف جرنیل کی آواز آ رہی تھی۔ دوسری طرف جنگل کے جانوروں کی بولیاں گونج رہی تھی۔ سب سے زیا واضح آواز وہاں گیدڑ کی تھی۔ جنگلی نڈوں اور نیزیوں کی آواز تو مسلسل آ رہی تھی۔ میں محتاط قدم اٹھ ہوا انہی بوروں کے پاس پہنچ گیا۔ جنہیں پورٹرز نے بڑی رازداری کے ساتھ آج شام چھپایا تھا اچانک پتوں سے سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے چشم زدن میں رائفل کندھے سے اتار لی۔ وہ ایک جنگلی کرلا تھا جو سامان سے نکل کر بھاگ دوڑا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس اور جھاڑ جھنکار کو پر کر کے بوروں کو ننگا کر لیا۔ بورے چھونے سے مجھے اندازہ ہوا کہ لکڑی کے لمبے لمبے ٹکڑے ہیں۔ میں نے چھوٹے ٹختر کی مدد سے ایک بورے کا منہ چاک کیا اور ہاتھ ڈال کر ڈنڈا نما لکڑی نکال لی وہ ایک کدال تھی۔ میں نے باری باری ایک ایک بورا دیکھا۔ اُن سب میں کیاں کدالیں اور پھاڑ تھے۔ یہ سب کس مقصد کے لیے یہاں لایا گیا تھا؟ میں ابھی کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے پتوں چرمانے کی آواز آئی۔ بہت سے قدم اسی طرح چلے آ رہے تھے۔ میں نے فوراً نارچ بند کی اور بلی چال چلتا ہوا ایک موٹے تنے کے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔

وہ تقریباً چھ افراد تھے۔ مجھے اُن کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ آوازوں سے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُن میں ایک بھاری آواز جب گونجی تو میں فوراً پہچان گیا۔ وہ جم کیٹی آواز تھی۔ وہ اپنے کارندوں کو جلدی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا اور دبے دبے الفاظ میں انہیں گالیاں بھی نکال رہا تھا۔ ”ولیم! جلدی سے تم گھوڑے نکال کر لاؤ۔ ہمیں جلد از جلد مطلوبہ جگہ پر پہنچنا ہے رینا بیٹی تمہیں اس وقت بے آرامی کی کوفت تو ہو رہی ہوگی مگر مجبوری ہے۔ یہ کام دن کے اُجالے میں ہو بھی نہیں سکتا۔“ میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ رینا بھی ان لوگوں کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ یہ لوگ کسی مشن پر روانہ ہونے والے تھے۔ ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ بہت سی سوچیں میرے ذہن میں پروان چڑھ رہی تھیں۔ میں اپنا سانس روکے درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ پورٹرز گھوڑا پر سامان لا د چکے تھے۔ ایک گھوڑے پر رینا سوار تھی جبکہ ایک گھوڑے پر جم کیٹی سوار ہوا۔ پورٹرز ساتھ بیدل چلتا تھا۔ ابھی وہ لوگ گھوڑے گھما کر مڑے ہی تھے ایک جنگلی بلا میرے پیروں سے لپ گیا۔ وہ میری پنڈلی کو اپنے جڑے میں دبوچ لینا چاہتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا دفاع کر دیا۔ ہوئے بوٹ کی زوردار ٹھوکریں بے کوماری وہ لڑکھنیاں لیتا ہوا دور جاگرا۔ بلا ایک دفعہ پھر حملہ آور؟

چاہتا تھا مگر نارچ کی طاقتور روشنی دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ نارچ کا رخ اس طرف موڑنے والا جم کیٹی تھا۔ میں نارچ کی روشنی میں پورا نہا گیا تھا۔ تمام پورٹرز بھی حیرانگی سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جم کیٹی نے اپنے گھوڑے کی لگام کو جنبش دی۔ گھوڑا است روی سے چلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ جم کیٹی اپنی بھاری آواز میں بولا۔

”مم..... میں یہاں دراصل پیشاب کی غرض سے آیا تھا۔“ میں نے فوراً بہانہ تراشا۔ ”جھوٹوں کے ساتھ ہاتھ رومز بنائے گئے ہیں۔“ جم کیٹی درشت لہجے میں بولا۔ وہ مجھ سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ حالانکہ میں یہاں کی ہر زبان سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ افریقہ کی جنگلی زبان بھی مجھے کسی حد تک آتی تھی۔ یہ سب میں نے اُس ایک سال میں سیکھ لیا تھا جب پچھلی دفعہ میں یہاں آیا تھا۔

”مجھے ان ہاتھ رومز کے بارے میں علم نہیں ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”جم کیٹی کی آنکھوں میں جیسے انگارے دھک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی اپنے کندھے سے رائفل اتارے گا اور بارہ بور کے کئی کارتوس میرے سینے میں اتار دے گا۔ اُس نے رائفل اچانک اپنے کندھے سے اتار لی۔ میں اپنی جگہ ٹھکا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ جم کیٹی گھوڑے سے اتر آیا تھا۔ اُس کے تیور بے حد خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میرے قریب پہنچ کر اُس نے میرا گریبان تھام لیا اور مجھے اپنے قریب کھینچے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ ”تم مجھے بالکل نہیں جانتے..... میں بہت بُرا آدمی ہوں.....“

اسی دوران رینا چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر آئی اور ہم دونوں کے بیچ آتی ہوئی بولی۔ ”چھوڑیں ناں ماموں..... جانے دیں..... ہمیں اس سے کیا لینا.....؟“ رینا کا لہجہ انتہائی التجا آمیز تھا۔ اُس کا التجا آمیز رویہ صاف بتا رہا تھا کہ جم کیٹی کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اگر اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو سمجھو وہ تمہاری زندگی کی آخری بھول ہوگی۔ اب بھی تم میری بچی رینا کی وجہ سے بچے ہو اگر دوبارہ اس طرح ملاقات ہوئی تو یاد رکھنا رینا بھی تمہیں نہ بچا سکے گی۔“ جم کیٹی مجھے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے بولا تھا۔

یکدم میری رگوں میں پٹھان خون اچھل پڑا۔ اچانک میرا دماغ گھوما اور دل میں آئی کہ جم کیٹی سے رائفل چھین کر رینا کے علاوہ وہاں کھڑے تمام آدمیوں کو بھون ڈالوں۔ میں اس غرض سے اٹھا۔ میرے دماغ میں انگارے سے دھک رہے تھے۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔



رینا جیسے میرا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ”ایلی! صبر سے کام لو.....“ اُس نے میرے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ وہ مجھے علی کی بجائے ایلی کہہ کر پکارتی تھی۔ رینا کے ہاتھ میں پتا نہیں کسی تاثیر تھی میرے سینے میں ٹھنڈک سی اترتی چلی گئی۔ وہ لڑکی جیسے کوئی میسا تھی۔ میرے شدید ترین جذبے یکدم سرد پڑتے چلے گئے تھے۔ اگر وہ مجھے نہ روکتی تو یہاں پتا نہیں کیا ہو جاتا۔

”رینا بیٹی! اب چلو بھی..... یہاں کیوں رک گئیں.....؟“ جم کئی شفقت آمیز لہجے میں بولا۔

”ابھی آئی ماموں!“ اُس نے کہا اور تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

”وہاں اُس سے کیا بات کر رہی تھی.....؟“ جم کئی رینا کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”ماموں! میں نے اُسے سمجھا دیا ہے۔ وہ کسی سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔“ رینا نے اونچی آواز میں یہ الفاظ مجھے سمجھانے کے لیے کہے تھے۔ جم کئی ایک قہقہہ مار کر رہ گیا تھا۔

وہ لوگ ادھر سے رخصت ہوئے تو میں بھی ڈھلوان اترتا ہوا جھوپڑوں کی طرف آ گیا۔ احاطے کے وسط میں مسلسل آگ جل رہی تھی اور ایک پہرے دار بیٹھا وہاں اٹکھ رہا تھا۔ وہ پہرے دار بھی یقیناً جم کئی کا کارندہ تھا۔ میں جھوپڑے میں جا کر لیٹ گیا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جھوپڑے میں اٹکل مدثر اور شاہنواز خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میرا دھیان جونہی شاہنواز کی طرف گیا۔ پچھلی فلم میری نظروں میں گھوم گئی۔ میں شاہنواز پر شک کر رہا تھا۔ کیا یہ شک درست تھا؟ کیا مجھ پر ہونے والا حملہ شاہنواز نے ہی کرایا تھا؟ ہو سکتا تھا میں بالکل غلط سمت سوچ رہا ہوں۔ شاہنواز بالکل بے قصور ہو۔ اُس کی شخصیت بالکل اسی طرح بے داغ ہو جس طرح وہ بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ شرمیلا کم گو اور سیدھا سادہ سا۔ اب جب میں زما بوبے پہنچا تھا تو وہ مجھے بڑے تپاک سے ملا تھا۔ اُس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھ سے جلتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایسا کون سا ایٹھو تھا جس کی وجہ سے وہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کراتا۔ اب بھی وہ پرسکون سویا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بے نام سی معصومیت تھی۔

وہ تقریباً چار ساڑھے چار کا وقت تھا جب باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ جم کئی شاید اپنے کارندوں کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ میں نے باہر نکل کر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں ہی بستر پر پڑا لکڑی کی چھت کو گھورتا رہا۔ صبح ہوئی تو انسانوں کی یہ دنیا جاگ اٹھی۔ ہر طرف چہل پہل اور چکاریں

گوںجے لگیں۔ میں کلباڑے سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا جب رابعہ اپنے بالوں کا جوڑا کرتے ہوئے میرے سر پر آن پہنچی۔ وہ بڑی نکھری نکھری دکھ رہی تھی۔

”نونئی! رات کیسی گزری.....؟“ وہ میرے قریب ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئی بولی۔

”جیسے ان جنگل کے جانوروں کی گزری۔“

میرے جواب پر وہ کھل کھلا دی۔ اپنی جھیل سی شفاف آنکھوں کو دائیں بائیں گھما کر بولی۔

”نونئی! ویسے تم بندے بڑے دلچسپ ہو۔“ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ”ایک بات تو بتاؤ نونئی؟“

”ہاں پوچھو.....“ میں لکڑی پر کلباڑے کی زوردار ضرب لگاتے ہوئے بولا۔

”تم یہاں آ کر پور تو نہیں ہو رہے.....؟“

میں اُس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ کلباڑے کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ”جہاں تم جیسا دوست ہو وہاں پوریت کیسی؟“

اُس کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ وہ اپنی فل سیوشرٹ کے بازو وزن کرتے ہوئے بولی۔ ”نونئی! تمہیں کیا لگتا ہے کہ یہ سب لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہیں.....؟“

”شکار وغیرہ!“ میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

”مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔“ رابعہ آنکھیں گھما کر رازداری سے بولی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے.....؟“ میں اُس کے قریب ہو کر بولا۔

”یہی کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ نہیں ہے اور جو نہیں نظر آ رہا ہے وہ سب کچھ ہے۔“

”بات سیدھی کرو..... یہ گھما پھرا کیوں رہی ہو.....؟“

”گھما پھرا کہاں رہی ہوں.....؟ یہیں تو بیٹھی ہوں تمہارے ساتھ۔“

”اچھا بولو بھی! بابا.....“

”تم نے مجھے بابا کس پکر میں کہا.....؟“

”جیسے تم مجھے نونئی کہہ کر بلاتی ہو.....“ بہت دُٹوں بعد یہ موقع ہاتھ آیا تھا کہ میں اُسے کہہ سکوں کہ وہ مجھے نونئی نہ کہہ کرے۔ ”نونئی“ نام سے مجھے سخت چڑھتی۔

”نونئی تمہارا نام ہے.....“ وہ زور دیتے ہوئے بولی۔

میں بھی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا۔ میں اُس کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُن کے بارے میں ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتا تھا۔ سو وہ موقع مجھے آج مل گیا تھا۔ ہم دونوں ایک دیودار کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! زندگی انسان کو کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔“ اُس نے ٹھہر کر سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور پھر بولتا چلا گیا۔ ”بچپن میں ہی میرے ماں باپ وفات پا گئے۔ میں اس دُنیا میں اکیلا رہ گیا۔ چچا مدثر کا خدا بھلا کرے اُنہوں نے مجھے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، جوان کیا۔ وہ سب کچھ مجھے دیا جس کی میں تمنا کر سکتا تھا۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اتنی دولت کمائوں اتنی دولت کمائوں کہ چچا مدثر کے تمام قرضے اتار دوں۔“

”قرضے اتار دوں..... میں کچھ سمجھانہیں.....“ میں نے شاہنواز کی بات کو ٹوکا۔

”ہاں علی نواز..... انکل پر اس وقت چار لاکھ ڈالر زقرضہ ہے جو اُنہوں نے یہاں کے بینک سے لیا تھا۔“

”تو پھر.....؟“

”وہ قرضہ والی رقم اُنہوں نے ایک کام پر لگا دی۔ کام بُری طرح فلاپ ہو گیا اور وہ قرضے کے نیچے آ گئے۔ ان کا گھر نیلام ہو چکا ہے بقیہ قرضے کی رقم ابھی باقی ہے۔ مجموعی طور پر اُن کی معاشی حالت بہت پتلی ہے۔“

”اوہ یہ تو بہت بُرا ہوا.....“ میں تاسف میں بولا۔

”مگر یہ قرضہ فوری طور پر اُتر سکتا ہے۔“ شاہنواز کی آنکھیں یکدم چمک اُٹھیں۔

”وہ کس طرح.....؟“

”اگر تم میری مدد کرو۔“

”میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔“

”تو پھر سنو.....“ اس نے کہا اور نان اسٹاپ مجھے کہانی سنانے لگا۔ میں سنتا گیا اور حیرت کے عمیق سمندر میں غرق ہوتا چلا گیا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ شاہنواز کے کہنے کے مطابق جم کیشی کی اس جنگل میں آمد کسی بہت خاص مقصد کے تحت ہے اور وہ مقصد ایک دینے کی تلاش تھی۔ اُس دینے میں اربوں ڈالر مالیت کا سونا اور جواہرات موجود تھے۔ یہ دینہ دو سو سال قبل کیمبرو کے گھنے پُرجے اور خوفناک ترین جنگل میں دفن کیا گیا تھا۔ دفن کرنے والے فوجیوں نے اُس کا نقشہ اور معلوماتی تفصیلات بھی کسی جگہ دفن کر دی تھیں۔ وہ تمام فوجی پہلی جنگ عظیم میں مارے گئے۔

”میرا نام علی نواز خان ہے! مس.....“

”میں تو تمہیں فونی کہہ کر ہی بلاؤں گی.....“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

”اگر مجھے بُرا لگے تب بھی.....“

”تمہیں میرا فونی پکارنا بُرا لگتا ہے.....؟“ وہ یکدم عجیب سے لہجے میں بولی۔

”ہاں..... بہت زیادہ.....“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً چوٹ ماری۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں آج کے بعد تمہیں علی نواز خان کہہ کر بلا لیا کروں گی۔“ وہ منعمومی بولی۔

”صرف علی نواز..... خان لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا خیر مجھے بتاؤ تم کچھ کہہ رہی تھی۔“

”نہیں..... کچھ بھی تو نہیں.....“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

”او کم آن یار..... وہ ہی جو نظر آ رہا ہے وہ نہیں ہے والی بات.....“

”اوہ مجھے یاد آیا.....“

”شکر ہے تمہیں یاد تو آیا۔“

”یہ لوگ دراصل.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور آس پاس دیکھنے لگی۔ دور سے گوگی ہمارے

طرف چلا آ رہا تھا۔ رابو نے بات کا موضوع بدل دیا تھا۔ گوگی ہمارے قریب ہی آ کر بیٹھ گیا۔

نواز صاحب! آپ کو مدثر صاحب نے بلایا ہے۔“ وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور اُنٹھ کر انکل مدثر کی طرف چلا گیا۔ انکل مدثر جم کیشی۔

مصروف گفتگو تھے۔ اُنہوں نے مجھے بھی قریب ہی بیٹھالیا۔ میں جم کیشی کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مردود انسان مجھے بیٹا بیٹا کہہ کر تھکتا نہیں تھا۔

انکل نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا۔

رہ رہ کر مجھے اُس ذلیل آدمی پر طیش آ رہا تھا۔ اس کا رات والا رویہ میرے دماغ پر ہتھوڑ

برسا رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔ اسی دوران شاہنواز بھی کہیں سے آن پکا۔

میرے کندھے پے دھپ مارتے ہوئے بولا۔ ”سناؤ بھئی! علی نواز کیسے مزاج ہیں.....؟“ وہ خوشگ

موڈ میں بولا۔

”ٹھیک ہوں..... تم بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟ جب سے میں یہاں پر آیا ہوں تم سے مل بیٹا

بات ہی نہیں ہو سکی.....“ میری بات سن کر وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور میرا بازو کھینچتا ہوا جنگل کی طرف

پڑا۔ ”آؤ تنہائی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”اس نایاب جانور کو مار کر اُن کو کیا ملتا ہے؟“ میں سوالیہ لہجے میں بولا۔

”اگر تم نہیں جانتے تو میں بتائے دیتا ہوں کہ اُس کے سینگوں کو خنجر کے دستے بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور سب سے بڑی اور دلچسپ بات یہ کہ اس کے سینگوں کا سفوف انتہائی مہنگی دواؤں میں شامل ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔“ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”گینڈے کے غیر قانونی شکاری وجہ سے فارسٹ انتظامیہ نے شکاریوں کی جنگل میں آمد پر بہت زیادہ سختی کر دی مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سختی نرم پڑتی گئی۔ جو ایک سال دینے کی تلاش کے بغیر گزرا وہ اصل میں وہی شکاری سختی والا سال تھا۔ اب چونکہ پابندی نرم ہو چکی ہے اور حالات ابھی سازگار ہیں۔ اس لیے تلاش کا سلسلہ پھر سے چل نکلا ہے۔“

”حالات ابھی سازگار ہیں۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”جم کیٹی بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ اُس نے ایک گیم کھلی ہے۔ وہ ظاہر یہ کر رہا ہے کہ اس نے شکار میلہ منعقد کیا ہے مگر ”مدعوین“ اُس کے اپنے بندے ہیں۔ سوائے کالج کی بس کے کالج گروپ ساتھ اس لیے شامل کیا گیا ہے تاکہ انتظامیہ یہی سمجھے کہ ”نیو جنریشن“ کو شکار کے متعلق تربیت دی جا رہی ہے۔“

”اُس کا مطلب ہے یہ سب شکاری لوگ۔۔۔۔۔ تاجر لوگ۔۔۔۔۔ جم کیٹی کے بندے ہیں؟“ میں چونکتے ہوئے بولا۔

”ہاں اور ہم سب لوگ بھی۔“ شاہنواز کچھ سوچتے ہوئے رُکا۔ پھر بولا۔ ”علی نواز ایک بات اچھی طرح ذہن میں رکھنا۔ جم کیٹی بہت پہنچا ہوا آدمی ہے۔ اس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں۔ اسے کوئی معمولی آدمی نہ سمجھنا۔“ میں دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ”وقت آئے گا تو میں بھی اس جم کیٹی کو بتادوں گا کہ میں کیسا آدمی ہوں۔“ میں زیر لب بڑبڑایا۔

”کیا کہتا تم نے۔۔۔؟“ شاہنواز بولا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔“

شاہنواز بھی اُٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے شروع میں ایک بات کے متعلق تم سے پوچھا تھا اور تم نے کہا تھا میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔“

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اگر تم میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کے چلو تو ہم لوگ دینے تک پہنچ سکتے ہیں۔“ میں

مُدغا سکر کے ایک کسان کو کھیت میں بل جوتے ہوئے وہ باکس مل گیا جس میں دینے کے نقشہ جات اور دوسری تفصیلات رقم تھیں۔ اُس نے باکس گھر سنبھال چھوڑا اور تمام کاغذات ڈسٹ بن میں ڈال دیئے۔ وہاں سے یہ کاغذات ردی خانے پہنچے۔ ردی خانے کا مالک ”موویوں“ زیادہ موٹے اور پتلے کاغذ علیحدہ علیحدہ کر رہا تھا کہ اُس کی نظر ان کاغذوں پر پڑی۔ اُس نے یہ کاغذ علیحدہ رکھ چھوڑے۔ جم کیٹی اپنے کاغذ کے تاجر دوست کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ یہ گھاگ آدمی تھا۔ اُس نے کاغذ دیکھے اور پھر جھٹ سے اپنے کوٹ میں چھپا لیے۔ اُس نے کیپ ٹاؤن آ کر اُن کاغذات کو پڑھا تو اُس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اُس کو دینے کے نقشہ جات اور معلومات مل گئی تھیں۔ وہ پورے اٹھ صفحات کی کاپی تھی جس میں سے ایک صفحہ غائب تھا۔ وہ ایک صفحہ سب سے اہم تھا۔ اُس ایک صفحے کے بغیر یہ کاغذات بیکار تھے۔ جم کیٹی جیسا لالچی آدمی سب کچھ دیکھ کر دیوانہ سا ہو گیا تھا۔

وہ فوراً دوبارہ مُدغا سکر پہنچا۔ اُس نے اپنے طور پر سارا کبابز خانہ چھان مارا مگر ”جو ہر مقصود“ ہاتھ نہیں آیا۔ جم کیٹی مُدغا سکر سے ناامید اور ناامراد واپس آیا مگر وہ اتنی جلدی آرام سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اُس نے اپنے گماشتے کیمبرو کے جنگل میں داخل کر دیئے۔ میں دن وہ لوگ دینے کی تلاش میں لگے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس دوران جم کیٹی کے تین آدمی پُر سر اور طور پر مارے گئے۔ تینوں کی لاشوں سے اُن کے سر غائب تھے۔ اس بات کو تقریباً ایک سال بیت چکا ہے۔ اس سنگین واقعے کے بعد جم کیٹی نے دینے کی تلاش ترک کر دی۔ اُس کے خیال سے نقشہ جات کے آٹھویں صفحے کے بغیر دینے کی تلاش ناممکن تھی۔ سات صفات میں جنگل کا تعین تو تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کی شہادت بھی ملتی تھی کہ خزانہ بہت غیر معمولی گہیر کے درخت کی جڑ میں دفنایا گیا ہے۔

شاہنواز ایک لمحے کے رُکا اور دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! یہ جنگل بہت بڑا ہے۔ سینکڑوں میل میں اس کا رقبہ پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کسی ایک موٹے تنے کے درخت کی دریافت اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ جنگل جنگلی جانوروں اور درندوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک ایک قدم پر موت منہ کھولے کھڑی ہے۔“

”تم کہہ رہے تھے جم کیٹی۔۔۔۔۔ میں کہتے کہتے رُک گیا۔

”ہاں میں اسی طرف آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ ایک سال جم کیٹی نے بڑے کرب میں گزارا۔ اصل میں سفید گینڈے کی نسل تقریباً ختم ہونے کے قریب ہے۔ تمہارے علم میں ہو گا کہ نامعلوم لوگ ان کا غیر قانونی شکار کھیلتے ہیں۔“

اُس کی بات سن کر ہنس دیا۔

”شاہنواز! جم کیٹی سال ڈیڑھ سال سے ان جنگلوں میں خوار ہو رہا ہے اُسے تو دینے کی ہوا تک نہیں ملی اور تم کہتے ہو.....“ میں نے فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

”نہیں علی نواز..... نہیں تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔“ وہ سگریٹ ہاتھ میں پکڑے نفی میں اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ایک کڑی ہے جس کی وجہ سے ہم دینے تک پہنچ سکتے ہیں..... اور وہ کڑی ہے ایک لڑکی۔“

”ایک لڑکی.....؟“

”ہاں اُس کا نام رینا ہے..... وہ..... وہ بڑی غیر معمولی لڑکی ہے۔“ شاہنواز کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“

”وہ بلا کی ذہین اور پیش بین ہے۔“

”پیش بین ہے.....؟“ میں سوالیہ انداز میں بولا۔

”ہاں..... وہ آنے والے وقت کے بارے میں اندازہ لگاتی ہے اور اُس کا اندازہ عام طور پر

ٹھیک ثابت ہوتا ہے۔“

شاہنواز کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ مجھے کل رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ جب چلنے والاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے رینا میرے پاس چلی آئی تھی اور اُس نے کہا تھا۔ ”مسٹر ایل! میں دیکھ رہی ہوں تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔“ اُس کے جانے کے بعد فوراً میری کمر پر کچھ ریگا تھا اور جب میں نے پکڑ کر اُس ریگنے والی چیز کو اپنے سامنے کیا تھا تو وہ ایک سانپ تھا..... تو..... تو کیا شاہنواز کی بات سچ تھی.....؟ کیا واقعی رینا حیرت انگیز قوتوں کی مالک ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ تمام کڑیاں خود بخود دلتی چلی گئیں اور ایک پورا اور واضح منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جم کیٹی کا رات کے پچھلے پہر کوکوٹھڑے پر بٹھا کر جنگل کی طرف جانا۔ اس بات کی واضح دلیل تھا کہ جم کیٹی اب بھانجی کی حیرت انگیز قوت کو خزانے کی تلاش میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔

”شاہنواز مجھے ایک بات بتاؤ..... تم نے کہا تھا کہ ہم رینا کے ذریعے دینے تک پہنچ سکتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے.....؟ رینا جم کیٹی کی بھانجی ہے وہ کیونکر.....؟“

”یہی تو مزے والی بات ہے۔ رینا مجھے پسند کرتی ہے۔“

”اور تم.....“ یکدم میرے سے نکلا۔

”اور میں بھی.....“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

کیبارگی میرا دل بہت زور سے دھڑکا۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ میں بمشکل اپنے جذبات کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہنواز! رابعہ.....“ میں نے فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

”رابعہ.....“ اُس نے ایک چھوٹا سا قہقہہ مارا۔ پھر گویا ہوا۔ ”بڑی عجیب لڑکی ہے..... شرارتوں کی تو پٹاری ہے وہ..... ہر وقت مذاق..... ہر وقت چھیڑ چھاڑ..... نوک جھونک.....“ وہ مسکرایا۔

”شاہنواز! میں اُس کی ہسٹری تم سے نہیں پوچھ رہا۔“ میری دھڑکنوں میں بلا کی بے چینی تھی۔

”تو پھر تم نے کیا پوچھا ہے.....؟“

”تم اُس سے شادی نہیں کر رہے.....؟“ میرے چہرے اور ہاتھوں پر چیونٹیاں سی ریگ رہی تھیں۔ میری زندگی کا ایک نہایت اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔

میری بات سن کر شاہنواز ہنس دیا۔ ”شادی..... اور رابعہ سے.....؟“

”کیوں اس میں کیا خرابی ہے؟“

”جان من..... وہ میری بہترین دوست ہے۔ ہم اکٹھے پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہیں۔

میں نے کبھی اُس کے بارے میں ایسا سوچا ہی نہیں..... میری بننے والی ذہن کا نام رینا ہے۔“

سینکڑوں سورج ایک ساتھ میرے ذہن میں طلوع ہوتے چلے گئے۔ اُن کی حدت سے میرا سارا من پگھلنے لگا۔ فرط مسرت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بوڑھی ماں کی شکل میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ میں اپنی پیاری ماں کی خوشی کے لیے اتنی دور چلا آیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ رابعہ کے علاوہ میں کسی لڑکی سے شادی نہ کر سکوں گا۔ رابعہ کو حاصل کرنا کسی نفسانی جبلت کے تحت نہیں تھا۔ وہ میری زندگی کے لیے ایسے ہی ناگزیر ہو چکی تھی جیسے زندگی کے لیے سانس..... جیسے پھول کے لیے خوشبو..... جیسے شفق کے لیے سرنی..... جیسے نباتات کے لیے ہوا..... میں جب شاہنواز کے ساتھ وہاں سے واپس پلانا تو میرا دامن خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے اور رابعہ کے درمیان شاہنواز نہیں تھا۔ میں رابعہ کا دل جیت کر اُسے اپنی ذہن بنا کر اپنے پیارے وطن لے جا سکتا تھا۔ ماں کی دعائیں میرے ساتھ ساتھ تھیں۔

شام کا کھانا بڑا تکلف تھا۔ کھانے میں ایک ڈش خرگوش کی تھی جبکہ دوسری ڈش چڑکارہ غزال

نہ کرتے تو وہ ہم پر حملے میں پہل کر سکتا تھا اور اُس کے حملے میں پہل سے جو کچھ یہاں ہونے والا تھا وہ سبھی کو معلوم تھا۔ شیر ہماری طرف ہی چلا آ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ برسوں بے بھاری تھا۔ سب کے دل بُری طرح سے دھڑک رہے تھے اور دھیان ہیری کرس کی طرف لگا ہوا تھا۔ شیر ہماری طرف بڑھتے بڑھتے دوسری سمت کو نکل گیا۔ ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا جب ایک شکاری نے شیر پر فائر داغ تھا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور گولی سیدی شیر کی پچھلی ٹانگ میں لگی۔ ایک زوردار دھاڑنے پورے جنگل کو لرزادیا۔ وہ منہ میں دبے ہوئے چیٹیل کو پھینک کر بڑی سرعت سے مڑا۔ اُس کے بھاری بھر کم وجود کا مڑنا اور تیزی سے ہماری طرف لپکنا۔ ایک خوفناک اور کلیجہ لرزادینے والا منظر تھا۔ سفر شروع ہونے سے پہلے سب نئے بندوں کو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ جتنا بھی خوفناک منظر ہو اپنے حواس پر قابو رکھنا ہے۔

ایسے لمحوں میں حواس باختہ ہونے سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ سب نے اس وقت اقرار میں سر ہلایا تھا مگر شیر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر سب لوگ اپنے کیے عہد اور وعدے بھول کر چیخ و پکار کرتے ہوئے پیچھے کو دوڑ پڑے تھے۔ ہیری کرس ہی واحد وہ شخص تھا جو شیر کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بھی ڈٹا ہوا تھا۔ اُس نے بے پناہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اوپر نیچے تین فائر شیر کی طرف داغ دیئے۔ شیر نے بھاگتے بھاگتے یکدم پینتر بدلا اور دائیں طرف کو ہوتا ہوا جنگل میں روپوش ہو گیا۔ آنا فانا سب لوگ پھر سے اکٹھے ہو گئے۔ اکثر اُن میں سے سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ ہیری کرس فائر کرنے والے پر سخت ناراض ہوا۔ فائر کرنے والا گوگی تھا۔ اُسے جم کینٹی سے بھی خوب ڈانٹ پڑی۔ ہیری کرس چند لمحے کھڑا ہو کر سب لوگوں کو ضروری ہدایات دیتا رہا۔ پھر یہ قافلہ جنگل میں دائیں طرف کو آگے بڑھ گیا۔ شیر اس کے مخالف سمت درختوں میں روپوش ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد سب لوگ بے حد ہونکے ہو گئے تھے۔ ہیری کرس نے سب لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ جب شیر کے منہ میں شکار دبا ہو تو وہ کسی طرف دھیان نہیں کرتا اور نہ ہی کسی پر حملہ کرتا ہے۔ میں نے اسی لیے منع کیا تھا کہ فائر نہ کیا جائے۔ شیر خود بخود ہی وہاں سے چلا جائے گا۔

”مگر ایسا نہیں ہوا.....“ ہیری کرس نے افسوس کے ساتھ کہا۔

پھر وہ گوگی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے شیر آدم خور کب بنتا ہے.....؟“  
اُس کا جواب نہ پا کر وہ خود ہی بولا۔ ”جب اُس کا شکار اُس سے چھین لیا جاتا ہے وہ پھر انسان پر حملہ کرتا ہے۔ جب انسانی خون اُس کے منہ کو لگ جاتا ہے تو اسے کسی کروٹ چھین نہیں آتا۔ وہ ہر وقت

ہرن کی تھی۔ سب لوگ انگلیاں چانتے رہ گئے۔ اکثریت کا کہنا تھا کہ اُن لوگوں نے زندگی میں ایسا لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ وہ رات سکون سے گزر گئی، کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ اگلا دن سب کا بہت مصروف گزرا۔ سب لوگ سامان کی پیکنگ کرتے رہے۔ اگلے روز سب لوگوں کو جنگل کے اندر کی طرف پیش قدمی کرنا تھی مگر یہ سفر گاڑیوں کا نہیں تھا بلکہ یہ سفر سب نے پیدل طے کرنا تھا۔ تمام گھوڑے بھی ساتھ ہی چلنا تھے۔ اُن میں کچھ پر سامان لادا جانا تھا اور کچھ پر ایسے افراد نے سوار ہونا تھا جو چلنے کی بہت زیادہ استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

اگلے دن صبح ہی صبح اس سفر کا آغاز ہو گیا۔ چار بندوں کو ”بیس کمپ“ میں احاطے کی حفاظت کے لیے رہنا تھا۔ ان چار افراد کو چھوڑ کر سارا قافلہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ صبح کے چھ کا وقت تھا۔ ایک بے نام سی خنکی تھی جو جنگل میں یہاں سے وہاں رقص کر رہی تھی۔ ہم کل چالیس کے قریب افراد تھے جن میں صنف مخالف کی تعداد بارہ تھی۔ چار منجھے ہوئے شکاری آگے چل رہے تھے جبکہ آٹھ دس شکاری پیچھے چلے آ رہے تھے۔ تمام لڑکیوں کو بیچ میں رکھا گیا تھا تاکہ کسی خطرناک صورت حال میں اُن کی حفاظت کی جاسکے۔ رابعہ شاہنواز کے ساتھ شکاریوں کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ آگے چلنے والے تین شکاریوں میں ایک کا نام ہیری کرس تھا۔ وہ بہت منجھا ہوا شکاری تھا۔ اُس کے تیس سال افریقہ کے جنگلوں میں گزرے تھے۔ آہٹ سن کر وہ جانور کی موجودگی کا اندازہ کر لیتا تھا۔ وہ تمام رستے سب لوگوں کو بڑی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہا۔ ابھی ہم لوگوں کو چلتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا جب رستے کے بائیں جانب کچھ آہٹ پیدا ہوئی۔ ہیری کرس نے منہ پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر گھوڑوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ جانور خطرے کی بو بہت دور سے سونگھ لیتا ہے۔ یکدم جھاڑیوں کے اندر سے غراہٹ بلند ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی درندہ کسی جانور کو پھنپھوڑ رہا ہے۔ پھر ایک منظر سب کو حیران کر گیا۔ ایک درمیانی جسامت کا شیر اچانک جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔ اُس کے منہ میں ایک چیٹیل کا بچہ دبا ہوا تھا۔ بڑا ہی سنسنی خیز منظر تھا۔ شیر کے بارے میں پڑھنا یا اُسے پردہ سکرین پر دیکھنا اور بات ہے۔ اُسے کھلے جنگل میں اپنے روبرو پانا اور واقعہ ہے۔ جو جہاں جہاں تھا وہیں پر کھڑا رہ گیا۔ شاہنواز اعشاریہ 577 کی راتقل سے شیر کا نشانہ لینا چاہتا تھا مگر ہیری کرس نے بڑی سماعت سے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کر دیا۔ ہیری کرس دبے لفظوں سے سب کو پیچھے پیچھے ہٹنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہیری ایسا کیوں کر رہا ہے؟ حالانکہ شیر جیسا موزی درندہ گن پوائنٹ پر تھا اگر ہم فائر میں پہل

انسانوں کی تاک میں رہنے لگتا ہے۔ کبھی کبھار مجبور ہو کر بستیوں کا رخ بھی کر لیتا ہے۔ پھر..... پھر بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیتا ہے۔“ ہیری کرس کے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ بھگوڑا شیراب سب لوگوں کے لیے نہایت خطرناک تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے سے چہ گویاں کرنے لگے۔ ایک شکاری بولا۔ ”ہیری! مجھے تو لگتا ہے وہ تیندوا تھا۔“

”اوعقل کے گدھے.....“ ہیری اُسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”لپارڈ، پتھر یا تیندوا جو تم کہہ رہے ہو اتنی بلند آواز میں نہیں دھاڑتا۔ ایک بات اور یاد رکھنا شیراپنے شکار کی دم اتار کر پھینک دیتا ہے اور شکار کو پچھلی ٹانگوں کی طرف سے کھانا شروع کرتا ہے جبکہ تیندوا اپنے شکار کی دم اتار کر نہیں پھینکتا اور شکار کو سینے کی طرف سے کھانا شروع کرتا ہے۔ تم نے دیکھا تھا اُدھ کھایا چیتل دم کے بغیر تھا اور و پچھلی ٹانگوں کی طرف کھایا ہوا تھا۔“

سب لوگ ہیری کے تجربے کے معترف ہو گئے تھے۔ ہمارا یہ قافلہ چلتا رہا۔ جنگلی خرگوش، ہرن، لومڑ، چیتل، چنکارہ، غزال، گیدڑ سے ہمارا ٹاکرہ ہوتا رہا۔ شکاریوں نے راستے سے چار ہرن اور و چیتل شکار کر لیے تھے۔ انہیں گھوڑوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ چونکہ وہ پہر کو سب لوگوں نے چنے چبا کر غزائرہ کیا تھا اس لیے ہرن اور چیتل شکار کر کے رات کے کھانے کا بھرپور انتظام کر لیا گیا تھا۔ وہ بڑی عجیب و غریب رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھنائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک ایک جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں دونوں طرف درخت ذرا پرے ہٹ گئے تھے۔ پتھروں اور ٹیلوں کے درمیان ہم لوگوں نے بارہ خیمے نصب کر دیے تھے۔ ہم نے علیحدہ علیحدہ دس جگہ آگ جلائی تھی۔ چار کی ٹولی کو ہر الاؤ کے گرد بیٹھنا تھا۔ میں شاہنواز، ہیری اور رابعہ ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنی زیادہ جگہ پر آگ جلانے کا مشورہ ہیری کا تھا۔ اُس کے خیال سے اتنی جگہوں پر جلتی آگ دیکھ کر درندے اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔

چاند درختوں کے پار ہی کہیں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ ہوائیں بھاری بادلوں کو ادھر سے اُدھر اڑائے پھر رہی تھیں۔ ایک مقامی پورٹر بڑی دل سوز آواز میں افریقی قبیلوں کا کوئی بہت پرانا گیت گنگنا رہا تھا۔ ایک مستی سی تھی جو پورے ماحول کو مسرور کیے دے رہی تھی۔ ہیری ہم لوگوں کو الگ جنگلوں کی فرسودہ لوک کہانیاں سنارہا تھا۔ وہ پچاس پچپن سالہ خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کی جسامت اور پھرتی بالکل جوانوں کی سی تھی۔ وہ ہمیں سفید گینڈے کے متعلق بتا رہا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ سفید گینڈا یہاں کے جنگلوں میں بکثرت پایا جاتا تھا مگر غیر قانونی شکار نے اس کی نسل تباہ کر کے

رکھ دی مگر اب حکومت کی سخت پالیسیوں کے تحت اس کی نسل دوبارہ پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ گینڈا یہاں کی چراگاہوں میں اکیلا یا چھوٹے ریوڑ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ہونٹ کشادہ اور چوکور ہوتے ہیں تاکہ مختلف قسم کی چھوٹی گھاس بھی چر سکے۔“

”اس کی عمر تقریباً کتنی ہوتی ہوگی.....؟ میرا مطلب ہے گینڈا کتنی عمر زیادہ سے زیادہ پاتا ہے؟“ رابعہ نے سوال پوچھا۔

”رابعہ بیٹا! گینڈے کی عمر تیس سال تک ہوتی ہے۔ اس کے کندھے کی اونچائی 1.5 سے 1.85 میٹر تک ہوتی ہے۔ اس کا وزن 1800 سے 2700 کلوگرام تک ہوتا ہے۔ تم اور کچھ پوچھنا چاہوگی؟“ ہیری کی معلومات نے ہمیں گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔

”تیندوے کی عمر کتنی ہوتی ہے؟“ شاہنواز نے تیر چھوڑا۔

”تیندوا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی عمر پاتا ہے۔ اسے گلدار بھی کہا جاتا ہے۔“ ہیری بولا۔

”اور اسے کیا کچھ کہا جاتا ہے؟“ رابعہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

ہیری کرس نے بخور رابعہ کی دیکھا اور مسکرا کے بولا۔ ”رابعہ بیٹا! تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟“

”نہیں تو انکل!“ رابعہ جھنجھکتے ہوئے بولی۔ اُسے بس ایسی شراتوں کی عادت سی تھی۔

”بیٹا! نئی تال اور گرد و پیش کے پہاڑی باشندے اسے بگھیرا کہتے ہیں۔ ہندی میں اسے چیتا“ سون چیتا“ باگھ، اونا را اور تیندوا کہتے ہیں۔ فارسی زبان میں اسے پنگ اور دکن کے علاقے میں اسے ورپک کہا جاتا ہے۔“ ہیری کرس خاموش ہوا تو ہم تینوں حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہیری واقعی غیر معمولی شکاری تھا۔

جنگلی جانوروں کے متعلق اُس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ اُس کی موجودگی ہمارے لیے نقویت کا باعث تھی۔ اُس کے ہوتے ہوئے ہم خود کو توانا محسوس کر رہے تھے۔ شاہنواز اور رابعہ کے ارے میں تو میں ٹھیک طرح سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں ہیری کرس کا بہت بڑا پرستار بن گیا تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایک دلکشی سی چھپی ہوئی ہوئی تھی۔ شاید میری اس بات کا لوگ مذاق اڑائیں مگر میں نہایت دیانتداری سے کہتا ہوں کہ ہیری کرس کی شخصیت میں مجھے اپنی ماں کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جب بات ختم کر کے خاموش ہوتا تھا تو پتا نہیں اُس کی کون سی ادا مجھے ماں کی بے طرح یاد دلا جاتی تھی۔ بہر طور ہیری کرس کو میں دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔

”انکل! شکار تو میں بھی کھیلتا ہوں مگر مجھے جانوروں کے متعلق اس قدر معلومات نہیں جتنی آپ



کو ہیں۔“

”تم صرف شکار کھیلتی ہو، دماغ استعمال نہیں کرتی۔“ شاہنواز نے رابعہ کو چھیڑا۔

”ہاں جیسے دماغ تو صرف تم ہی استعمال کرتے ہوتا۔“ رابعہ ناک چڑھا کے بولی۔

میں جب سے یہاں بیٹھا تھا باتیں تو سب کی سن رہا تھا مگر دیکھ صرف رابعہ کی طرف رہا تھا۔ وہ ذہین وزیرک ہونے کے باوجود بڑی معصوم تھی۔ اُس کی طبیعت میں کہیں بچپنا چھپا ہوا تھا۔ وہ کسی بار پر یکدم سے ہلکاری مار کر ہنس دیتی تھی۔ تب وہ بالکل ننھی سے معصوم بچی دکھتی تھی۔ ہاں وہ ننھی معصوم بچی ہی تھی جو شاہنواز کی اپنا سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ جس شخص کے خواب وہ دن رات دیکھتی ہے جس کے آس پاس وہ ہر وقت گھومتی ہے۔ حقیقت میں وہ شخص اُس سے کتنا دور ہے۔ اب بھی وہ اس کے ساتھ بیٹھی خوش گیسوں میں مصروف تھی اور میں تھا کہ اُس کی ایک نظر کا منتظر تھا۔ ایک نظر جو مجھے تمام امتحانوں سے بچالے اور میں اُسے لے کر اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں مگر قدرت کو اب ہم اور تماشے منظور تھے۔ زندگی مجھ سے ابھی بڑے بڑے امتحان لینا چاہتی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد تمام لوگ سونے کے لیے چلے گئے۔

اگلی صبح بڑی دھماکا خیز ہنسی کا بج لڑکی ایک لڑکی غائب تھی۔ پورے گروپ میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ اس خوفناک جنگل میں وہ اکیلی لڑکی کہاں گئی تھی۔ ہیری کرس کے کہنے پر چاروں طرف لوگ اُس کی تلاش میں پھیل گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد ایک اور خبر سب کے کیچے لرزائی۔ آگے جنگل میں ایک سفید گینڈے کی ”سربریدہ لاش“ پڑی تھی۔ خبر سنانے والا گوگی تھا۔ میں لپک کر گھوڑے سوار ہوا اور اسی طرح بڑھ گیا جدھر گوگی مردہ گینڈا دیکھ کر آیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے تازہ تازہ مارا گیا ہے۔

میں چند منٹوں میں ہی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ گینڈا ایک درخت کے پاس اونڈھا پڑا تھا میں اُس سے کچھ آگے ہوا تو اچانک مجھے گھنے درختوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں سمجھا شاید کوئی جانور ہے مگر اگلے ہی لمحے میری آنکھیں بچہ کی پھٹی رہ گئیں۔ میرا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے چل گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہاں وہ خواب کی ہی مانند تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ٹھنڈے قد کا ایک جنگلی آدمی تھا۔ اُس کا سارا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کالے بالوں۔ نیچے اُس کی سفید چمڑی صاف دکھ رہی تھی۔ اُس کی گول منٹول چھوٹی چھوٹی آنکھیں انگاروں کی

دھک رہی تھیں۔ وہ گھنے درخت کی ایک شاخ سے بن مانس کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے انکل لقمان سے سنی ہوئی وہ تمام کہانیاں یاد آ گئیں جو انہوں نے مجھے آدم خور جنگلیوں کے بارے میں سنائی تھیں۔ ساتھ ہی خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے وجود سے پھیل گئی تو کیا مجھ سے بچا س گزردور درخت کی شاخ سے چمٹا ہوا جانور نما انسان آدم خور ہے؟ میں شاید پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ میں نہایت حقیقت پسند ہوں۔ ہر چیز کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ باتوں اور مذاق کی حد تک تو آدم خور جنگلیوں کو میں بھی مانتا ہوں۔ حقیقت میں ایسی کوئی مخلوق جنگلوں رہتی ہے۔ اس کا میں قائل نہیں مگر اس وقت جو انسان مجھ سے کچھ دوری پر تھا۔ اُس کا حلیہ سنی ہوئی کہاوتوں کے بالکل مشابہہ تھا۔ اس مخلوق کو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ان کے جسم پر بال بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بالوں کے نیچے نظر آتی سفید چمڑی کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جنگل کے بہت اندر تک گھنے درختوں میں رہتے ہیں۔ ان کے بسوں پر سورج کی شعاعیں نہیں پہنچتی۔ اسی وجہ سے چمڑی کی رنگت سفید ہے اور یہ کہ ان لوگوں کے وپری دو دانت باہر کو نکلے ہوتے ہیں۔ اس جنگلی میں وہ ساری نشانیاں موجود تھیں جو میں نے اس مخلوق کے بارے میں سن رکھی تھیں مگر دانت قطعی باہر کو نکلے ہوئے نہیں تھے۔ یہ مبالغہ آرائی شاید جنگلی مجھے بڑی غصیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اُس سے غافل ہرگز نہیں تھا مگر اُس وقت بری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب جنگلی ایک چھلاوے کی طرح درخت سے غائب ہو گیا۔ میں نے بڑی سے گھوڑے کی باگیں موڑیں۔ شاید گھوڑے کی باگیں موڑنا ہی میری زندگی کی ضمانت بن گیا۔ بری نگاہیں ایک لمحے کے لیے جنگلی سے ٹکرائیں جو ایک لمبے بانس کو منہ سے لگائے ایک درخت کی وٹ میں کھڑا تھا۔ بانس کا ایک سرا اُس کے منہ کے ساتھ لگا ہوا تھا جبکہ دوسرے سرے کا رُخ میری طرف تھا۔ پھر پلک جھپکنے سے کوئی چیز سنسناتی ہوئی اُس بانس سے نکلی اور میرے گھوڑے کی گردن میں دست ہو گئی۔ وہ ڈیڑھ فٹ لمبا ایک تیر تھا اگر عین موقع پر میں نے باگیں نہ موڑی ہوتیں تو گھوڑے کی گردن میں لگے والا تیر اس وقت میرے پیٹ کے آر پار ہوتا۔ گھوڑا اپنی پچھلی ناگوں پر الف ہو لیا۔ میں پشت کے بل جنگلی گھاس پر گر کر گھوڑا ذبح ہوئے بکرے کی طرح بے ڈھنگے انداز میں اچھل کود کرتا گھنے درختوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گھوڑے نے ”مالک“ کی جان بچا کے دشمن کو اور خود پر سہا تھا اور سرخو ہو گیا تھا۔ میرے کندھے سے لٹکا روپیٹر گرتے وقت خود بخود میرے نگوں میں آ گیا تھا۔ روپیٹر میں اس وقت نو کار تو س موجود تھے۔ میں نے لیٹے لیٹے اوپر نیچے چار

کار تو س جنگل کی طرف داغ دیئے۔ بارہ بور کی پُر گونج آواز نے پورے جنگل کو لرزادیا۔ بے ڈ پرندے اپنی اپنی بولیاں بولتے درختوں سے اُڑ گئے۔ میں بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا، بے دریغ فائر کرتا ہوا اُس طرف بڑھا جہر میں نے آخری وقت جنگلی کو دیکھا تھا۔ کئی شاخص درختوں سے ٹوٹیں اور ہر طرف دھوئیں کے مرغولے پھیل گئے۔ دھواں چھٹا تو جنگلی وہاں موجود نہیں تھا روپیہ میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ میں نے آس پاس ہر جگہ کا جائزہ لے لیا مگر جنگلی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرانگی ہوتی ہے کہ میں کتنی بڑی حماقت کتنے آرام سے کیے جا رہا تھا۔ وہ جنگل تو درخت پر بھی اس طرح چھپ کر مجھ پر وار کر سکتا تھا کہ مجھے کانوں کا خبر نہ ہوتی۔

فائرنگ کی آواز سن کر فوراً پیچھے سے لک بچھ گئی۔ ہیری کرس، شاہنواز، گوگی اور چار بند۔ اور گھوڑوں سمیت آن ہی آن میں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے فائرنگ کی وجہ دریافت کی تو میں۔ ساری ”کار گزاری“ ہیری کرس کے گوش گزار کر دی۔ میری باتیں سن کر اُس کی پیشانی پر سوچوں ایک جال سا بن گیا۔ وہ ہم سب کو لیتا ہوا واپس کمپ والی جگہ پر آ گیا۔ وہاں فوراً ایک میننگ کی جس میں جم کیٹی، قطب الدین، انکل مدثر، ہیری کرس اور شاہنواز شامل تھے۔ مجھے بھی تھوڑی دیر بلایا گیا تھا۔ گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ انکل مدثر اور ہیری کرس کا کہنا تھا کہ یہاں سے فوراً واپس جائے جبکہ جم کیٹی اور قطب الدین اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اس جنگلی کا تعاقب کیا جائے سفید گینڈوں اور تین آدمیوں کو قتل کرنے والے یہی جنگلی ہو سکتے ہیں اور پھر کالج کی لڑکی گم ہو گئی تھی وہ بھی ان جنگلیوں کی ہی کارستانی تھی۔ جم کیٹی اور قطب الدین کی سوچ کسی حد تک ٹھیک بھی تھی دوسری طرف ہیری کرس کا کہنا تھا کہ جنگلی یا جنگلیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آپیشل فورس چاہیے ہمارے ساتھ جو لوگ ہیں وہ سیاحت کی غرض سے آئے ہیں۔ شام تک یہ بحث چلتی رہی، کوئی نتیجہ نکل سکا۔ غائب ہو جانے والی لڑکی کا معاملہ بڑا سنگین تھا۔ کالج کی اکثر لڑکیوں نے تو رو رو کر اپنا حال کر رکھا تھا۔

جنگلی آدمی کو دیکھا جانے والا واقعہ کالج ٹور سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اگر ان تک خبر پہنچی بڑی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ آخر رات کو یہ فیصلہ ہوا کہ لڑکی کی تلاش کے بغیر یہاں سے نہ جایا جائے رات کا کھانا کسی نے بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا۔ لڑکی کے زندہ بچ جانے کی کسی کو بھی امید نہ تھی ایک موبوم سی امید کے سہارے اُس کی تلاش جاری تھی۔ ہیری کرس اپنے ساتھ شاہنواز اور گوگی لے کر شمال کی جانب نکل گیا تھا جبکہ میں دو شکاریوں سمیت جنوب کی جانب بھٹک رہا تھا۔ مزے

بات یہ تھی کہ رابعہ بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ بڑی ذہین شکاری تھی مگر میں اُس سے بڑا شکاری تھا۔ میں نے اُسے تاک رکھا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا، میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے صرف اور صرف اُسے یہاں سے لینے آیا تھا۔ میں اُسے بیاہ کر اپنی دُہن بنانا چاہتا تھا۔

میں رابعہ اور دو شکاریوں کی معیت میں جنوب کی طرف گامزن تھے۔ ٹار پیس ہمارے ہیملٹ کے ساتھ نصب تھیں۔ ہمارے ایک ایک ہاتھ میں جلتی مشعل اور دوسرے ہاتھ میں اپنے بچاؤ کے لیے اسلحہ تھا۔ جس رستے پے ہم لوگ جا رہے تھے وہ ڈھلوان تھی، ہم محتاط قدم اٹھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے اور گمشدہ لڑکی کو زور زور سے پکار رہے تھے۔ ہم اپنے کمپ سے کافی دور آ چکے تھے۔ میرے دل میں خوف کی ہلکی سی آہٹ بھی نہیں تھی۔ رابعہ کا کُرب مجھے اس خوفناک جنگل میں بھی مسرور کیے دے رہا تھا۔ جنگل کی سیاہ رات میں بھی اُس کے چہرے پر اُجالے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میرا دھیان سامنے کی جانب کم اور رابعہ کی طرف زیادہ تھا۔

”ایسی چٹانوں کی کھوہ میں اکثر شیر پناہ گزین ہوتے ہیں۔“ ایک شکاری کی سرسراہٹ ہوئی سرگوشی ابھری۔

”ہمیں ڈرا محتاط رہنا ہوگا۔“ دوسرا شکاری بولا۔

”رابعہ! تم ٹھیک ہونا۔۔۔۔۔؟“ میں نے فضول سا سوال کر دیا۔

”مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔“ اُس کی مترنم آواز گونجی۔ کتنا پیارا بول تھا وہ۔

”مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔“

”میری فکر ہوتی تو یوں خوفناک جنگلوں میں گھومنا نہ پڑتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔؟ وہ عجیب سے انداز سے مسکرائی۔

”بہی کہ ہم زہم زبما بے میں کسی کیفے ٹیریا میں بیٹھے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے ہوتے اور آپس میں کہیں مار رہے ہوتے۔“

”تو تم۔۔۔۔۔ اس ماحول سے خوفزدہ ہو؟“

”بالکل نہیں۔۔۔۔۔ میں اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔“ میں اپنی صفائی میں بولا۔

مجھے معلوم تھا رابعہ اس وقت نہایت خوفزدہ ہے۔ رابعہ ہی کیا سب لوگ خوفزدہ تھے۔ ایک ناموش چیخ تھی جو اس جنگل میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اک بے نام آ سیب تھا جو مہیب اندھیرے میں ندنا تا پھر رہا تھا۔ ایک سال قبل اس جنگل میں تین بندوں کو یہ اسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اُس خونی

واردات کا کوئی سراہا تھا نہیں آیا تھا۔ اب کالج نور کی ایک لڑکی کل صبح سے لاپتہ تھی۔ وہ کہاں تھی؟ اُم کا کیا بنا تھا؟ تیس گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ جنگلی آدمی ہی ایک ایسی کڑی جس کے ذریعے ہم لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ میری فائرنگ کے بعد وہ جس طرف روپوش ہوا تھا ہم لوگ اُسی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہنواز بھی اپنی ”ٹولی“ کے ہمراہ اُسی سمت شمال کی جانب گامزن تھا۔ دونوں شکاری ہمارے آگے چل رہے تھے میں اور رابعہ پہلو بہ پہلو قدم اٹھا رہے تھے۔ ہمارے بائیں جانب جھاڑیوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ چشمِ زدن میں سب کی رائفلوں کے رخ اُم طرح ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سوچتے یا آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ایک ہیولہ سا اُچھلتا ہوا جھاڑیوں سے نکلا اور رابعہ سے لپٹ گیا۔ وہ بڑی جسامت کا ایک بھیڑیا تھا۔ اُس کے بوجھ سے رابعہ پشت کے بل زمین پر گری۔ رائفل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ بھیڑیا رابعہ سے یوں گتھم گتھا تھا کہ اس پر فائر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی رائفل کو گھما اُلٹا کیا اور لکڑی کے دستے کی ضربیں بے دریغ بھیڑیے کی پشت پر لگانے لگا۔ وہ بھیڑیا پتا نہیں کہ نسل کا تھا اُسے کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ رابعہ کو چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ میرے پاس کھڑے دونوں شکاری شش و پنج میں مبتلا تھے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں رہا تھا کہ انہیں کون سا قدم اٹھانا چاہیے۔ پھر ایک شکاری بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور اُس ہاتھ میں پکڑی مشعل سے دو تین بھر پور ضربیں بھیڑیے کے چہرے پر لگائیں۔ وہ غراتا ہوا پیچہ قدموں پلٹا۔ اس دوران رابعہ بھیڑیے کی گرفت سے نکل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم رابعہ کو اٹھا یا بھیڑیے کو مارنے کی سعی کرتے وہ بجلی کی سی تیزی سے ایک بار پھر رابعہ پر حملہ آور ہوا۔ اس دوران رابعہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ دوبارہ بھیڑیے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو رابعہ ہڈیانی انداز میں چلائی اُسے اپنے دفاع کے لیے اُس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیے جیسے بھیڑیے کو خود سے دور رکھنا چاہتی ہو میں حالات کی نزاکت کا انداز لگا چکا تھا۔ رابعہ بھیڑیے کے دوسرے حملے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی میں نے اپنی جگہ سے ہوا میں جست کی اور بھیڑیے کو اپنے ساتھ لپٹاتا ہوا دور جھاڑیوں میں جا گرا میں جانتا تھا جیسے میں نے بھیڑیے کو قابو کیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ اُس کو گردن کے اوپر والے ۵ سے پکڑنا از حد ضروری تھا نہیں تو وہ درندہ اپنے نوکیلے دانتوں سے میری ہڈیاں تک چبا ڈالے گا۔ ۱۱ سے پہلے کہ میں اُس کی گردن اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لیتا۔ اُس نے اپنے طاقتور پنجوں سے ۱۲ زوردار دھککا دیا۔ میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ مجھے امید تھی کہ اس دوران میرے ساتھیوں میں سے کو

بھیڑیے پر فائر کرے گا مگر اس نے اتنا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ ایک ہی جست میں ایک مرتبہ پھر مجھ پر سوار تھا۔ اُس کی دیدہ دلیری خیران کن تھی۔ اکیلا بھیڑیا عام طور پر انسان کے قریب کم ہی پھٹکتا ہے۔ غول کی صورت میں بھیڑیے ہوں تو وہ بہت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں مگر یہ اکیلا بھیڑیا ہی ہمارے لیے وبال بن گیا تھا۔

انسان خوف کو خود پر مسلط کر لے تو جو کام کر سکتا ہے وہ بھی نہیں کر پاتا۔ میں نے زندگی میں بہت مشکل مشکل وقت دیکھے تھے اور حاضر دماغی اور بہترین حکمت عملی سے ان مشکل حالات پر قابو پایا تھا۔ حواسِ باخہ انسان اپنے تمام اوصافِ گھبراہٹ کی نذر کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے ہی مارا جاتا ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم اس ”خون آشام بھیڑیے“ کے ہاتھوں تو کسی صورت نہیں..... بھیڑیا اس وقت میرے پیٹ پر سوار تھا اور میرا کندھا چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے نوکیلے پنجے میری شرٹ کا ”سلوکا“ بنا چکے تھے۔ اچانک مجھے ایک داؤ سو جھ گیا۔ میرے ہاتھ تیزی سے بھیڑیے کی گردن سے لپٹے دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے خود سے نیچے اتار لیا۔ پھر تیزی سے گھومتے ہوئے میں بھیڑیے پر سوار ہو گیا۔ وہ بھیڑیا تھا کراٹے کے داؤچے سے اُس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اب پوزیشن کچھ یوں تھی کہ بھیڑیا میرے نیچے تھا اور میں بھیڑیے پر یوں سوار تھا جیسے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔

اُس کی گردن میرے دونوں ہاتھوں کی فولادی گرفت میں تھی۔ میرے گھٹنے زمین کو بوسہ دے رہے تھے۔ میں نے اپنا سارا بوجھ اُس پر یوں لا دیا تھا کہ وہ کچھلی ناگوں پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی اگلی ٹانگیں سامنے کی طرف بچھ گئی تھیں۔ میں نے کہنیوں کا زور اُس کے کندھے پر اس طرح سے دیا تھا کہ وہ اگلی ٹانگ سے مجھ پر وار کرنے سے بھی گیا تھا۔ بھیڑیا بُری طرح میرے جال میں پھنس گیا تھا مگر اس طرح زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا تھا۔ وہ خطرناک درندہ بُری طرح میرے نیچے چل رہا تھا۔ کوئی لمحہ تھا کہ وہ میری گرفت سے آزاد ہو جاتا مگر میں ایسا کوئی چانس دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے دایاں ہاتھ مضبوطی سے بھیڑیے کی گردن پر پے جمایا اور بجلی کی میٹری سے اپنا بایاں ہاتھ اپنی پنڈلی کی طرف لے کر لیا۔ اگلے ہی لمحے ڈیڑھ فٹ لمبا تیز دھار خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھیڑیے پر وار کرتا۔ اُس نے پورا زور لگایا اور بدست سائڈ کی مانند میری گرفت سے آزاد ہو گیا۔

بھیڑیا آزاد ہو کر تیزی سے مخالف سمت بھاگا مگر اگلے ہی لمحے بارہ بور کا کارتوس کھا کر وہیں

ہو گئے۔

”یہ بدبو..... کسی مردہ انسانی جسم کی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ میری بات، ہتھوڑا بن کر سب کے دماغ پر پڑی تھی۔ وہ حیرت زدہ سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے میں نے انہیں کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلادی تھی۔ ایک شکاری تیزی سے اُس جھاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ شکاری نے مشعل کی روشنی جھاڑی میں ڈالی۔ خدا کی پناہ..... وہ بڑا روح فرسا منظر تھا۔ ایک آدم زاد کی سرکئی آدھ کھائی لاش جھاڑی کے وسط میں پڑی تھی۔ اُس کے جسم سے سرغائب تھا۔ باقی ماندہ جسم نوچا کھوٹا پڑا تھا۔ ہمارے ہاتھوں مارا جانے والا بھیڑیا اسی جھاڑی سے برآمد ہوا تھا تو کیا وہ اس لڑکی کے وجود کو بھنھوڑ رہا تھا؟ اس سوچ کے آتے ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے ساتھ کھڑا شکاری بہت بہادر واقع ہوا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر باقی ماندہ لاش کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا تھا۔ ماری جانے والی لڑکی کالج ٹور ہی کی تھی۔ اُس کے نیلے فراک کی وجہ سے ہم نے اُسے فوراً پہچان لیا تھا مگر سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اُس کا سرغائب تھا۔

اگر لڑکی کو بھیڑیے نے یا کسی اور جانور نے ہلاک کیا تھا تو لاش کا سر کدھر گیا تھا۔ ہو سکتا تھا لاش کی تقسیم میں ایک سے زیادہ جانوروں کی آپس میں لڑائی ہو گئی ہو اس کھینچا کھانی میں سردھڑ سے علیحدہ ہو گیا ہو۔ لاش کی بُری حالت دیکھ کر رابعہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ ایک دم ہی اُس کے چہرے پے زردی کھنڈی نظر آنے لگی تھی۔ ہم تینوں نارنج اور مشعل کی روشنی میں لاش کو دیکھ رہے تھے۔ ہم تسلی کر لینا چاہتے تھے کہ لاش واقعی اُسی لڑکی کی ہے۔ یہ بڑی ”لرزہ خیز واردات“ تھی مگر لڑکی کی لاش دیکھ کر ایک طرح کا ہمیں اطمینان ہو گیا تھا۔ لڑکی کی تلاش ختم ہو گئی تھی۔ اس کی گمشدگی کے بعد پیدا ہونے والے شکوک و شبہات ختم ہو گئے تھے۔ لڑکی کی گمشدگی کے پیچھے جنگلی آدمی کے ملوث ہونے کے امکانات بھی معدوم ہو گئے تھے۔ ہمارے خیال سے یہ بدقسمت لڑکی کسی غرض سے کمپ سے باہر نکلی تھی اور بھیڑیے کا شکار ہو گئی تھی۔ پھر بھیڑیے اس کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے یہاں تک لے آئے تھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ لڑکی رات کے وقت کمپ سے باہر کیا کرنے گئی؟ اور اگر وہ کسی غرض سے چلی بھی گئی تو جس وقت بھیڑیوں نے اُس پر حملہ کیا۔ اُس نے شور کیوں نہیں مچایا؟ کسی کو اپنا مدد کے لیے کیوں نہیں پکارا؟

یہ امر بھی قابل غور تھا ہو سکتا تھا۔ اُس نے شور مچایا ہو مگر گہری نیند کی وجہ سے کسی کی آنکھ نہ کھلی ہو۔ ہم سب اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچ رہے تھے کہ اچانک میری نظر لاش کی گردن کے قریب

ڈھیر ہو گیا۔ فار کرنے والی رابعہ تھی۔ رابعہ کی طرف دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ میں رابعہ کی طرف سے سخت پریشان تھا مگر خدا کا شکر تھا کہ اُسے کوئی سنگین زخم نہیں آیا تھا۔ میں بھیڑیے کے پاس سے پلٹا تو جھاڑیوں کے پاس مجھے سخت بدبو آئی۔ میں آس پاس دیکھنے لگا مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اسی دوران میرے تینوں ساتھی میرے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر خوش ہو رہے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا میرے جسم پر کتنے زخم لگے ہیں۔ میں نے کئی پھٹی شرٹ سے خود کو ڈھانپ لیا تھا۔ جنگل کی تیرگی میں بھی رابعہ کی خوبصورت آنکھوں میں چمکتا شفاف پانی صاف دکھ رہا تھا۔ رابعہ کی آنکھوں میں میرے لیے تشکر تھا۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”علی نواز! تم ٹھیک ہونا.....؟“

”ہاں..... بھلا مجھے کیا ہوا.....؟“ میں زخموں سے اٹھتی ٹیسوں کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

رابعہ یکدم آنسوؤں سے رونے لگی۔ میں اُسے دلاسہ دے کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں چپ تو رابعہ کو کر رہا تھا مگر میرا ذہن اُسی بدبو میں اٹکا ہوا تھا جو ابھی جھاڑیوں کے قریب میرے ہتھوں سے نکلانی تھی۔

”نواز! کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہو.....؟ کہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی.....؟“ ایک شکاری بولا۔

”نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

رابعہ ایک دفعہ پھر سے پریشان ہو گئی اور اصرار کرنے لگی کہ کہیں چوٹ لگی ہے تو فوراً بتاؤ۔ میں جنگلی پتوں سے خون روک لوں گی۔ پھر وہ میرے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے منع کیا اور یہ سمجھایا کہ میں پریشان کسی اور وجہ سے ہوں۔

”تم کس وجہ سے پریشان ہو.....؟“ دوسرا شکاری بولا جو کافی دیر سے چپ کھڑا تھا۔

”مجھے اُن جھاڑیوں میں سے بدبو آ رہی ہے.....“

”کیسی بدبو.....؟“ رابعہ تیزی سے بولی۔

”میں نہیں جانتا مگر بہت بُری بو ہے۔“

”کسی مردہ جنگلی جانور کی بدبو ہوگی.....“ پہلے والا شکاری بولا۔

”اس مرنے والے بھیڑیے کی بدبو بھی ہو سکتی ہے۔ اکثر مرنے والے جانور کا فضلہ خطا ہو جاتا ہے۔“ دوسرے شکاری نے اپنی رائے دی۔

”اس کے علاوہ ایک تیسری وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“ میری خوفزدہ سرسراہٹ آواز نکلی۔

”کیسی وجہ.....؟“ رابعہ کی سہمی سی سرگوشی ابھری۔ دونوں شکاری بھی میری طرف ہمہ تن گوش

جم کر رہ گئی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی بے رحم لہر دوڑ گئی۔ میرے ذہن میں آنندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں مشعل قریب کر کے لڑکی کی کٹی ہوئی گردن کا معائنہ کرنے لگا۔ لڑکی کی گردن کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا تھا۔ کئی گردن کے ساخت صاف بتا رہی تھی کہ اُسے کسی تیز دھار آلے سے بڑی صفائی کے ساتھ علیحدہ کیا گیا ہے۔ گردن کے ایک طرف درندوں کے دانتوں اور پنچوں کے نشان تھے جبکہ گردن کی دوسری طرف سامنے سے بالکل متوازن تھی۔

”اس لڑکی کو کسی تیز دھار خنجر سے قتل کیا گیا ہے۔“ میں نے اچانک دھماکا کیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ لڑکی جنگلی درندوں کے ہاتھوں ماری گئی ہے۔“ ایک شکاری بولا۔

”گردن کے اس حصے کو ذرا غور سے دیکھو۔“ میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ نہ چاہتے

ہوئے بھی راجہ دونوں شکاریوں سمیت ادھر دیکھنے لگی۔

”گردن کے اس حصے پر تمہیں کوئی نشان پٹھوں کی کوئی توڑ پھوڑ نظر آتی ہے؟“

دونوں شکاری نفی میں سر ہلانے لگے۔

”اس لڑکی کو پہلے قتل کیا گیا ہے۔ اور اسے قتل کرنے والا کوئی انسان ہے۔ اس کے بعد اس

کی لاش بھیڑیوں کے ہاتھ لگی ہے۔“ میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میں اس بات کو نہیں مانتا۔“ پہلے والا شکاری بولا۔

”ایلی بالکل درست کہہ رہا ہے۔“ دوسرا شکاری بولا تو ہم تینوں اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس

کے چہرے پے ہیجان تھا اور ماتھے پے پسینے کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

”تم کس طرح کہتے ہو کہ علی درست کہہ رہا ہے؟“ پہلے شکاری نے منہ بنایا۔

”گردن کے اس حصے کو دیکھو یہاں کا گوشت سیاہی مائل ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ زخم

زیادہ دیر کا ہے جبکہ بقیہ جسم کا گوشت جہاں جہاں بھیڑیے کے دانت اور پنچے لگے ہیں سیاہی مائل

نہیں ہے یعنی کہ یہ لاش بھیڑیے کو تھوڑی دیر پہلے ملی ہے۔“

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ لڑکی کو ہم میں سے کسی نے قتل کیا ہے اور اُس کی لاش یہاں پھینک دی

ہے تاکہ جنگلی جانور نوچیں؟“ پہلا شکاری بُرا مانتا ہوا بولا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ میں اُس کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”لڑکی کا قاتل وہی

جنگلی آدمی ہو سکتا ہے جس نے مجھ پر تیر سے حملہ کیا تھا۔“

میری بات سب کے دل کو لگی۔ پھر لوگوں میں مشورہ شروع ہو گیا۔ نوچی کھسوٹی لاش کو کیپ

کی طرف لے جایا جائے یا یہیں رہنے دیا جائے۔ لاش ساتھ لے جانے پر کوئی بھی رضامند نہ ہوا۔ ہم لوگ جب سے لاش کے پاس کھڑے تھے، ناک منہ دھاپ کے کھڑے تھے۔ بدبو اس قدر زیادہ تھی کہ دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ خیر ہم لاش کو درخت کی ایک کھو میں رکھ کر واپس لوٹ گئے۔ ہماری واپسی آدھے گھنٹے میں ہوئی۔ راستے میں ایک ریچھ سے ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے سات فٹ لمبے قد سے کھڑا درخت سے شہد کا چھتا نوچ رہا تھا۔ ہم نے اپنا راستہ بدل لیا اور اُس سے نظریں چرا کے اپنی منزل کی طرف ہو لیے۔

جب ہم لوگ کیمپ پہنچے تو سب لوگ آگ کے بڑے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے جبکہ بڑے الاؤ سے پرے بھی کافی جگہ آگ جل رہی تھی مگر لڑکی کی گمشدگی نے بہت سوں کو سہا دیا تھا اور وہ اکیلے بیٹھنے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ ہم لوگ جب الاؤ کے قریب پہنچے تو ہر چہرہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے رینا کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی مضطرب دکھ رہی تھی۔

میں نے بڑے محتاط لفظوں میں ساری کارگزاری گوش گزار کر دی۔ میں سر غائب ہونے والی بات گول کر گیا تھا۔ اس کا مشورہ ہم نے راستے میں ہی کر لیا تھا کہ سب کے سامنے یہی کہا جائے کہ وہ لڑکی جنگلی درندوں کے ہاتھوں ماری گئی ہے۔ بعد میں جم کینی، قطب الدین اور ہیری کرس کو بٹھا کر سب کے سامنے یہ بات کھول دی جائے کہ ماری جانے والی لڑکی کسی انسانی ہاتھ سے قتل ہوئی ہے۔

لڑکی کی لاش مل جانے کی خبر سننے کے بعد کالج کے طالب علموں میں رونا پینٹنا چ گیا تھا۔ خیر یہ سب کچھ تو ہونا تھا۔ خبر سننے کے بعد باقی لوگوں کے چہرے بھی افسردہ ہو گئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ انگل مدر کے چہرے پے بے انتہا بے چینی اُٹھ آئی تھی۔

اسی دوران دوسری ”سراغ رساں“ پارٹی بھی پہنچ گئی جس میں ہیری کرس، شاہنواز اور گوگی شامل تھے۔ رونے اور واویلا مچانے کی آوازوں سے انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ خبر کوئی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ جلد ہی انہیں بھی تمام صورت حال معلوم ہو گئی۔

میں اس وقت کیمپ سے پرے اپنے گھوڑے کی کانچی اُتار کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔ جب رینا ست قدموں سے چلتی میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اُس کے چہرے پر بلا کی بے چینی تھی۔ وہ چند لمحے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کا خیال تھا میں بات شروع کروں گا مگر میری طویل خاموشی دیکھ کر بولی۔ ”مسٹر ایلی! ایک بھیڑیا ایک لڑکی کو کیمپ کے اندر سے کیسے اٹھا کر لے جاسکتا ہے؟“

”رینا! تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”یہی کہ لڑکی بھیڑیے کے ہاتھوں نہیں ماری گئی۔“

اُس کے سوال نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو.....؟“ میں بولا۔

”لڑکی کی گردن پر پیوست خنجر میں نے خود دیکھا ہے۔“

میرے گلے سے یکدم گٹھنی گٹھنی چیخ برآمد ہوئی۔ ”کیا کہا! رینا..... تم نے.....؟ تم نے خود اپنی

آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا.....؟ کہاں.....؟ کیسے.....؟ کب اور..... کس وقت؟“ میں ایک غر سانس میں بولتا چلا گیا۔

وہ میری طرف دیکھ کے مسکرانے لگی۔

”مسٹر ایلی! یہ سب میں نے تصوری کی آنکھ سے دیکھا ہے۔“

”تصوری کی آنکھ سے.....؟“ میں سوالیہ لہجے میں بولا۔

”ہاں مسٹر ایلی! آج میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔“

میں رینا کو سنجیدہ دیکھ کر بہت تن گوش ہو گیا۔

”مسٹر ایلی! پہلی بات تو یہ کہ..... تم مجھے اچھے لگتے ہو..... اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ایک سچے اور

کھرے انسان ہو..... یہاں ہر کوئی ایک چہرے پے کئی کئی چہرے لگائے پھرتا ہے۔ تم سب لوگوں

سے مجھے مختلف لگے ہو..... اسی لیے آج تمہیں دل کی باتیں بتانے لگی ہوں۔ مسٹر ایلی! بچپن سے مجھے

جو خواب آیا کرتے ہیں وہ سچ ہو جاتے ہیں۔ میں ہر آنے والے خواب کا ذکر ماں سے کیا کرتی اور

پھر تھوڑے ہی دنوں میں وہ خواب کسی نہ کسی طرح پورا ہو جاتا۔ ایک دفعہ میں نے خواب میں دیکھا کہ

میرا چھوٹا بھائی سڑک کے درمیان میں لیٹا رو رہا ہے۔ پھر..... پھر مسٹر ایلی دوسرے ہی دن میرا چھوٹا

بھائی روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔

ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوگو کے جنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ اگلے ہی ہفتے

آسانی بجلی جنگل میں گری اور اُس نے کوگو کے جنگل کا بیشتر حصہ جلا ڈالا۔ اس کے بعد بھی اکثر خواب

مجھے آتے اور سچ ثابت ہوتے تھے۔ کل رات کو بھی میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب بڑ

ڈراؤنا تھا۔ میں نے..... میں نے دیکھا کہ کالج کی ماری جانے والی لڑکی جنگل میں برہنہ پا بھاگ

رہی ہے۔ وہ بھاگتی جا رہی ہے، بھیڑیوں کے ساتھ ساتھ ایک آدمی بھی اُس لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا

ہے۔ آدمی کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا مگر مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ بہت بد صورت انسان ہے۔ یکدم لڑک

کے پیچھے بھاگتے بھیڑیے رک جاتے ہیں مگر وہ خوفناک آدمی اُس کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ پھر ایک

جگہ وہ بھی رک جاتا ہے اور رکنے کے تھوڑی دیر بعد اپنی پنڈلی سے لگا خنجر اُتارتا ہے اور خنجر زور سے

لڑکی طرف پھینک دیتا ہے۔ خنجر سیدھا لڑکی کی گردن میں پیوست ہو جاتا ہے۔ لڑکی وہیں منہ کے بل

زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ آدمی جونہی واپس پلٹتا ہے۔ بھیڑیے ایک آن میں لڑکی کے پاس پہنچ

جاتے ہیں اور اُس کی لاش کو بھنبھوڑنے لگتے ہیں۔ یہ منظر ختم ہوتا ہے اور ساتھ ہی جنگل کی گیلی زمین

سے چار سر برآمد ہوتے ہیں۔ سر دھڑکے بغیر ہیں۔ اُن کے منہ سے مسلسل خون برآمد ہو رہا ہے۔“

یہاں تک کہہ کے رینا خاموش ہوئی تو میں اُس عجیب لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بال کندھوں

تک کٹے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ خواہ مخواہ اُس سے ہمدردی محسوس ہونے

لگتی تھی۔

”رینا! مجھے بتا چلا تھا تم کیپ ٹاؤن سے یہاں چھٹیاں گزارنے آئی ہو۔ پھر معلوم ہوا تم جم

کینی کی بھانجی ہو..... یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔“

”ہاں بد قسمتی سے میں اس شخص کی بھانجی ہوں۔“ رینا کے لہجے نے مجھے چونکا دیا۔

”رینا! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں.....؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اوہ..... آئی ایم سوری.....“ میں تاسف سے بولا۔

”نوائس او کے.....“ وہ آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”کوئی بہن بھائی.....؟“

”کوئی نہیں..... کوئی بھی نہیں..... میرا اس دنیا میں کوئی نہیں..... میں اکیلی ہوں بالکل تنہا۔“

وہ اپنے آنسو نہ روک سکی اور سسکنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے اُسے دلا سہ

دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے پھر واپس کھینچ لیے..... میں چند لمحے اُس کے خاموش ہونے کا

انتظار کرتا رہا۔ جب اُس کے سسکنے کی آواز مدہم پڑ گئی تو میں نہایت محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ”تم

مجھے اپنا بھائی کہہ سکتی ہو..... اور دیکھو..... یہ نہ سمجھنا کہ یہ میں تمہیں خاموش کرنے کے لیے کہہ رہا

ہوں۔ وقت آنے پر میں ثابت کر دوں گا کہ جو میں کہہ رہا ہوں حرف بہ حرف سچ ہے۔“ میں خاموش

ہوا تو رینا نمناک آنکھوں سے عجیب انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔

”رینا! پاکستان میں تمہارے جیسی میری چار بہنیں ہیں۔ چاروں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی



ہیں۔ عید شب رات یا کسی اور ایونٹ پر وہ جب سب اکٹھی ہوتی ہیں تو پتا ہے..... کیا ہوتا ہے.....؟“  
 ”کیا ہوتا ہے؟“ رینا آنسوؤں بھری آنکھوں سے مسکرا دی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے سینے کے اندر تک ٹھنڈک اتر گئی۔ کسی روتے ہوئے کو ہنا دینے میں کسی روٹھے کو منا لینے میں جو خوشی ملتی ہے وہ پوری دنیا کی بادشاہت پالنے سے بھی نہیں مل سکتی۔

”ہمارے گھر میں ایک میلہ لگ جاتا ہے۔ سارے بھانجے بھتیجے مل کر خوب غل مچاتے ہیں۔ ہر کمرے ہر گلی سے بچوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے۔“

”سب بچے تمہیں تو خوب تنگ کرتے ہوں گے؟“ رینا جیسے دور دیکھتے ہوئے بولی۔

”ایسا ویسا..... میرے تو ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ چھوٹا ہوں نا شاید اس لیے۔“

”ایلی! تم مجھے اپنے گھر والوں سے ملواؤ گے.....؟“

”آف کورس..... بھلا کیوں نہیں.....“

”تم سچ کہہ رہے ہو.....؟“ رینا ایکدم سے چپک اٹھی۔

”تو کیا تمہیں جھوٹ لگ رہا ہے.....؟“

”نہیں..... تو..... مم میرا مطلب تھا ہم کب پاکستان جاسکتے ہیں؟“ وہ جملہ ادا کر کے خاموش ہوئی تو ساتھ ہی اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کھلتے ہوئے چہرے کو کرب کی سیاہ چادر نے ڈھانپ لیا۔ میں رینا کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ آنسو قطار در قطار اُس کے گالوں پر پھسلنے چلے آ رہے تھے۔

”رینا! کیا ہوا.....؟ تم رو کیوں پڑیں؟“

”سوچتی ہوں شاید پاکستان جا بھی سکوں گی یا نہیں.....؟“

”میں لے کر جاؤں گا اپنی بہن کو پاکستان۔“ میں سیدہ ٹھوکتے ہوئے بولا۔

میں نے اُسے پہلی دفعہ بہن کہا تو اُس پر لرزے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ڈبڈبی ہوئی تشکر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کر کے بولی۔ ”ایلی! تمہاری بہن کبھی تمہارے ساتھ نہیں جاسکے گی۔“ وہ عجیب سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیوں نہیں جاسکے گی.....؟“

”ایلی.....! میں ایک جال میں پھنسی ہوئی ہوں۔ خیر چھوڑو اس کو.....“

”کیوں چھوڑو اس بات کو؟ بہن کہا ہے تو بھائی کا حق استعمال کرنا بھی آتا ہے مجھ کو.....“

میں بہت دیر اُس سے مغز ماری کرتا رہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے آخر جب ناراض ہو جانے کا کہا تو وہ ایکدم مان گئی۔ اُس نے جو کہانی مجھے سنائی۔ اُس کا لب لباب کچھ یوں ہے۔ رینا دو بہن بھائی تھے۔ رینا کے والد کا کپ ٹاؤن کے نواح میں ایک ریسٹوران تھا۔ ریسٹوران رینا کے والدین مل کر چلاتے تھے۔ رینا کا ماموں جم کیٹی ریسٹوران کے ایک کونے پر اپنی بار چلاتا تھا۔ بار کی جگہ رینا کے والد نے انسانیت کے ناطے جم کو دے رکھی تھی۔ پہلے پہل تو جم کا کام ست رہا۔ پھر ایکدم اس کے کام کی رفتار نہایت تیز ہو گئی۔ اُس کی بار پر اکثر اوباش لوگ آتے تھے۔ وہ اکثر لڑکیوں سے چھپر چھڑا بھی کرتے تھے جس کی وجہ سے ریسٹوران کی گاہکی خراب ہونے لگی۔ اکثر کپلو ریسٹوران میں آنے سے کئی کترانے لگے۔ ریسٹوران کپلو ہی کی وجہ سے زیادہ چلتا تھا۔ کپلو کی آمد و رفت کم ہوئی تو کام بالکل ٹھپ ہو گیا۔

رینا کے باپ کو جب وجہ معلوم ہوئی تو اُس کا جم سے زبردست جھگڑا ہوا۔ اُس نے فوری طور پر جم کو بار والی جگہ خالی کرنے کا کہہ دیا۔ پہلے تو جم پس و پیش سے کام لیتا رہا۔ آخر بہن کے بے حد اصرار پر اُس نے بار خالی کر دی۔ رینا کے والد نے بار والی جگہ دوبارہ ہوٹل میں شامل کر لی۔ ایک دن رینا کے چھوٹے بھائی کو ایک خیر رفتار کار گھر سے باہر نکل مار گئی۔ اُس کا بھائی موقع پر جاں بحق ہو گیا۔ اُس کی ماں یہ صدمہ نہ سہہ سکی اور فالج کی مریض بن گئی۔ اس بیماری میں دو سال بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ جم رینا کے باپ کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تو میری بہن کو مارنے والا ہے جبکہ رینا کا باپ بیوی کی موت کے بعد خود بخود ہال ہو چکا تھا۔ اُس کے سر پر ایک جوان بیٹی کا بوجھ تھا۔ وہ اپنی چھٹی بیٹی کو نو جوان بے راہ روئل کی طرح اندھے کنویں میں دھکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس کی بیٹی بھی سب سے جدا تھی۔ اُس بیٹی نے ماں کی موت کے بعد باپ کو سنبھالا دیا مگر ایک دن اُس کا باپ بھی اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کی لاش فینٹم فارسٹ سے ملی تھی۔ اُس کو کسی نے بے دردی سے ذبح کر یا تھا۔ رینا غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس لیے سارے صدمے سہتی چلی گئی۔ باپ کی موت کے بعد جم کیٹی کی اس کا سر پرست تھا۔ اُس نے ساری دولت سمیٹ لی تھی اور رینا پرے سے واضح کر دیا تھا کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ جب تک وہ اُس سے تعاون کرتی رہے گی زندہ رہے گی۔ جس دن اُس نے مانگنے کی کوشش کی یا دھوکا دینے کی کوشش کی تو ماری جائے گی۔ جم رینا کو بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ وہ بانٹا تھا کہ رینا غیر معمولی لڑکی ہے۔ وہ اُسے دینے کی تلاش میں ساتھ ساتھ گھما رہا تھا۔ اُس کا خیال ناگہان رینا دینے کے متعلق جگہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کر دے گی۔ مگر وہ یہ بھول رہا تھا کہ رینا غیب کا علم

نہیں جانتی بلکہ نیند کی حالت میں آنے والے پراسرار خوابوں سے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگاتی ہے۔ غیر دانی اور چیز ہے، سچے خواب دیکھنا اور چیز۔

اب رینا جم کیٹی کی بے دام کی قیدی تھی۔ وہ خود کہتی تھی کہ وہ اس جال سے کبھی نہ نکل پائے گی۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اُسے کبھی بکھار یوں لگتا ہے جیسے اُس کے تمام گھرانے کا قاتل جم کیٹی ہی ہے۔ میں نے رینا کی تمام کہانی نہایت اطمینان سے سنی تھی۔ مجھے پتا بھی نہ چلا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مجھے اُس معصوم لڑکی کا غم رُلا رہا تھا جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے بہن کہا تھا حقیقتاً وہ مظلوم لڑکی تھی۔ میرے دل میں اُس کی ہمدردی کی مقدار اچانک بہت وافر ہو گئی تھی۔ مجھ یوں لگ رہا تھا میرے سامنے کھڑی لڑکی کوئی اور نہیں میری بہن صائمہ ہے۔ اچانک اور غیر ارادی ط پر میرے منہ سے نکلا ”صائمہ“ تو رینا حیرانگی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ صائمہ میری بہن کا نام ہے تو وہ مسکرا دی۔ مدہم تیرگی میں میں اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اُلجھے میں بولا۔

”رینا! میری بہن..... میں تمہارا بھائی ہوں۔ آج کے بعد تمہارا غم میرا غم ہو گا، تمہارا پریشانی میری پریشانی ہوگی تمہاری خوشی میری خوشی ہوگی۔ اب کوئی جبراً تمہیں قید میں نہیں رکھ سکے گا۔ کسی کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں جو تم سے تمہاری آزادی چھین لے۔“ مظلومیت کی مار رینا ایک سسکی لے کر میرے بازو سے لگ گئی۔

یہ زندگی کتنا چیز ہے؟ عجیب عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ طرح طرح کے شگوفے اس پھوٹتے ہیں۔ دس پندرہ دن پہلے میں رینا کو نہیں جانتا تھا۔ میرا اُس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ حالات یہ کیسی کروٹ تھی جو ایک درد بھری کہانی سے ہم دونوں کو اتنا قریب لے کر آ گئی تھی۔ صائمہ ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود مجھے یوں لگتا تھا۔ صائمہ میرے پاس موجود ہے۔ وہ میری خوش بے خوش ہوتی ہے۔ پریشانی پے پریشان ہوتی ہے۔ جنگل کے اس حصے میں رینا میرے بازو ساتھ لگ کر سسکی مٹاتی تھی جیسے اُسے سہارا میسر آ گیا تھا جیسے ڈوبتے ہوئے کو کنارہ مل گیا تھا اسی دوران رابعہ شلتی ہوئی اُس طرف آنکلی۔ وہ ہم دونوں کو یوں کھڑے دیکھ کر ٹھنک کر رک گئی۔ ر آنسو صاف کرتے ہوئے مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ رابعہ چلتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئی۔

”علی نواز! ابو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں بغیر کچھ کہے سنے کیمپ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچا تو سب لوگ بڑے الاؤ کے گرد بیٹھے

ہوئے تھے۔ ان سب لوگوں میں جم کیٹی، انکل مدثر، ہیری کرس اور شاہنواز مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ قطب الدین مجھے لیتا ہوا ایک کیمپ میں گھس گیا۔ الاؤ کے گرد نظر نہ آنے والے سب لوگ اس بڑے کیمپ میں موجود تھے۔ میرے ساتھ لڑکی کی لاش دریافت کرنے والے دونوں شکاری بھی ایک طرف کو بیٹھے تھے۔ میرے اور قطب الدین کے پہنچنے کے ساتھ ہی یہ مینگ شروع ہو گئی۔

جم کیٹی اپنی مخصوص گھمبیر آواز میں بولا۔ ”تو لڑکے تم نے وہ لاش تلاش کی تھی؟“

”جی ہاں.....!“ میں نے مختصر جواب دیا۔ یہ جم کیٹی سے میری تیسری دفعہ فیس ٹو فیس بات ہو رہی تھی۔ وہ بڑا رعب دار آدمی تھا مگر میں زندگی میں کسی کے رعب تلے نہیں آیا۔ بھلا اُس کے رعب تلے کیسے آ سکتا تھا۔ میں جب سے اس جنگل میں داخل ہوا تھا۔ یہ شخص میری آنکھوں میں کھنک رہا تھا۔ وہ مسلسل حیلے بہانوں سے مجھے مرعوب کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس دفعہ اُس کا پالا کیسے آدمی سے پڑا ہے۔

”تمہارا کہنا ہے کہ اُس لڑکی کو قتل کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد وہ جنگلی درندوں کے ہاتھ لگی ہے۔“ جم کیٹی نظریں مجھ پرے گاڑتے ہوئے بولا۔

”یہ میرا خیال ہے۔ آپ اسے رد بھی کر سکتے ہیں مگر میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لڑکی قتل ہوئی ہے۔“

”اور قاتل ہم سب لوگوں میں سے کوئی ہے۔“ جم کیٹی خونخوار لہجے میں بولا۔

”میرا خیال ہرگز یہ نہیں ہے۔“

”تو پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ اب کے قطب الدین بولا۔

”لڑکی کا قاتل وہی جنگلی ہو سکتا ہے جسے کل صبح میں نے دیکھا تھا۔“

”بہت خوب یعنی کہ جنگلی نے لڑکی کا سر کاٹا اور پھر اُسے سجانے کے لیے اپنے گھر لے گیا۔“

اُس دفعہ گوگی بیچ میں بولا۔ اُس کی مداخلت مجھے بہت بُری لگی۔ میں خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

”اگر آپ لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں تو ابھی میرے ساتھ چل کر دیکھ لیں۔ یہ دونوں شکاری بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ لڑکی کو قتل کیا گیا ہے۔“

میں نے دیکھا کہ گوگی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ وہ جب سے بیٹھا تھا مسلسل بے چین دکھ رہا تھا۔ سب لوگوں میں وہ واحد شخص ہی مجھے مشکوک دکھ رہا تھا۔

جم کیٹی نے سوالیہ نظروں سے دونوں شکاریوں کی طرف دیکھا تو اُن میں سے ایک بول اٹھا۔

”سرا ایل ٹھیک کہتا ہے۔ درندوں کے ہاتھ لگنے سے پہلے اس لڑکی کو قتل کیا گیا ہے۔ کسی نے بڑی رچی سے اس کا گلا گانا تھا۔ گردن کے قریب کسی درندے کے دانتوں یا پنجوں کے نشان نہیں پائے گئے اور ایک بات اور جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ وہ یہ تھی کہ گردن پے آنے والا زخم سیاہی مائل نیلگوں ہو چکا تھا جبکہ بقیہ تمام زخم تازہ دکھ رہے تھے جو اس بات کی علامت ہیں کہ گردن پے آنے والا زخم ایک دن پرانا ہے جبکہ بھیڑیے کے لگائے ہوئے زخم نئے اور تازہ ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ پہلے کسی نے لڑکی کو قتل کیا۔ اُس کے بعد اس کی لاش بھیڑیوں نے ہتھے چڑھی.....“ انکل مدر ہڈ سوچ لہجے میں بولے۔ وہ چند لمحے اپنی پیشانی مسلنے کے بعد بولے۔ ”یہ..... تو پھر..... وہی سلسلہ ہے.....؟“

”کیسا سلسلہ.....؟“ ہیری کرس اب کے بولا۔

”اس قتل کی کڑی تو پچھلے سال والے تین قتلوں کے ساتھ جا کر ملتی ہے۔“ انکل مدر نے باز مکمل کی تو سب ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھنے لگے۔

”یعنی کہ پچھلے سال ہونے والے قتل بھی اسی نوعیت کے تھے۔ اُن مقتولوں کے سربھی دھڑوا سے غائب تھے۔“ جم کیٹی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر سوچوں کا جال بٹا تھا۔ ”اس کا مطلب ہے..... کہ علی نواز کی بات میں وزن ہے۔“ جم کیٹی میری طرف اشارہ کرے ہوئے بولا۔ ”لڑکی کا قاتل وہی نظر آنے والا جنگلی آدمی ہو سکتا ہے۔“ جم کیٹی بولا۔

”ہو کیا سکتا ہے یقیناً وہی ہے۔“ اس دفعہ شاہنواز نہایت جوش کے عالم میں بولا۔ اُس آنکھیں کسی سنسنی خیز بات سے چمک رہی تھیں۔ وہ سب کو متوجہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ”نواز جب گینڈے کی لاش دیکھنے کے لیے اپنے گھوڑے پر اُدھر پہنچا تھا تو اُس نے جنگلی آدمی کو قبر کے درختوں میں موجود پایا تھا۔ علی نواز کو دیکھ کر اس جنگلی آدمی نے بُرا منایا اور علی نواز پر حملہ کر دیا۔ قسمت اچھی تھی جو علی نواز بچ گیا۔ اُس نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ سوال یہ ہوتا ہے۔ اُس نے علی نواز پر حملہ کیوں کیا.....؟“ شاہنواز بڑے جوشیلے انداز میں فر فر بول رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے کوئی کڑی اُس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

”اُس نے علی پر کیوں حملہ کیا تھا؟“ گوگی بولا۔

”اس لیے کہ علی نواز کہیں اُس کا شکار اٹھا کر نہ لے جائے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ جم کیٹی پُر سوچ لہجے میں سگریٹ دبے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہی کہ سفید گینڈے کی نسل کو تباہ کرنے والے یہی جنگلی لوگ ہیں۔ یہ اندرون جنگلوں میں قبیلے کی صورت میں رہتے ہیں۔ گینڈے کا شکار کر کے اس کے سینگ سے مالاکیں بناتے ہیں اور وہ بہن کر اپنے دیوتاؤں کو خوش کرتے ہیں۔“

”تمہیں یہ باتیں کہاں سے پتا چلیں.....؟“ قطب الدین بولا۔

”میں نے اس بارے میں موٹی موٹی کتابیں پڑھی ہیں۔ بہت ریسرچ کی ہے میں نے اس بارے میں۔“

”خاموش رہو قطب الدین۔“ جم کیٹی غصیلے لہجے میں بولا۔ ”شاہنواز کی بات میں وزن ہے۔ میں نے بھی اس بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے اور ہونہ ہو اس لڑکی اور پچھلے سال قتل ہونے والے تینوں بندوق کے قاتل یہی جنگلی لوگ ہیں۔ تم شاید بھولے نہیں ہو گے کہ سب قتل ہونے والوں کے سر غائب پائے گئے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا وہ سر کدھر گئے انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔“

سب لوگ ہڈ جوش جم کیٹی کی شکل دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور سیدھا ہوتے ہوئے پھر سے کہنے لگا۔ ”شاہنواز نے ان جنگلی لوگوں کے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں ابھی ذکر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ جانور قسم لوگ ان لوگوں کے سر کاٹ کر اپنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے لے گئے ہوں اور مجھے یقین ہے ایسا ہی کچھ ہے۔“ جم کیٹی اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کے بولا۔ جم کیٹی کے دلائل نے سب کو متاثر کیا تھا۔ میں بھی کافی حد تک اُس کی بات کا قائل ہو گیا تھا۔ واقعی یہ بات قابل غور تھی قتل کرنے والے کو لاش چھوڑ کر سر غائب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

خیر سب لوگ جم کیٹی کی بات پر متفق ہو گئے۔ اب سوال یہ اٹھا کہ آیا ان جنگلی لوگوں کا مقابلہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ تو اس بارے میں بڑا لمبا مباحثہ ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی گفت و شنید کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ کالج ٹور اور تاجر حضرات کو بیس کیپ واپس بھیج دیا جائے اور باقی لوگ اسلحہ سے لیس ہو کر جنگل کے اندر کی طرف پیش قدمی شروع کریں۔ سب کا خیال یہ تھا یہ مٹا ختم ہی ہو جانا چاہیے جس نے ایک ڈیڑھ سال سے اس جنگل میں خوف و ہراس پھیلایا ہوا تھا۔ اسلحہ وافر مقدار میں ہم لوگوں کے پاس موجود تھا۔ بس ہمیں ضرورت صرف ہمت اور حوصلے کی تھی۔ سب سے بڑی بات ہیری کرس خود اس مشن کے لیے تیار ہوا تھا۔ وہ جنگلی حیات کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا ان جنگلی لوگوں کے پاس ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ہلکی پھلکی تلواریں ہو سکتی ہیں یا یہ لوگ ہتھیار کے طور پر ایک لمبا بانس استعمال کرتے ہیں جس میں تیر رکھ کر زور سے پھونک مارتے ہیں۔ تیر

ہوں تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔“ نہ جانے کسی موڑ پر زندگی کی شام ہو جائے۔ میں نے دل میں سوچا اور ارادہ کر لیا کہ رابعہ کے سامنے اظہار محبت کر دوں۔ وہی الفاظ زبان پر لے آؤں جو پچھلے کئی سالوں سے میری زبان پر چل رہے تھے مگر ادا ہونے سے قاصر تھے۔ ہاں اب وہ وقت آ گیا تھا۔ میں بووی کو لیتا ہوا نیلے سے نیچے اتر آیا۔ میں نے اُسے عہد دے دیا تھا کہ تمہیں ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ وہ مسلسل یہ بھی ضد کیے جا رہا تھا کہ وہ میگی کی لاش دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ صبح سے پہلے ہم لوگ وہاں نہیں جاسکتے۔

اگلے دن کالج ٹور کو واپس بھیج دیا گیا۔ تاہم لوگ بھی واپس لوٹ گئے۔ بووی سائے کی طرح میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ وہ ایک لمحہ بھی مجھے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جم کیٹی اور دوسرے لوگ اُسے ساتھ لے جانے پر رضامند نہیں ہوں گے کیونکہ جم کیٹی نے اعلان کیا تھا کہ کوئی ”غیر متعلقہ“ آدمی اُن کے ساتھ نہیں جائے گا۔ بووی غیر متعلقہ تو نہیں تھا۔ پھر بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں اُسے واپس نہ لوٹا دیا جائے۔ آخر اُس کا یہ ڈر سچ ہی ثابت ہوا جم کیٹی کو جب معلوم ہوا کہ بووی کالج ٹور کے ساتھ واپس نہیں گیا تو اُس نے اس بات کا باقاعدہ بُرا مناما۔ میں نے بووی کی سچائی کے حق میں کہا۔ ”بووی مرنے والی لڑکی میگی کا کزن ہے اور وہ ہمارے ساتھ جانے کا حق رکھتا ہے۔“ میری بات سن کر جم کیٹی جھڑک اٹھا اور نہایت غصیلے لہجے میں بولا۔ ”ہم کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔“

”کیسا خطرہ جناب؟“ میں بھی سیدھا ہو گیا۔

”لڑکے تم حد سے بڑھ رہے ہو۔۔۔۔۔“

”میں حق کی بات کر رہا ہوں۔ بووی کا ہم سب سے زیادہ اُس قتل ہونے والی سے رشتہ تھا۔ وہ ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ وہ میگی کے قاتل سے بدلہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔“

میری بات سن کر جم کیٹی تہقہہ لگا کے ہنسا۔ ”تو یہ نوجوان جنگیوں کا مقابلہ کرے گا؟“ جم کیٹی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”ہاں سر! میں مقابلہ کروں گا اُن کا۔۔۔۔۔ میں اُن کو مار دوں گا یا مارا جاؤں گا۔۔۔۔۔ مگر میں واپس ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ بووی نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

جم کیٹی کچھ دیر کسی گہری سوچ میں منہمک رہا۔ پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے لڑکے ہم تمہیں ساتھ لے جاتے ہیں مگر تمہیں ایک عہد نامہ لکھ کر دینا ہو گا۔“

کی ساخت اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ پھونک کے زور سے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھتا ہے۔ اس تیر کا نام تجربہ مجھ پر بھی ہو چکا تھا۔ وہ تیر مجھے لگنے کی بجائے میرے گھوڑے کی گردن پر لگ گیا تھا۔ وہ تیر بعد از مرگ گھوڑے کی گردن سے نکال لیا گیا تھا۔ تیر ہمارے پاس محفوظ پڑا تھا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا اور نہایت نکولیا تھا۔

مینگ ختم ہوئی تو سب لوگ منتشر ہو گئے۔ میں ڈھلوان سے اترتا ہوا ایک نیلے کی طرف ہولیا۔ اسی وقت نیلے سے دوسری طرف مجھے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ میں تیزی سے نیلے کے عقب میں پہنچا۔ وہاں کالج ٹور کا ایک لڑکا بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو وہ اور زیادہ سکھنے لگا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے برابر بیٹھا لیا۔ میرے دوبارہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ مرنے والی لڑکی کا کزن ہے۔ لڑکے کا نام ”بووی“ تھا۔ وہ ابھی قہ کاٹھ کا ایک خوب لڑکا تھا۔ وہ اپنی کزن سے پیار کرتا تھا اور اُس سے شادی کا خواہشمند تھا۔ وہ اُسی کی وجہ سے اس جنگل میں آیا تھا اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُس کا دل جیتنا چاہتا تھا مگر اس سب کچھ سے پہلے وہ لڑکی جسے وہ ”میگی“ کہتا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا ہو گئی تھی۔ وہ تو اُس سے پیار کا اظہار بھی نہیں کر سکا تھا۔ حسرت اُس کے دل پر خیمہ ہو کر رہ گئی تھی۔ تنگی اُس کی آنکھوں میں مجسم ہو گئی تھی۔ وہ سر تا پا غم کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کا کہنا تھا ”مجھے خبر ہو چکی ہے کہ آپ لوگ کالج ٹور کے سب لوگوں کو واپس بھیجنا چاہ رہے ہیں۔“

”تمہیں کس سے پتا چلا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”میں خیمے سے باہر چھپ کر آپ لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔“

”میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گا جب تک میگی کے قاتل کو دیکھ نہ لوں۔ اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر لوں میں واپس نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔“

روتے روتے وہ جھک گیا اور اُس کا سر اس کے گھٹنوں پر جا لگا تھا۔

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اُسے دلا سہ دینے لگا۔ اُس کی کہانی سن کر میرا دل بھر آیا۔ اُس کی کہانی میری کہانی سے ملتی جلتی تھی۔ وہ یہاں میگی کا دل جیتنے آیا تھا مگر وہ وقت آنے سے پہلے میگی اسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔ میں خطرات میں گھرا ہوا کھلاڑی تھا۔ جس مشن پر ہم لوگ روانہ ہونے والے تھے وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رینا کی بات میرے ذہن سے ابھی نکلی نہیں تھی جو ایک دن الاؤ کے قریب بیٹھے اُس نے سنسنی خیز انداز میں مجھے کہی تھی۔ ”مسٹر ایلی! میں دیکھ رہی

”کیسا عہد نامہ؟“ بودی بولا۔

”یہ کہ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اُس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“ جم کیٹی بولا۔  
”یہ کیسا عہد نامہ ہے؟“ میں سچ میں بول اٹھا۔

”اب تک اس جنگل میں چار حادثات ہو چکے ہیں۔ چار انسان پُر اسرار موت مارے جا چکے ہیں۔ اس سے زیادہ رسک ہم لوگ نہیں لے سکتے۔ اب یہاں موجود سب لوگ ہمارے گینگ کے آدمی ہیں۔ بس بودی باہر کا آدمی ہے۔ ہم اسے ساتھ رکھ کر مزید رسک لینا نہیں چاہتے۔“  
”میں ابھی اور اسی وقت عہد نامہ لکھنے کو تیار ہوں۔“ بودی دو قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اپنی زندگی موت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ جا سکتے ہو۔“ جم کیٹی کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔

جم کیٹی نے اُسی وقت بودی سے عہد نامہ لکھوا کر اُس کے دستخط کروا لیے۔ بودی اب ہم لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھا۔ ابھی یہ بات ختم ہی ہوئی تھی کہ گوگی گھوڑا دوڑاتا ہوا برآمد ہوا۔ اچھل کر گھوڑے سے نیچے اترا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ ”کل مارے جانے والے گینڈے کے سر سے سینگ غائب ہے۔“ اُس نے اچانک دھماکا کیا۔  
”سینگ غائب ہے؟“ ہیری کرس کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔

”میں ابھی مردہ گینڈے کو نظر مارنے گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو بہت سے گیدڑ اُس کی لاش سے گوشت نوج نوج کر کھا رہے تھے۔ میں نے دور سے ہی دیکھا۔ اس کے سر سے سینگ غائب تھا۔“  
”ہو سکتا ہے تمہیں دور سے غلطی لگی ہو۔۔۔۔۔“ اُنکل مدثر بولے۔

”سینگ کوئی ایسی چھوٹی چیز تو نہیں ہے جو نظر نہ آ سکے۔ اس کے سینگ والی جگہ پر خون سے لٹھڑا ایک گڑھا نظر آ رہا تھا۔“

جم کیٹی کے کئی ساتھیوں نے اپنے کندھوں سے رائفلیں اتار لیں۔ میں بھی اپنا روپیئر سنبھال چکا تھا۔ جم کیٹی کی معیت میں سات آٹھ بندے گینڈے کی لاش کی طرف چل دیے۔ میں اور شاہنواز بھی اُس میں پیش پیش تھے۔ خیال یہی تھا کہ گینڈے کا سینگ اتارنے والا جنگلی آدمی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس وقت ہمارے علاوہ کوئی شکار پارٹی یہاں موجود نہیں تھی اور اگر یہ جنگلی آدمیوں کا کام ہی تھا تو جنگلی کہیں ہمارے آس پاس ہی موجود تھے۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو اچانک کہیں سے رینا برآمد ہوئی اور اُس نے میرے گھوڑے

کی زین تھام لی۔ ”ایلی بھائی! اپنا خیال رکھنا۔“ وہ فکر مندی سے بولی تو مجھے یوں لگا جیسے سارے جسم بے چیونٹیاں ریگ گئی ہوں۔ وہ مجھے اپنا بھائی ماننے کے طور پر اتنی دور نکل جائے گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس کی والہانہ محبت سے میرا جی بھر آیا۔ اچانک بے تحاشا پانی کہیں سے میری آنکھوں میں اُڑ آیا۔ میں اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کے بولا۔ ”رینا! تم فکر مت کرو۔۔۔۔۔ تمہاری محبت مجھے اتنی جلدی مرنے نہیں دے گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور گھوڑے کو ایڈ لگا دی۔ چڑھائی کے لیے سدھایا ہوا گھوڑا بڑی تیزی سے ٹیلوں کو عبور کرنے لگا۔ میں سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک بارہ بور کے چھ سات دھماکے گونجے۔ اس دوران میں مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ فائر گیدڑوں کو بھگانے کے لیے کیے گئے تھے۔ گیدڑ تو چشمِ ذدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے مگر یہ کوئی سمجھدار حرکت نہیں کی گئی تھی اگر جنگلی اُدھر آس پاس ہی کہیں موجود تھے تو فائرنگ کی آواز سن کر بھاگ چکے ہوتے۔ گینڈے کی لاش کی حالت بڑی بُری ہو رہی تھی۔ اس کا وجود کئی حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ ہیری کرس نے بتایا کہ یہ کام صرف گیدڑوں کا نہیں گینڈے کا یہ حال لگڑ گڈوں نے کیا ہوگا۔

واحد یہ جانور ایسا ہے جس کی کثرت سے موجودگی سے شیر بھی پناہ مانگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لگڑ گڈا کھٹل کر شیر کو پکڑ لیتے ہیں اور اسے مار کر ہی دم لیتے ہیں۔ ماہرین اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جو طاقت اور پکڑ لگڑ گڈوں کے جڑوں میں ہے، کسی اور جانور کے جڑوں میں نہیں۔ جب یہ اپنے غیر معمولی طاقت کے جڑے سے کسی چیز کو پکڑ لیتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اُس سے اُس کا ہدف نہیں چھین سکتی۔ اکیلا لگڑ گڈ شیر کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ یہ زیادہ تعداد میں ہوں تو شیر کی شامت آ جاتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں قدرت نے ہر سیر کے لیے سوا سیر پیدا کر رکھا ہے۔

گینڈے کی سخت ترین کھال یقیناً لگڑ گڈوں نے ہی اڑھیل تھی۔ گوگی کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔ گینڈے کے سینگ کو کسی نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے اس کے سر سے نکال لیا تھا۔ وہاں ایک مہیب اور خونی گڑھا نظر آ رہا تھا۔ جم کیٹی کے حکم سے سب لوگ آتشیں اسلحہ لیے آگے کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ میں نے دیکھا میرے دائیں طرف بودی بھی راتفل تھا اُسے آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں انتقام کی سرخی مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا اُسے جیسے ہی جنگلی نظر آئے گا وہ اُسے بھون ڈالے گا۔ ہم ڈیڑھ دو کوس تک پیش قدمی کرتے رہے۔ ہم نے تمام جنگل کھجال مارا مگر جنگلی کہیں نظر نہیں آیا۔ جم کیٹی کے حکم سے یہ سارا قافلہ واپس لوٹ آیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ کل تمام کیسپس اکھاڑ کر مکمل طور پر یہاں سے آگے کی طرف پیش قدمی کی جائے گی۔ بودی بہت جوشیلا ہو رہا تھا۔

کے فارتنگ کے سبب جنگل میں روپوش ہو گیا ہے۔ کسی میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے سب لوگ واپس آ گئے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ سب کے ساتھ ہی رہیں گے جس طرح اکٹھے آئے تھے اس طرح اکٹھے واپس جائیں گے۔ لمبی چوڑی بحث و تہیص اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ سب لوگ اکٹھے ہی رہیں گے اور اکٹھے ہی واپس جائیں گے مگر اپنی زندگی کا ہر کوئی خود ذمہ دار ہو گا۔ سب لوگ اس بات پر راضی ہو گئے۔ کیمپ میں ایک دفعہ پھر سے میلہ سا لگ گیا تھا۔ گھنے اور مہیب جنگل میں اتنے بڑے عملے کی موجودگی سب کو تحفظ کا احساس دلا رہی تھی۔ جنگلی جانوروں کے خوف نے سب کو ایک جان کر دیا تھا مگر مجھے اس وقت کسی اور طرح کا خوف دامن گیر تھا۔ میرے خوف کو کوئی نہیں سمجھ رہا تھا۔ میگے جانوروں نہیں بلکہ انسانوں کے ہاتھوں قتل ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار مجھے لگ رہا تھا جیسے میگے کا قاتل ہم لوگوں میں ہی موجود ہے۔ شاید لاشعوری طور پر اس کی وجہ رینا کا وہ خواب ہو جو اُس نے مجھے ایک دن پہلے سنایا تھا۔

رہ رہ کے درخت کا وہ تائمری نگاہوں میں گھوم رہا تھا جس کی جڑ میں مٹی بھر بھری ہو رہی تھی۔ زمین وہاں سے کسی یا نیچے سے کھودی گئی تھی۔ کیا اس زمین کو دینے کی تلاش کے سلسلے میں کھودا گیا تھا؟ مگر وہ درخت تو عام تنے کا تھا جبکہ دینے والے درخت کے بارے میں مجھے شاہنواز سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ بہت غیر معمولی تنے کا درخت ہے۔ تو کیا کسی اور مقصد سے وہاں کھدائی کی گئی تھی۔ یکدم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور زمین آسمان میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میری دھڑکنوں میں بلا کی بے چینی عود کر آئی۔ کہیں..... کہیں..... میگے کو قتل کرنے والے نے اُس کا سر تو وہاں نہیں دفنایا تھا۔ درخت کے تنے پر پائے جانے والے کسی کے نشان میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ شاہنواز میرے تاثرات بھانپ گیا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! کیا بات ہے.....؟ یوں لگتا ہے کوئی بات ہے..... تمہارے ذہن میں.....“

”ہاں شاہنواز! بہت ہی اہم بات۔“

شاہنواز نے پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ میں نے اپنا اندیشہ شاہنواز پر ظاہر کر دیا۔ وہ میری پوری بات سن کر ہنس دیا۔ ”تو تم اس بھر بھری مٹی کی بات کر رہے ہو.....“

”ہاں شاہنواز مجھے لگتا ہے.....“

”چھوڑو یا ر! وہ کھدائی میں نے کی تھی.....“

”تم نے.....؟“ میں چوکتے ہوئے بولا۔

اُس کا خیال تھا۔ ابھی آگے کی طرف بڑھا جائے تاکہ ”دشمن“ ہماری دسترس سے کہیں دور نہ نکل جائے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ کام تیزی اور جوش کا نہیں بلکہ تحمل مزاحمت کا ہے۔ اٹھا ہوا ایک غلط قدم ہمیں موت کی وادی میں دھکیل سکتا ہے۔“

دوپہر کا کھانا ابلے ہوئے چاول اور روٹ ہرن کے ساتھ کیا گیا۔ کھانے کے بعد چند لوگوں کو کیمپ کے پاس چھوڑ کر باقی تمام لوگ میگے کی لاش دیکھنے چل پڑے۔ بودی کی حالت بڑی پتلی ہو رہی تھی۔ بار بار اُس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ میں برابر اُسے حوصلہ دے رہا تھا مگر مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر سب لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ میگے کی ہڈیوں کے ٹوٹے پھوٹے پتھر کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ بودی اُس کی ہڈیوں کو چھو کر دھاڑیں مارنے لگا۔ وہ بزارقت آئیز منظر تھا۔ یہ منظر دیکھ کر کئی لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بودی سسک رہا تھا اور سب لوگ اُسے اور میگے کی بچی کچھی ہڈیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ایک درخت کو تھام کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بودی کی کہانی نے مجھے بھی رلا دیا تھا۔ آنکھیں پونچھتے پونچھتے اچانک میرا دھیان درخت کی جڑ کے قریب گیا۔ درخت کے قریب کی مٹی بھر بھری ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے یہاں زمین کھودنے کے بعد دوبارہ مٹی برابر کی ہو۔ میں بھر بھری مٹی کو جوتے کی نوک سے کریدنے لگا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ کسی جنگلی جانور نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ خرگوش بھی ایسے کام اکثر کرتے رہتے ہیں۔ سرنگ نمائل کھودتے ہوئے جو بل آگے سے بند ہو جائے یا پسند نہ آئے اُسے خرگوش دوبارہ مٹی ڈال کے بند کر دیتے ہیں۔ میرا خیال بھی اسی جانور کی طرف گیا تھا مگر اچانک ایک چیز دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ درخت کے تنے پر کسی کے نشان پڑے ہوئے تھے جیسے یہاں کوئی آدمی کسی سے زمین کھودتا رہا تھا۔ زمین کھودتے ہوئے کسی اپنے ہدف سے پھسل کر تنے کے ساتھ لگتی رہی تھی جس کی وجہ سے درخت کے تنے کا چھلکا کئی جگہ سے اُترا ہوا تھا۔ سب لوگ بودی کی طرف یوں مگن ہوئے تھے کہ کسی کا دھیان میری طرف نہیں گیا تھا۔“

میگے کی باقی ماندہ ہڈیوں کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر باندھ لیا گیا تھا۔ اسی وقت سب لوگ واپسی کے لیے چل پڑے۔ میں نے وہ درخت اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔

سب لوگ بخیر و عافیت کیمپ میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک اور خبر ہماری منتظر تھی۔ بیس کیمپ کی طرف جانے والے لوگ واپس لوٹ آئے تھے۔ وہ بڑی ہی سنسنی خیز خبر لے کر آئے تھے۔ اُن کا کہنا تھا۔ اُن کے گروپ پر ایک آدم خور شیر نے حملہ کر دیا تھا۔ شیر دولڑکیوں اور ایک تاجر کو معمولی زخمی کر

”ہاں میں نے..... اب تم پوچھو گے کس لیے..... تو وہ اس لیے..... کہ میں نے وہاں اونٹ ٹانگ کی اوپری ہڈی دبائی ہے۔“

”ہڈی دبائی ہے؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا.....؟“

”جسم کبھی کو ایک روحانی راہب نے یہ مشورہ دیا تھا کہ من کی مراد پانے کے لیے جنگل میں سات میل کے بعد زمین میں اونٹ کی ٹانگ کی ہڈی دفن کر دی۔ بہت جلد منزل مل جائے گی۔ 1 بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں۔“

”اچھا تو وہ تم تھے.....؟“ میں مسکرا دیا۔

”اگر ابھی بھی شک والی بات ہے تو چلو میرے ساتھ میں دوبارہ زمین کھود کر اونٹ کی ہڈی تمہیں دکھا دیتا ہوں۔“ شاہنواز شوخ لہجے میں بولا۔

”جناب عالی! میں مانا مجھے یقین آیا۔“ میں سینے پے ہاتھ رکھ کر سر جھکاتے ہوئے بولا تو دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ الفاظ ہم بچپن میں ڈرامہ بناتے ہوئے بولا کرتے تھے۔

جنگل میں اگلی طرف پیش قدمی کو دو دن کے لیے موخر کر دیا گیا تھا۔ سب سے یہ کہا گیا تھا ہر کوئی مکمل تیاری کر لے۔ اسلحہ تو ہمارے پاس وافر مقدار میں موجود تھا۔ سب لوگ اقب تیار ہوں یہ گمن تھے۔ یہ مشن ایک ایڈونچر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہر ایک کا حوصلہ بلند تھا۔ ہیری کرس۔ اس بارے میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ”اگر ہم لوگ کیمرہ میں پائے جا۔ والے خوف کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ پہلے میرا خیال تھا جنگلی آدمیوں کے لیے ایک اسپیشل ٹیم بھیجی جائے مگر اب میں سوچتا ہوں یہ کام ہم لوگ بھی تو کر سکتے ہیں اگر عزم جواں اور حوصلہ بلند ہو تو انسان کے۔ ٹو اور ماؤنٹ ایورسٹ بھی سر کر لیتا ہے۔“ ہیری کرس کی تقریر نے پورے مجھے میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ہر کوئی ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد اور تیار دکھائی دیتا تھا۔ پلان یہ بنایا گیا تھا کہ لڑکیوں اور تمام کمزور حضرات کو درمیان رکھا جائے گا۔ باقی تمام لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر چلیں گے۔ یوں انہیں تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

آسان پر مہین بادل تیر رہے تھے۔ ہلکی پھوار کی مانند برکھارس رہی تھی۔ میں اپنا برساتی سونا خیمے کے اندر سے لینے گیا تھا۔ خیمے کے اندر رابعہ نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی وہ نہایت سنجیدہ بھی ہوتی تھی تو اُس کے اندر کہیں شرارت چھپی رہتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی شرارت آتی

لہجے میں بولی۔ ”کمانڈر صاحب! بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

میں اُس کی بات سن کر ہنس دیا۔ ”تم نے مجھے کمانڈر کس چکر میں کہا.....؟“

”کیونکہ تم کمانڈر ہو.....“ وہ گول مٹول آنکھیں گھما کر بولی۔

”کمانڈر تو بہت مضبوط آدمی ہوتا ہے۔“

”تو وہ تم ہو.....“ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

”نہیں بالکل نہیں ہوں۔“ میری آنکھوں میں نمی کا جال سا بن گیا۔ ”مم..... میں بہت کمزور

آدمی ہوں۔ اپنے وجود میں ایسا ہوا کمزور آدمی.....“

”نہیں تم بہت مضبوط ہینڈسم اور اچھے انسان ہو۔“ میں رابعہ کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس سے

پہلے میں کچھ بولتا۔ وہ چہرے پر بڑے بالوں کی لٹ اپنے کان کے پیچھے اڑتے بولی۔ ”علی نواز! میں

تمہاری بہادری کی قدر کرتی ہوں۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”اُس دن جس طرح تم نے اپنی جان پر

کھیل کر میری زندگی بچائی..... مجھے سمجھ نہیں آتی تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں گی اگر تم بروقت میرے

ادھر بھیڑیے کے درمیان نہ آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔“

”رابعہ! بیویوں کا احسان نہیں جتایا جاتا۔“ میری آنکھیں ٹوٹ باگئیں۔ میرے سینے میں

جذبات کا سمندر ایک دم سے موجزن ہو گیا۔ میں پچھلے دو دن سے رابعہ سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ

رہا تھا۔ میں کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ میں آج اپنا دل اُس کے سامنے کھول کر رکھ دینا چاہتا

تھا۔ میں اُسے بتا دینا چاہتا تھا کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرے دل میں اُس کے لیے کتنی

ترپ ہے۔ اُس کے بغیر اتنے سال میں نے کس کرب کے عالم میں گزارے ہیں۔ فراق کا کیسا کیسا

وقت مجھے روندنا ہوا گزرا تھا۔ ہاں..... میں اُسے آج ساری کہانی سنا دینا چاہتا تھا اور اُسے یہ بھی بتا

دینا چاہتا تھا کہ میں یہاں کس غرض سے آیا تھا۔

”کہا ہو گئے کمانڈر صاحب!“ رابعہ میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ میں

اُس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”رابعہ! یہ خواہش اتنی ظالم کیوں ہوتی ہیں؟ کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتیں۔“

رابعہ بڑی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات میں

پڑھ نہیں سکا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی کروٹیں لینے لگی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے آنسوؤں کو اندر ہی

نڈر پینے لگی۔ پھر گلوگیر آواز میں بولی۔ ”علی نواز! اگر مجھے بچاتے ہوئے تمہاری جان چلی جاتی تو

”میں خود کو دنیا کا خوش قسمت آدمی گردانتا۔“ میں اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا  
 ”انتا پیار کرتے ہو مجھ سے؟“

”اس سے بھی کہیں زیادہ کرتا ہوں۔“

”بچپن کی باتیں یاد ہیں تم کو.....؟“

”ایک ایک منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔“

”میرے جانے کے بعد کبھی مجھے یاد کیا.....؟“

”تمہیں انتا یاد کیا کہ خود کو بھول گیا۔“

”میں تمہاری بہت زیادہ عزت کرتی ہوں۔ مجھے..... مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ تم.....“

”اچھے اور بھلے انسان ہو! علی نواز۔“

سینکڑوں شہنائیاں ایک ساتھ میرے اندر بج اٹھیں۔ ہر چیز رقص کرنے لگی ہر منظر آنکھوں  
 بھلا لگنے لگا۔ میں بچپن میں اپنی پیاری والدہ کے ساتھ اپنے گاؤں میں میلہ دیکھنے گیا تھا وہاں  
 رنگیلا آدمی دنیا اور مافیہا سے بے خبر ڈھول کی دھاپ پر دیوانہ وار رقص کر رہا تھا۔ مجھے اس سے  
 محسوس ہو رہا تھا جیسے وہی رنگیلا آدمی میرے وجود میں دنیا سے بے خبر بھگڑا ڈال رہا ہے۔ اگر  
 دھمالوں کی دھپ دھپ میری رگوں میں بہتے سرخ سیال کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔ میری آنکھوں  
 آنسوؤں کے شادیانے بج رہے تھے۔ میں نے ان آنسوؤں کو بڑے کمال سے اپنی آنکھوں  
 کٹوروں میں روک رکھا تھا۔ خوشی اگر کسی تالاب کا نام ہے تو میں اس لمحے پورے وجود کے ساتھ  
 ”تالاب“ میں غرق تھا۔ میرا دل بڑے زور و شور سے دھڑک رہا تھا۔ پہلوئے دل کے کہیں آس  
 ہی مٹھی اور سرور دیتی آگ کا الاؤ روشن ہو گیا تھا۔ ایک دل نواز حدت تھی جس نے میرے پورے  
 وجود کو ڈھانپ لیا تھا۔

”رابعہ میں.....“ میرا گلارندہ گیا، الفاظ گلے کے اندر ہی اٹک کر رہ گئے اور میں اپنا جملہ

نہ کر سکا.....

”علی نواز! تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ خواہشیں بڑی خالم ہوتی ہیں۔ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا  
 انسان ان کے پورا ہونے کی تمنا میں ہزار بار جیتا ہے ہزار بار مرتا ہے۔ یہ لمحہ بلکہ انسان کو کچلتی پڑ  
 ہر پل بے چینی بے فکری کی صورت اپنا خراج وصول کرتی ہیں۔“ وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش؟

پھر بہت آہستگی سے بولی۔ ”نوئی! تم میرے بہت اچھے اور پیارے دوست ہو۔ تمہیں یاد ہے میں  
 بچپن میں شاہنواز سے لڑ کر روٹھ جایا کرتی تھی اور تمہارے پاس چلی آیا کرتی تھی پھر تم شاہنواز سے لڑ  
 کر میرا بدلہ اتارتے تھے۔ یوں میرا غصہ دور ہو جایا کرتا تھا۔“ میں نے دیکھا رابعہ آنسوؤں کے ساتھ  
 روٹنے لگی تھی وہ مسلسل بے چینی سے ہاتھ مروڑے جا رہی تھی۔ ”نوئی! مجھے آج بھی تمہاری ضرورت  
 ہے اپنے پیارے دوست کی ضرورت ہے۔ ٹھہرو..... شاید تم میری بات ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ پا  
 رہے ہو میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ نوئی! میں شاہنواز کو اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔ وہ  
 میرا پہلا اور آخری پیار ہے..... مم..... میں..... میں اس کے بنا زندہ نہیں رہ سکتی! نوئی۔“

ایک جھکا سا لگا اور میرے اعصاب ادھڑتے چلے گئے۔ ایک نوکیلا بھالا میری نگاہوں میں  
 چمکا تھا اور وہ بھالا میرے سینے کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا تھا۔ جنگل کے تمام وحشی درندے جیسے  
 ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے تھے۔ شیر نے میرے وجود کو چیر پھاڑ ڈالا تھا۔ میرا دل جیسے بارہ سنکھے کے  
 سینگوں میں اٹک گیا تھا۔ سانپ کے ڈنک ہتھوڑے بن کر دماغ پر برس رہے تھے۔ میں جیسے ہاتھی  
 کے دزنی قدم کے نیچے پڑا تھلا رہا تھا۔ میرا سانس سینے کے اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک  
 خوفناک آندھی چلی تھی جس نے ہر چیز کو خونی سرخی میں ڈبو دیا تھا۔ ایک بے رحم برق گری تھی جس نے  
 سب کچھ خاکستر کر دیا تھا۔ میں اپنے وجود کے خاکستر سے زندگی کی چنگاری ٹٹول کے ڈھونڈ رہا تھا۔  
 چنگاری کہیں نہیں تھی ہر طرف راکھ ہی راکھ تھی..... ہر طرف بربادی ہی بربادی تھی۔ ایک ہلکی سی  
 چنگاری یکدم پھوٹی۔ ”نوئی! تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔“

”ہوں..... ہاں..... ہاں.....“ میں آپ ہی آپ میں سمٹ کر رہ گیا، میرے آنسو آنکھوں  
 کے اندر ہی کہیں دفن ہو کر رہ گئے تھے۔ رابعہ نے حملہ ہی اتنا چانک کیا تھا کہ سب کچھ ٹھنڈ ہو کر رہ گیا  
 تھا۔ میرے تمام حواس دل کے مقام پر اکٹھے ہو کر دھڑکنے لگے تھے۔

”نوئی! شاہنواز بے وقوف ہے دل کی زبان نہیں سمجھتا۔“  
 ”تم بھی تو کتنی ناسمجھ ہو دل کی زبان نہیں سمجھتی۔“ آنسوؤں میں ڈوبے الفاظ میرے حلق سے  
 برآمد ہوئے۔

”کیا مطلب؟“ وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے یکدم بات بدلی اور بولا۔ ”مطلب یہ کہ تم آج تک اسے نہیں کہہ سکی ہو کہ تم اس سے  
 پیار کرتی ہو۔“ الفاظ ادا کرتے ہوئے دل کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔



”تمہیں کیسے پتا کہ میں پیار کا اظہار نہیں کر سکی ہوں۔“

”بس مجھے پتا ہے ناں“

”تو میں پھر اسے کہہ دوں۔“ رابعہ بولی۔

”کیا.....؟“

”یہی کہ میں اُس سے پیار کرتی ہوں۔“

”اور نہیں تو کیا..... جب تک اظہار نہیں کرو گی اسے کیسے معلوم ہوگا۔“

”لڑکیاں یہ کام کبھی نہیں کر سکتیں.....“

”تو پھر.....“

”یہ کام تمہیں ہی کرنا ہے۔“

”مجھے؟“

”ہاں تمہیں..... ہی اظہار کرنا ہے۔“

”میں یہ نہیں کر سکوں گا.....“

”تو پھر تم میرے اچھے دوست نہ ہوئے ناں۔“

”مذاق کر رہا تھا..... میں بات کروں گا۔“

”سچ.....“ رابعہ ایک دم سے چپک اٹھی۔

”ہاں..... میں تمہارے لئے شاہنواز سے بات کروں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ رابعہ تمہارے دو بانوں کی طرح چاہتی ہے۔ وہ تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔“

”تھینک یو..... تھینک یو سوچ!“ رابعہ نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ایک برقی میرے رگ پے میں دوڑ گئی تھی۔ رابعہ ایک دم میرا ہاتھ جھٹک کر چبکتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں اکیلا منجد ہار میں کھ رہ گیا۔ میری آنکھوں میں دماغ میں ایک زہریلی دھند سی چھانے لگی تھی۔ ہر چیز تاریک اور ہر روشا مدہم دکھنے لگی تھی۔ آنسوؤں سے میرا حلق کڑوا ہو رہا تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور دماغ پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا اچانک میرے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور میں دھاڑیں مار کے رو لگا۔

میں دھم سے سلیپنگ بیگ پر جا پڑا تھا۔ اندر لگنے والی چوٹ سے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ میں بار بار آنسو پونچھ رہا تھا مگر وہ بہتے ہی چلے آ رہے تھے۔ آج ماں مجھے ہمیشہ سے زیادہ یاد آ رہی

تھی۔ میں پاکستان میں ماں کی گود میں سر رکھنے سے چڑ جایا کرتا تھا مگر اس لمحے میرے من میں جذبات کے سمندر اچھل رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا ماں میرے پاس ہو تو اس کی گود میں سر رکھ کر ساری دنیا کو بھول جاؤں۔ وہ ماما کے آنچل میں میرے سارے دکھ سمیٹ لے میں اس پیار بھرے وجود کے ساتھ لگ کر آنسوؤں کے دریا بہا دوں اس کو اپنے دل کا سارا دکھڑا سنا دوں۔ مگر یہ سب ممکن نہیں تھا میری ماں مجھ سے ہزاروں میل کی دوری پر بیٹھی میری راہیں تک رہی تھی۔ وہ کیوں آدھی رات تک میرے لئے کھانا لئے بیٹھی ہوتی تھی؟ وہ کیوں مجھے دیکھتے دیکھتے تھکتی نہیں تھی؟ وہ کیوں میرا سراپنی گود میں لے کر پیار کیا کرتی تھی میرے بالوں میں اپنی ماما کی انگلیاں پھیرا کرتی تھی۔ آج سب کچھ یاد آ رہا تھا..... آج..... سب کچھ سمجھ میں آ رہا تھا..... اس کا پیار محبت کی معراج کو چھوٹا تھا۔ وہ ایک ماں تھی..... اولاد کی محبت میں بری طرح جکڑی ہوئی ماں۔ آج میری ماں مجھ سے دور تھی اور میرے دل میں ماں کی محبت بہت شدت سے جاگ اٹھی تھی میرا دل چاہ رہا تھا میں ماں کو خوش دیکھنے کے لئے ساری دنیا سے منہ موڑ لوں جیسا میری ماں کہے ویسا ہی کرتا چلا جاؤں۔ میں تقریباً دو گھنٹے مسلسل روتا رہا تھا پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی دوبارہ جب آنکھ کھلی تو رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے پے کی نے انگارے ہی انگارے دھردیئے ہوں۔ میں نے کمپ کے روزن سے جھانک کر دیکھا باہر سب لوگ آگ کے گرد بیٹھے تھے میں روزن سے ہٹ گیا بخار کی شدت سے مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے یکدم خیمے کے بانس کو تھام لیا میری آنکھیں ایک بار پھر سے برسنے لگیں گذرا ہوا وقت یاد آیا تو سینے میں ایک پھانس سی چبکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں پھر سے لیٹ گیا۔ مگر پھر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا مجھے کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ میں سب کچھ بھلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب جب میں یہ کوشش کرتا تب تب رابعہ اور شدت سے سنانے لگتی میرے سینے کی چیخیں مسلسل بڑھنے لگتی۔ جب کچھ بن نہ پڑی تو میں ہچکیوں کے ساتھ دسنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مسلسل کوئی میرے دل کو کچوکے لگائے جا رہا ہے۔ میں اس کرب سے نکلنا چاہتا تھا اس جان لیوا کیفیت سے باہر آنا چاہتا تھا۔

میں بخار میں تپتا رہا اور بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑاتا رہا۔ میری زبان سے بار بار رابعہ کے الفاظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ میں پتا نہیں بے ہوشی کے عالم میں کتنی دیر خود سے باتیں کرتا رہا پھر اسی عالم میں نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ نیند کی دیوی کا دامن بھی کانٹوں سے بھرا پڑا فنا۔ تمام رات میں بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ سوتے میں بھی میری آنکھوں سے آنسو

بہتے رہے جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو صبح پانچ کا وقت تھا سارا گروپ خواب خرگوش کے مزے لو رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا خیے سے باہر نکل آیا باہر عجیب سماں بندھا ہوا تھا۔ سارا جنگل جیسے سویا پڑ بس پرندوں کی مختلف بولیاں چبک رہی تھیں جنگلی مٹی اور ٹیڑی کی آواز بھی معدوم ہو گئی تھی۔ میں پتھر کے ساتھ ٹپک لگا کر بیٹھ گیا رات چلنے والا الاؤ بجھ چکا تھا مگر اس میں سے دھواں ابھی تک اٹھ تھا۔ بالکل میرے وجود میں سے اٹھنے والے دھوئیں کی طرح.....

میں نے سائینڈ پاکٹ سے اپنا ہوا نکالا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔ میرے بچپن کی تصویر تھی۔ میں رابع کا ہاتھ تھا مے جاسن کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ میرا چہرہ بڑا تھا جبکہ رابع کے چہرے بے بھر پور مسکراہٹ تھی اس کے گلابی مسوڑھوں میں جڑے موتیوں جیسے داہ ستاروں کی مانند دکھ رہے تھے۔

یہ تصویر کئی سال سے میرے بٹے میں محفوظ تھی۔ میں اکثر اوقات یہ تصویر نکال کر دیکھا تھا اور باغ باغ ہو جایا کرتا تھا مگر آج یہ تصویر دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ تصویر بٹے سے نکال کر پھاڑ ڈالوں مگر بہت کوشش کے باوجود بھی میں اپنا نہ کر سکا۔ گزری وہ خوفناک رات مجھے یاد آئی تو میں بے چینی کی آخری حدوں کو چھو گیا۔ میری حالت اس چیز کی مانند جو آگ میں جل رہی ہو نہ ہی وہ اڑ سکے نہ ہی اس کی جان نکلے۔ قریب تھا کہ میں کچھ کر گزرتا کہ سوچ میری بے چین دھڑکنوں کو طمانیت کی چادر اوڑھا گئی۔ میں ایک دم مشینی انداز میں اٹھا اور بے ڈم کی طرف بڑھ گیا گم گشتہ لمحوں کی دھول میری آنکھوں میں رقصاں تھی میں نے بے خودی۔ عالم میں آستین اوپر چڑھائے اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔ میں جوں جوں وضو کرتا گیا مجھ پر نشاط اور سرد کیفیت طاری ہوتی چلی گئی۔ سرشاری میرے انگ انگ سے پھوٹنے لگی۔ آنکھوں میں لطیف و آنسو اُٹھ آئے۔

میں اسی کیفیت میں نماز کے لئے کھڑا ہو گیا یہ میری فجر کی نماز تھی۔ نماز میں مجھ پر کچکی کیفیت طاری رہی۔ سارا جنگل ہلکی ہلکی تیرگی میں چھپا ہوا تھا۔ نماز کے بعد میں نے بڑی طویل مانگی میری آنکھیں کئی بار بھیکیں کئی بار میں نے انہیں صاف کیا۔ دعا مانگنے کے بعد بھی میں پتھر پر حالت میں بیٹھا رہا میری حالت ناقابل بیان تھی جیسے پُر شور طوفان ایک دم سے قہم گیا تھا جیسے قیام کی گھڑیاں گزر گئی تھیں اور ایک پُر سکون سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ میں پتھر پر مراقبہ کی حالت میں بیٹھا ایک جنگلی خرگوش بھاگتا ہوا پتھر پر چڑھ آیا تھا وہ مجھ سے چار بالشت کے فاصلے پر اگے سبزے پر

بارنے لگا۔ میرے دل نے ایک میٹھی سی چٹکی لی خرگوش کی نگاہ ایک لمحے کے لئے مجھ سے ٹکرائی پھر وہ لمحے جیسے نجد ہو گیا خرگوش یک ٹک میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ میرا دل چاہا کہ ہاتھ آگے بڑھا کر خرگوش کو چھو لوں میں نے اس غرض سے ہاتھ آگے بڑھایا تب میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب خرگوش بھاگنے کی بجائے وہیں ٹکا رہا میں نے مسرت کے عالم میں دو تین دفعہ اسے ہاتھ پھیر کر پیار کیا پھر وہ پھدکتا ہوا پتھر سے نیچے اترا ایک جگہ رک کر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر جنگل میں روپوش ہو گیا۔ میں عالم حیرانگی میں جاتے ہوئے خرگوش کے قدموں کے نشان ڈھونڈتا رہ گیا۔

میرے دل کو ایک دم سے قرار آ گیا تھا۔ میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا میں نے فیصلہ کر لیا تھا مجھے کل ہی یہاں سے واپسی کا رستہ اختیار کرنا تھا مجھے واپس اپنے وطن پاکستان پہنچنا تھا۔

رابع کے سامنے ہوتے ہوئے میرا یہاں رہنا محال تھا سو میں نے بھری محفل چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگر میں یہاں رہتا تو رابع کو دیکھتے دیکھتے اپنا آپ فنا کر لیتا مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اور غم سہ سکوں میں نے سوچ لیا تھا کہ واپس پاکستان جا کر کوئی اچھی جاب جو ان کر لوں گا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ واپسی کے بارے میں ابھی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کل صبح جب یہ لوگ آگے جنگل کی طرف پیش قدمی شروع کریں گے میں سب کے سامنے اعلان کر دوں گا کہ میں واپس جا ہوں ایک مناسب بہانا بھی میں نے اس کے لئے تراش لیا تھا مجھے واپس جانے سے کوئی نہیں رک سکتا تھا۔ میں اسی حالت میں پتھر پر بیٹھا تھا جب کسی نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ہیری کرس تھا اس کی چمکدار آنکھوں میں شفاف پانی تیز رہا تھا وہ برے پاس ہی پتھر پر بیٹھ گیا۔

”علی! سناؤ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ نہایت محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”م..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں ہیری کرس کی بے حد عزت کرتا تھا میں خوشدلی سے بولا۔

”رات تمہیں تیز بخار ہو گیا تھا۔“

”آپ کو کیسے معلوم پڑا.....؟“

”میں تمہارے سر ہانے ہی تو بیٹھا ہوا تھا۔“

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ ہیری چند لمحے بغور میری طرف دیکھتا رہا پھر میری بٹائی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”اصل میں، میں خیمے کے اندر اپنی کیپ لینے کے لئے آیا تھا تم دسے پڑے کروٹیں بدل رہے تھے میں نے تمہارے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ پسینے سے بھرا ہوا تھا

میں نے تمہاری پیشانی چھوئی تو وہ آگ کی طرح تپ رہی تھی۔ میں نے تم کو جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو تم بے خبر سوئے رہے پھر میں نے اپنے بیگ میں سے تمہیں میڈیسن نکال کر کھلائی تم نے وقت اپنی آنکھیں کھولیں تھیں..... کیا تمہیں یاد نہیں؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا اس شخص کی عزت میری نظر میں بہت بڑھ گئی تھی وہ میری بے خبری میں میری خدمت کرتا رہا تھا۔

”سر! دوائی کھلانے کا شکریہ.....“

وہ ہلکا سا مسکرایا اور اپنی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا ”اس میں شکریے والی کو سی بات ہے..... اچھا تم یہ بتاؤ.....“ وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”تم ابھی پتھر پر بیٹھے کر رہے تھے؟“

”میں نماز ادا کر رہا تھا.....“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا.....؟“

”میں عبادت کر رہا تھا.....“

”اوہ اچھا..... اپنے خدا کو یاد کر رہے تھے تم.....“

”جی ہاں.....“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”بڑا اچھا طریقہ ہے یہ..... عبادت کا..... پہلے تم نے پانی سے خود کو دھویا ہے پھر عبادت لئے پتھر پر کھڑے ہوئے ہو..... وٹ امیزنگ.....“ وہ ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا موضوع بدل کر بولا۔ ”تم جلد ف ہو جاؤ کل صبح ہی ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

میں صرف ہیری کو دیکھتا ہی رہ گیا مجھے تو صبح ہوتے ہی واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا۔

میں تھوڑی دیر بعد وہاں سے اٹھ آیا اور خیمے میں جا کر اپنا سامان سینے لگا لوگ دھیرے دھیرے اٹھ رہے تھے اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو رہے تھے۔ میں خیمے کے روزن سے ہی جھانک رہا تھا رابعہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی ایک طرف دھوپ میں کالج ٹور کی لڑکیاں آدوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ کالج ٹور کے لڑکے بندروں سے چھیڑ خانی کر رہے تھے بودی ایک طرف مغموم سا بیٹھا تھا۔

میں اپنا سارا سامان بیگ میں رکھ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ باہر کافی چہل پہل شروع ہو چکا تھا لوگ بیدار ہو گئے تھے کوئی لکڑیاں کاٹ رہا تھا تو کوئی ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ کوئی گھوڑے پر کھڑا

رہا تھا تو کوئی بیٹھا بندوقیں صاف کر رہا تھا۔ ہر ایک کے چہرے پے ایک جوش اور ولولہ کروٹیں لے رہا تھا۔

میں ست روی سے چلتا ہوا بودی کے پاس پہنچ گیا میں نے خوش دلی سے اس کے کندھے پے ہاتھ مارا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا وہ بڑا غمگین ہو رہا تھا میں اس کو خوش کرنے کے لئے بولا۔ ”بودی دوست! اکیلے بیٹھے کیا سوچ رہے ہو وہاں دیکھو تمہارے دوست کیا تماشے کر رہے ہیں۔“ میں بندروں کو چھیڑنے والے لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”میں تو خود تماشا بن گیا ہوں۔“

”ماپوسی کی باتیں نہیں کرتے۔“ میں اس کے کندھے پے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”علی بھائی! میگی کے بعد پتا نہیں کیوں زندگی زہری لگنے لگی ہے جینے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“

”تمہیں جینا ہے..... تمہیں میگی کے لئے جینا ہے سب لوگ یہاں ایک مشن کے لئے آئے ہیں کیہرے کے خوف کو دور کرنے کا مشن، میگی کا بھی یہی مشن تھا تمہیں یہ مشن پورا کرنا ہے تمہیں میگی کی روح کو خوش کرنا ہے تمہیں ابھی میگی کے قاتل کو سزا دینی ہے۔“ میں بہت دیر بیٹھا اس کا ذہن بناتا رہا۔

بودی آخر جوش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا اندرونی بھجان سے اس کا چہرہ تھمٹا اٹھا تھا وہ نہایت اٹل الفاظ میں بولا۔ ”آپ کی باتوں نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے میں میگی کا مشن پورا کروں گا میں اب ماپوسی کی باتیں نہیں کروں گا مجھے یقین ہے میگی کی روح ضرور خوش ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔“

”شاباش! بودی..... تم ایک سمجھدار اور بہادر آدمی ہو۔“ میں جانے سے پہلے یہاں سب کو خوش کر کے جانا چاہتا تھا میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے جانے کے بعد مجھے کوئی برے الفاظ میں یاد کرے اسی لئے میں بودی کے پاس چلا آیا تھا میں نے اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مگر میں اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ جانے سے پہلے میں اس میں اتنا حوصلہ بھر دینا چاہتا تھا کہ میرے بعد بھی وہ ڈمگنا نہ سکے۔ اس کے بعد رینا کا نمبر آتا تھا وہی رینا جو مجھے بھائیوں کی طرح چاہتی تھی اور جو مجھے اپنی گئی بہن صائمہ کی طرح دکھتی تھی اور جس سے میں وعدہ کر چکا تھا کہ میں اسے پاکستان ضرور لے کر جاؤں گا اس کو اپنا گھر ضرور دکھاؤں گا۔ اس کو مطمئن کرنا سب سے مشکل کام تھا میں بودی کے پاس سے اٹھ کر اس طرف بڑھ گیا جہاں کچھ پورنڈ لکڑیاں کاٹ رہے تھے راستے میں میرا ٹاکرا گوگی سے ہو گیا ہم دونوں آمنے سامنے سے ٹکراتے ہوئے بچے۔

گوگی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”خان صاحب! ذرا دیکھ کر چلا کریں۔ دفعہ نکر او بہت خوفناک ہو جاتا ہے۔“ میں سمجھا گوگی مذاق میں یہ بات کہہ رہا ہے جب میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ لال بھسکا ہو رہا تھا۔ میرا پارہ یکدم ساتویں آسمان کو چھونے لگا! یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں سے آج کچھ ہو جائے گا میں یہاں خون خرابہ نہیں چاہتا تھا۔ میرا یہاں سب کے دل میں اپنی محبت چھوڑ کے جانا چاہتا تھا میرے شکست خوردہ دل میں کسی کی ناراضگی مول لینے کی ہمت نہیں تھی۔

گوگی! کیا بات ہے..... تم کچھ اکھڑے اکھڑے لگ رہے ہو؟“ میں حتی الامکان اپنے غصے دباتے ہوئے بولا۔

”طبیعت تو مجھے تمہاری خراب دکھ رہی ہے۔ میگنی کے قتل کی تفتیش میں اپنی ٹانگ اڑانا چھوڑ جتنے تم ہوا ستنے ہی بن کے رہو یہ نہ ہو کہ یہاں ایک اور قتل ہو جائے۔“

میرا دماغ یکدم سنسنا اٹھا وہ ایک طرح سے میگنی کے قتل کا اعتراف کر رہا تھا وہ منظر یکدم میری نگاہوں میں گھوم گیا جب خیمے کے اندر میننگ کے دوران گوگی کا چہرہ زور پڑ گیا تھا وہ اسی وقت سے مجھے مشکوک لگ رہا تھا۔

”تو تم ایک اور قتل کرنا چاہتے ہو.....؟“ میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

”تمہی نے تو ابھی کہا ہے کہ یہ نہ ہو کہ یہاں ایک اور قتل ہو جائے اس کا مطلب ہے تم پر ایک قتل کر چکے ہو۔“

”اپنی بکواس بند کرو میں میگنی کا قاتل ہرگز نہیں۔ میں صرف تمہیں یہ باور کرا دینا چاہتا ہوں! تم اپنی تھانیداری یہیں بند کرو بصورت دیگر بڑے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔“ اس نے خوفناک لہجے میں یہ بات کہی اور آگے بڑھ گیا۔ میں پلٹ کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا میں نے اپنے ذہن کو جھکا دیا کی طرف بڑھ گیا وہ ایک پتھر سے ٹیک لگائے کیونکس لگا رہی تھی۔ میں اس کے برابر میں بیٹھ کر مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک دلنواز مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے اپنے پیر سمیٹ لئے سیدی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”ایلی بھائی! کیا بات ہے آج آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں دکھ رہی۔ رات آپ نظر نہیں آئے۔“

”میں ٹھیک ہوں..... رات کو تھوڑا بخار ہو گیا تھا مگر اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ میں

زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

”آپ کہہ رہے ہیں میں ٹھیک ہوں مگر مجھے کچھ اور دکھ رہا ہے۔“ وہ میرا چہرہ اپنی طرف کر کے منہ مڑی بولی۔

”تمہیں کیا دکھ رہا ہے؟“

”یہی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“

”آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے؟“

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟“ ایک دم میرا دل بھرا آیا تھا اور آواز بھرا گئی تھی۔

رینا کو بیٹھے بٹھائے پتا نہیں کیا ہوا اس نے زور سے چیخ ماری اور مجھ سے چٹ گئی میں اس کی حرکت سے گڑبڑا کر رہ گیا وہ خوشی سے چیختے بولی۔ ”ایلی بھائی! میں نے رات کو ایک خواب دیکھا جج اتنا اچھا خواب تھا۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے گالوں پر جما کر بولی۔

”کیا تھا اس خواب میں؟“

”میں نے دیکھا آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ اپنے ملک پاکستان میں ہیں آپ کے پیارے پیارے دو بچے بھی ہیں آپ کی بیوی بے حد خوبصورت ہے۔“

کرب کی ایک طویل لہر اٹھی اور سینے کو چیرتی ہوئی گزر گئی آنکھوں میں ریت کے ذرے سے چھپنے لگے۔ میں بھرائی آواز میں بولا۔ ”رینا بہن! اکثر خواب الٹ ہوتے ہیں انسان دیکھتا کچھ ہے تعبیر کچھ پاتا ہے۔“

”مگر میرے خواب ہمیشہ سچ ثابت ہوتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”ضروری نہیں ہر خواب سچ ہی ہو.....“ میں دور درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”رینا تم نے کہا تھا کہ میں پاکستان دیکھنا چاہتی ہوں تو چلو میرے ساتھ صبح ہی ادھر سے نکل جاتے ہیں۔“

”وٹ امیزنگ! کیا بات ہے کل صبح ناں.....“

”ہاں کل صبح میں یہاں سے جا رہا ہوں۔“ میں نے اس انداز سے یہ بات کہی کہ رینا کو یہ سب مذاق لگے۔

”اچھا تو آپ تیاری پکڑ چکے ہیں۔“ وہ بھی مذاق کے موڈ میں آ گئی۔

”ہاں رینا! شکار کھیلے کھیتے تھک گیا ہوں..... شکار ہاتھ ہی نہیں آتا۔“

”تو اس کا مطلب ہے ہار مان لی نہ آپ نے۔“ وہ ایک تہقہہ لگا کر بولی وہ سب کچھ مذاق کچ رہی تھی مگر وہ کتنی ناسمجھ تھی۔

”ہاں ریٹا! میں نے ہار مان لی ہے۔“ میں دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

”ہارے ہوئے انسان کی کوئی زندگی نہیں ہوتی آپ نے کل جانا ہے نا۔ تو ایسا کریں آزا ہی چلے جائیں بے عزتی سے بچ جائیں گے۔“ وہ تہقہہ لگانے لگی میں بھی اس کا ساتھ دینے لگا بیٹے ہنسنے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ کتنی متضاد کیفیت تھی یہ میں مسکرا رہا تھا مگر میری آنکھوں میں دکھ بھرے آنسو تھے۔ ریٹا نے بیٹھے بیٹھے میرے کندھے پر سر رکھ دیا تھا میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے الوداعی پیار کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

شام کا جھٹ پٹا ہر طرف پھیل چکا تھا کچھ لوگ خیموں میں سستارے تھے جبکہ کچھ پورٹرز شکار کیا ہوا جانور پکانے میں مصروف تھے۔ شاہنواز ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا وہ گھوڑے سے اتر کر سیدھا خیمے میں چلا گیا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا میں خیمے میں پہنچا تو شاہنواز وہاں سر تھام کے بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر شاہنواز ٹھٹکا گیا۔ ”علی نواز! تم۔۔۔۔۔“

”ہاں یار۔۔۔۔۔ تمہارا دوست علی نواز خان۔“ میں اپنا مسخرہ اڑاتے ہوئے بولا۔

”میٹھو ناں۔“ اس نے میرے لئے جگہ بنائی میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا مجھے اس شخص کی قسمت پر رشک آ رہا تھا رابعہ جیسی لڑکی اس پر جی جان سے فدا تھی۔

”شاہنواز! مجھے ایک بہت ضروری بات تم سے کرنا ہے۔“

”ہاں تو بولو بھئی۔ یہ تمہید باندھنے کی عادت تمہیں کب سے ہو گئی؟“

”شاہنواز! رابعہ تم سے بے حد پیار کرتی ہے۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے اور کچھ کہنے سے پہلے یہ یاد رکھنا وہ تمہارے بنا مر جائے گی۔ بہت حساس لڑکی ہے وہ۔۔۔۔۔ شیشے سے بھی نازک دل ہے اس لڑکی کا۔۔۔۔۔ اس کا دل مت توڑنا وہ تمہارے خود سے بڑھ کر چاہتی ہے۔۔۔۔۔ میں مجبور تو نہیں کر سکتا مگر ایک درخواست کر سکتا ہوں اس کو ٹھکرا مت۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا شاہنواز کے چہرے سے ہیجان کے آثار تھے۔ میں جب مطمئن ہو گیا کہ میں نے اپنی بات پوری طرح شاہنواز تک پہنچا دی ہے تو میں نے جلدی جلدی گوگی کے بارے میں

بھی شاہنواز کو سب بتا دیا۔ گوگی کے بارے میں سن کر شاہنواز کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں وہ گوگی کو چالیاں دینے لگا تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ گوگی کو نہیں چھوڑے گا۔ ریٹا کے بارے میں بھی میں نے مختصر شاہنواز کو بتایا اور وہاں سے اٹھ آیا ایک بہت بڑے پہاڑ کا بوجھ میرے سر سے اتر گیا تھا میں ست قدموں سے چلا جا رہا تھا جب انکل مدثر مجھے سامنے سے مل گئے میں بھی ان سے ملنا چاہ رہا تھا انہوں نے مجھے کسی مقصد کے تحت یہاں بلوایا تھا اور اب میں انہیں بتائے بغیر یہاں سے جا رہا تھا انکل مجھے جلدی میں دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر میرا کندھا تھپتھپایا اور بولے۔ ”علی بیٹا! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے اب تو میں جلدی میں ہوں کل آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں چمکتا ہوا پانی اٹھ آیا تھا میں خود میں مسکرا کر رہ گیا میں کل یہاں ہوتا تو ان کی بات سنتا ناں۔

اس وقت سب لوگ الاؤ کے گرد سے اٹھ کر اپنے اپنے خیموں میں سونے کے لئے جا رہے تھے جب میں نے الوداعی نظروں سے رابعہ کی طرف دیکھا وہ ایک کالج کی لڑکی کو سہارا دے کر خیمے میں لے جا رہی تھی یہ شاید وہی لڑکی تھی جس پر آدم خورشیر نے اس وقت حملہ کیا تھا جب کالج لڑ اور دوسرے لوگ واپس بیٹیں کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ لڑکی رابعہ پر لہدی جا رہی تھی رابعہ نے اس کا بوجھ سہارا رکھا تھا میں جانی ہوئی رابعہ کو نمناک آنکھوں سے دیکھ رہا تھا یہ بہاریں مجھ سے جدا ہوئی جا رہی تھیں یہ نظارے ہمیشہ کے لئے مجھ سے خفا ہوئے جا رہے تھے۔ میں منتظر تھا کہ رابعہ مڑ کر ایک دفعہ میری طرف دیکھے مگر ایسا نہیں ہوا دکھ کی ایک لمبی لکیر میرے اور رابعہ کے درمیان کھینچ گئی پھر اسی لکیر کو گلے لگا کر ساری رات کئی پھر صبح صادق اسی لکیر کی ہمر کاہی میں، میں واپسی کے سفر پر چل پڑا۔ کئی دفعہ میری آنکھیں بھیگیں کئی دفعہ میری آنکھوں میں دھند چھائی۔ حسرتیں گولہ بن کے میرے حلق میں انک کر رہ گئی تھیں میں نے بھیگی آنکھوں سے آخری دفعہ دور سے رابعہ کے خیمے کو دیکھا اور گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ رات کے چھائے بادل برس پڑے تھے بالکل میری آنکھوں کی طرح۔ گھوڑا دکلی چال چلا آگے بڑھ رہا تھا میں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر برساتی لباس پہن لیا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔ رائفل میرے کندھے سے لٹک رہی تھی پانچ فٹ لمبے بانس کے آگے لگی برچھی میرے ہاتھ میں تھی میں جنگلی جانوروں سے بچتا بچتا میں کیمپ کی طرف گامزن تھا میری آنکھوں میں لٹی محفلوں کی دھول اڑ رہی تھی ماں کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ میں اپنی ماں کی طرف لوٹ رہا تھا جس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ ایک سال میں اس کی بہو کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ میں ایسا نہ کر سکا تھا میں خالی ہاتھ واپس

لوٹ رہا تھا اور بڑی جلدی لوٹ رہا تھا لگتا تھا کہ ایک دم ہی سب کچھ ہار گیا ہوں۔ مجھے چلتے چلتے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا جب بارش تیز ہو گئی مجھے سفر کرنے میں دشواری پیش آنے لگی مجھے گھنے درختوں کے پتوں بیچ ایک پہاڑی کھوہ نظر آئی تو میں نے گھوڑے کو ایک درخت کے ساتھ باندھا اور جلدی سے کھوہ میں داخل ہو گیا آسمان سے پانی تابڑ توڑ برس رہا تھا بارش کے تیور بڑے خطرناک دکھ رہے تھے۔ میر نے نارنج روشن کر کے ساری کھوہ کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی جنگلی جانور تو وہاں چھپا نہیں بیٹھا؟ کھوہ خالی پڑی تھی میں بے دم سا پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا چہرہ بارش کے پانی اور آنسوؤں سے بھگا ہوا تھا۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرتا رہا بارش نہیں رکی۔ بیٹھے بیٹھائے اس حالت میں جانے کب مجھے نیند آگئی دوبارہ آنکھ کھلی تو بے طرح میرا دل دھڑک رہا تھا میں خواب میں رابعہ کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ یہ رومانوی خواب بھی عجیب ہوتے ہیں حقیقت سے بڑھ کر انسان کو ستاتے ہیں۔ رابعہ کی محبت کا زخم ایک بار پھر سے خون اگلنے لگا تھا میں کچھ سوچ کر بڑی تیزی سے کھوہ سے باہر نکل آیا۔ مبادا رابعہ کی محبت پھر سے مجھے کمزور نہ کر دے اور میں دوبارہ رابعہ کی طرف پلٹ جاؤں۔ بارڈ بوند باندی کی صورت جاری تھی میں نے اسی حالت میں سفر جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا اور چھلانگ لگا کر پھر سے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا ابھی دس قدم کی دوری پر پہنچا تھا تو مجھے اپنے عقب سے کچھ شوشائی دیا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت سے گھوڑے میری طرف لپکے آ رہے ہیں میں نے تیزی سے رائفل کندھے سے اتار لی۔ دفعتاً درختوں کی اوٹ سے جو گھوڑا برآمد ہوا اس پر ہیری کرس سوار تھا اس کے پیچھے تین اور گھوڑے تھے جن پر جم کینٹی کے بندے سوار تھے ہیری کرس بے حد پریشان دکھ رہا اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال پوچھتا ہیری بولا۔ ”علی! رابعہ تمہارے ساتھ آئی ہے؟“

”نہیں تو۔“ میں نے تیزی سے کہا اور پھر بولا۔ ”کیا ہوا رابعہ کو۔۔۔۔۔“

”رابعہ صبح سے غائب ہے سب لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہیں ہم لوگوں کا خیال تھا وہ تمہارا ساتھ کہیں نکلی ہوگی مگر تم کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔“ ہیری نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر بولا۔ ”اتنے خراب موسم میں وہ لڑکی کدھر گئی۔۔۔۔۔؟“

زمین آسمان میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ ایک چھناکے سے جیسے کوئی چیز میرے اندر ٹوٹ گئی۔ ایک چیخ میرے وجود میں گونجی۔ ”علی نواز! تمہاری رابعہ اب اس دنیا میں نہیں رہی اب تم کبھی اس کی شکل نہ دیکھ سکو گے۔“

میرے دماغ میں سیاہ مہیب دھند چھا گئی میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم

نے کب گھوڑے کی باگیں موڑیں اور کب آندھی طوفان کی طرح گھوڑا دوڑاتا واپس کیسپ کی طرف پلٹا۔ میں نے یہ خطرناک رستہ صرف بیس منٹ میں طے کیا پیچھے جم کینٹی کے کسی ساتھی نے مجھے آواز دی تھی یا شاید ہیری نے مجھے پکارا تھا مگر میں جیسے سب سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میں کیسپ تک پہنچا تو میری پہلی نظر انکل مڈر پر پڑی جو سر تھاے بیٹھے تھے پھر میری نظر گوگی سے ٹکرائی۔ میرے تن بدن میں سینکڑوں چنگاریاں ایک ساتھ پھوٹ پڑیں۔ ایک دہکتا ہوا لاد تھا جو بیچ سینے سے پھوٹ پڑا تھا۔ گوگی کڑکٹی آواز میں بولا۔ ”حرامی! بتا رابعہ کدھر ہے؟“ اس کا اتنا کہنا ہی اس کے لئے قیامت بن گیا۔ میں گھوڑا چلا کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میرا لٹے ہاتھ کا طوفانی تھپڑ اس کے گال پر پڑا وہ پلٹ کر پتھریلی زمین پر گرا۔ میں چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا گوگی تیزی سے اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا دایاں پنج میں نے چلتے ہوئے جھکائی دیکر بچایا اور میرے سر کی بھرپور ٹکرائی اس کے چہرے کو لہو لہان کر گئی۔ وہ بھی ایک کایاں تھا ممبئی کا نامی گرامی غنڈہ وہ چکا تھا وہ لہو لہان چہرے سمیت پلٹ کر مجھ پر پھر سے حملہ آور ہوا۔ اس نے جھک کر میرا وار بچایا اور سینے کے نیچے مجھے دونوں بازوؤں سے جکڑ کر مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنی جھونک میں آگے نکلتا چلا گیا۔ اس کی پکڑ میں بڑی سختی تھی۔ اس نے میری پشت ایک پتھر کے ساتھ جا کر لگا دی۔ اس نے کوئی دوسرا دوا آزمائے کے لئے ہاتھوں کی گرفت میری کمر پے ڈھیلی کی ہی تھی کہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بڑی سرعت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اور اسے خود پر سے اچھال دیا۔ وہ اس طوفانی حملے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ وہ ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا پتھر کے ساتھ ٹکرایا اور سر کے بل نیچے آ رہا۔ میرا خیال تھا گوگی اب نہیں اٹھ سکے گا مگر وہ پہلے سے زیادہ بھرپور انداز میں اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں بھی اس کی ہٹ دھرمی پر کھول کے رہ گیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے اپنا مخصوص کھیل کھیلنا پڑے گا۔ گوگی جتنا نظر آتا تھا اس سے کہیں زیادہ خطرناک بندہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے مخصوص انداز میں گوگی پر حملہ آور ہوتا ایک اونچے نیلے سے گھوڑے کی ہنہانے کی آواز آئی اور ایک عجیب منظر میری آنکھوں نے دیکھا۔ رابعہ آدھی گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی آدھی نیچے لٹک رہی تھی۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ گوگی نے بھی یہ منظر دیکھ کر اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ میں تیزی سے رابعہ کی طرف بڑھا تھا۔ رابعہ چیخ و پکار کر رہی تھی اور مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سب لوگ خیموں سے باہر آ گئے تھے میں نے شاہنواز کو بھی گھوڑے پر خیموں کی طرف آتے دیکھا تھا۔ میں حتی الامکان تیزی سے رابعہ کی طرف بڑھا اور میرے وہاں پہنچنے سے پہلے رابعہ گھوڑے سے نیچے گر گئی

اور ڈھلوان پر لڑھکے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر رابعہ کو بازوؤں میں تھام لیا۔ اس کا خوبصورت اور شفاف چہرہ کئی جگہ مٹی لگنے کی وجہ سے داغدار ہو رہا تھا۔ اس کے آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ ”وہ وہ آ رہے ہیں.....“ میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ ”کون آ رہے..... ہیں؟“ تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو.....؟“ رابعہ میرے سوال جواب نہیں دے سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ اس دوران انکل مدثر جم کئی، شاہنواز میرے پاس پہنچ چکے تھے۔ کالے بادلوں نے ایک دم ہی رات کا سماں باندھ دیا تھا۔ مجھے آج بھی وہ منظر اچھی طرح یاد۔ وہ سب ایک خواب ہی کی مانند تھا ایک زمین ہلنے لگی۔ سب ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھ لگے۔ ٹیلوں سے پرلی طرف درختوں میں جیسے بھونچال آگیا تھا۔ کالج کی لڑکیوں کی چیخ و پکار نے منظر کو اور زیادہ دہشت ناک بنا دیا تھا۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں جنگلی لوگ تھے جو ہاتھوں میں نیز۔ تو لے کسی تند سیلابی ریلے کی طرح بہتے چلے آ رہے تھے۔

میری آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ میں نے رابعہ کو بازوؤں میں اٹھالیا اور تیزاً سے وہ جگہ چھوڑ دی۔ ابھی چند لمحوں میں بتائیں یہاں کیا ہونے والا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے لوگوں میں ہیری کو دیکھا۔ وہ مسلسل پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ ”اپنا اسلحہ ہاتھ میں لے لو اور درختوں کی اٹ میں ہو جاؤ۔“ پورے گروپ میں ایک دم ہی چیخ و پکار مچ گئی تھی۔ پھر میں نے بھاگتے ہوئے ایک بوڑھے شکاری کو اپنے سامنے گرتے دیکھا اس کی گردن پر پچھلی طرف سے تیر لگا اور وہ اوندھے منہ جنگلی گھاس پر گر گیا اس نے تڑپنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک کالج گرل کی ران پر تیر لگا تھا اور نیچے گری ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ یکا یک بجلی چمکی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایک طرف جنگلیوں کی ناقابل فہم خوفناک آوازیں گونج رہی تھیں وہ خونخوار انداز میں آگے بڑھتے ہی چلے آ رہے تھے ان کے سونکھے اور سیاہ جسموں میں بلا کی پھرتی اور تیزی تھی۔ ان کے لکارے ابھر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں نیزوں کی انیاں چمک رہی تھیں۔ دوسری طرف ہمارے گروپ میں شور محشر برپا تھا۔ زخمیوں کی کراہیں کلیجہ لرز رہی تھیں پھر ان سب آوازوں کے درمیان ایک اور آواز گونجی وہ بارہ بور کی پرہیز آواز تھی۔ گولی چلانے والا شاہنواز تھا میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جنگلی کے جسم کے چیتھڑے اڑتے ہوئے دیکھے۔ پھر اس کے بعد تین اور دھاکے گونجے اور تین جنگلی ڈھیر ہو گئے۔ جنگلیوں کی بوہتی ہوئی یلغار ایک دم سے ست پڑ گئی۔ وہ جنگلی جوندوں کی طرح آگے بڑھتے ہی چلے آ رہے تھے ایک دم سے رک گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے

اپنے مرنے والے ساتھیوں کو دیکھنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے جنگلی خوف سے واپس پلٹ جائیں گے۔ میں سب ایک درخت کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔ رابعہ میرے پہلو میں پڑی تھی اس کا عارض میرے گلخنے کو چھو رہا تھا۔ اس کے دراز ریشمی بال مور پنکھ کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

میرا ادھیان رابعہ سے ہٹ کر جنگلیوں کی طرف گیا تو میں دنگ رہ گیا۔ جنگلی خوف سے بھاگنے کی بجائے بے پناہ طیش کے عالم میں آگے بڑھنے لگے۔ ایک لمبوتر اس کا لاجنگی جو شاید ان کا سردار معلوم ہوتا تھا اونچی آواز میں دھاڑا۔ ”آگے بڑھو..... اور مار ڈالو..... ان سب کو.....“ سردار جنگلی زبان میں بولا تھا۔ جنگلی زبان کا کافی حد تک مجھے آتی تھی۔ بہت سے ایسے لفظ بھی تھے جو میرے پلے نہیں پڑتے تھے..... مگر میں انداز اور بیان سے سمجھ لیا کرتا تھا۔ شاید اس بات کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ میں پچھلے سال جب یہاں آیا تھا تو بہت سے علاقے گھوم کر گیا تھا بہت سی زبانیں بھی مجھے آ گئیں تھیں جن میں یہ زبان بھی تھی۔ سردار نے جب وحشیانہ انداز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیں تو جنگلی پہلے سے بھی زیادہ خوفناک انداز میں ہم لوگوں پر پل پڑے۔ حالات کی سنگینی کا مجھے احساس ہو رہا تھا۔ راتفل صرف شاہنواز کے پاس موجود تھی باقی سب نیتے تھے میں جس جگہ چھپا بیٹھا تھا اگر تھوڑی سی ہمت کرتا تو خیمے تک پہنچ سکتا تھا خیمے میں تین چار روپیہ لکڑی کی پٹنی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی تین راتفلیں اور نو ماڈر روہاں پڑے تھے جو کچھ بھی کرنا تھا مجھے بہت جلدی میں کرنا تھا بارش تابڑ توڑ برس رہی تھی۔ میں نے رابعہ کو آہستہ سے درخت کے تنے کی اوٹ میں اس طرح سے چھپایا کہ وہ بالکل محفوظ رہے۔ رابعہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تقریباً بھاگتا ہوا خیموں کی طرف بڑھا۔ جنگلیوں کی طرف سے تیر اندازی شروع ہو چکی تھی۔ خیمہ جب تقریباً مجھ سے نو دس فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے ہوا میں جست کی اور خیمے کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ خیمے کی پچھلی طرف ایک روزن تھا جسے پھاڑ کر اندر داخل ہوا جاسکتا تھا میں ابھی اسے پھاڑنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سنسانا ہوا تیر مجھ سے صرف ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر خیمے کے کپڑے میں آکر گھس گیا میں نے حواس باختہ ہونے کی بجائے تیر کو ہاتھ میں پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچنا خیمے کا کپڑا پھٹتا چلا گیا میں کرا لنگ کرتا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ اب مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں بیڑہ میں لکڑی کی پٹنی کھولوں اور وہ خالی پڑی ہو۔ میں نے لیٹے لیٹے دھڑکتے دل کے ساتھ لکڑی کی لمبوتری پٹنی کھولی اور دیکھے بغیر اس کے اندر ہاتھ ڈال کر اسلحے کا اندازہ کرنے لگا۔ میرے ہاتھ کے پور کی آہنی لمس کے لئے ترس رہے تھے مگر میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا پٹنی بالکل خالی پڑی

تھی رو پیٹر تو کیا اس میں ایک ماؤز بھی نہیں تھا۔ حسرت میری آنکھوں میں مجسم ہو کر رہ گئی۔  
میں نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور ریگلتا ہوا خیمے کی پچھلی طرف سے باہر نکل گیا۔  
دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا ہر طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ مجھے ایک ہتھیار کی  
شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ہتھیار جو حیوان نما انسانوں کا راستہ روکنے کیلئے معاون ثابت  
ہو سکتا تھا۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ایک ہیولہ سا آکر مجھ سے لپٹ گیا وہ ایک جنگلی تھا اس۔  
اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کی مدد سے مجھے کسی آنکھوں کی طرح سے جکڑ لیا۔ یہ میرے فوری حرکت  
آنے کا وقت تھا۔ تیروں کی بارش میں ایک ایک منٹ نہایت قیمتی تھا کسی وقت کوئی تیر بھی پیغام  
لے کر پہنچ سکتا تھا۔ میں نے کہنی کی بھر پور ضرب حملہ آور کے پیٹ میں لگائی جو نبی اس کی گرفت ڈیم  
پڑی میں نے اسے خود سے گھما کر نیچے پھینک دیا اسی دوران ایک جنگلی ہاتھ میں نیزہ تولے مجھ پر  
آور ہوا میں نے لیٹے لیٹے اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے ٹانگ گھمائی۔ ٹانگ کی ضرب سے  
آور اچھل کر پشت کے بل نیچے گرا میرے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے  
جگہ سے حرکت کی اور ایک سیکنڈ میں اس کے سینے بے سوار ہو گیا میرا بائیں ہاتھ حرکت میں آیا اور ایک  
لمحے میں میرا ڈیڑھ فٹ لمبا خنجر جنگلی کے سینے سے پار ہو گیا۔ ابھی میں ادھر سے فارغ بھی نہ ہوں  
تھا کہ پہلے والا جنگلی جسے میں نیچے پھینک چکا تھا نیلے کی دوسری طرف سے برآمد ہو چکا تھا۔ اس  
پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا میں نے ہلاک شدہ جنگلی کا گرا ہوا نیزہ اٹھایا اور پوری قوت سے جنگلی کو  
مارا نیزہ جنگلی کے پیٹ سے آ رہا تھا تو میں طوفانی رفتار سے بھاگتا ہوا درختوں میں روپوش ہو گیا  
بارش کے تیور بڑے خطرناک دکھ رہے تھے۔ رہ رہ کے بجلی تڑپتی تھی اور قرب و جوار روشن ہو جا  
تھے۔ اسی روشنی میں میں نے ایک منظر دیکھا تھا اور میرا دل انجانی خوشی سے بھر گیا تھا۔ بووی۔  
کندھے پر رائفلیں لا کر رکھی تھیں اور وہ درختوں کے پیچھے چھپے اپنے ساتھیوں میں بانٹ رہا تھا  
درختوں کی اوٹ لیتا ہوا بووی کی طرف بھاگا ابھی میں چند قدم ہی دوڑا تھا کہ ایک رسی میری گرد  
کے گرد حائل ہو گئی۔ زمین و آسمان میری نگاہوں میں گھوم کر رہ گئے وہ ایک جنگلی تھا جس نے درخت  
بیٹھے بیٹھے رسی میری گردن کے گرد حائل کرتے ہوئے مجھے اوپر کھینچ لیا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی  
بہت ذہنی سل میرے سینے کے مقام پر رکھ دی۔ سانس نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا تھا۔ مجھے بول  
محسوس ہونے لگا جیسے فرشتہ اجل مجھے لینے کے لئے پہنچ گیا ہے میں زمین سے چار فٹ اوپر ہوا  
معلق تھا۔

میں تڑپ رہا تھا اور میری ٹانگیں آگے پیچھے کو جھول رہی تھیں۔ بجلی چمکی اور ہر طرف روشنی ہی  
روشنی ہو گئی۔ بارش کا طوفانی پانی جنگل کی زمین پر کئی ندیوں کی صورت بہہ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا یہ  
میری زندگی کا آخری منظر ہے مگر پھر یکا یک بازی پلٹ گئی مہلت مل گئی۔ نامعلوم طرف سے چلنے والی  
گولی نے میری جان کے دشمن جنگلی کو جنگلی کی مصیبتوں سے آزاد کر دیا تھا۔ میں نیچے گرا تو ہوا فرائے  
بھرتی ہوئی میرے سینے میں داخل ہونے لگی۔ سام سام میں جیسے زندگی جاگ اٹھی حواس بحال  
ہوئے تو میں ریگلتے ریگلتے بووی کی طرف بڑھنے لگا اس دوران تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔  
موت کے دھانے کھل گئے تھے۔ موت بارود کی صورت جنگلیوں کے درمیان رقص کرنے لگی تھی۔  
فائرنگ اتنی شدید اور مسلسل تھی کہ چند لمحوں میں ہی جنگلیوں کے حوصلے جواب دے گئے اور وہ اپنے  
مرنے والے ساتھیوں کو چھوڑ کر واپس پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔ دس منٹ بعد وہاں ایک زندہ جنگلی بھی  
موجود نہیں تھا۔

بارش مسلسل زوروں پر تھی جم کینٹی اور ہیری کرس کے حکم پر ہنگامی بنیادوں پر کام شروع ہو گیا  
زخیوں کو اٹھا اٹھا کر خیموں میں لایا جانے لگا۔ ہمارے دو بندے مرے تھے اور دس کے قریب زخمی  
ہوئے تھے۔ مرنے والوں میں ایک بوڑھا شکاری اور ایک مقامی پورٹر شامل تھا زخیوں میں ایک تاجر  
کی حالت بڑی تشویش ناک تھی اس کی ناف سے بائیں طرف ایک تیر لگا تھا اور پار نکل گیا تھا۔ تیر  
نکل لیا گیا تھا مگر زخم گہرا تھا جس سے مسلسل خون بہہ جا رہا تھا جس لڑکی کی ران پر نیزہ لگا تھا وہ پٹی  
کرانے کے بعد خواب آور گولیوں کے زیر اثر سو گئی تھی۔

ایک طرف زخیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی تو دوسری طرف جم کینٹی، ہیری کرس، قطب الدین،  
نگل مشر کھڑے محو گفتگو تھے میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ غور اس بات پر کیا جا رہا تھا کہ جنگلیوں  
نے ایسا خوفناک حملہ کیوں کر کیا؟ رابعہ کی گمشدگی کیا تھی.....؟ اس کی واپسی اور اس کے پیچھے جنگلیوں  
کی فوج کشی اس میں کیا اسرار تھا؟ رابعہ ابھی تک بے ہوش تھی اس کے ہوش میں آنے سے پہلے کچھ  
نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاہنواز گوگی اور چار بندے اسلحہ سے لیس ہو کر خیموں کے چاروں طرف پہرہ  
سے رہے تھے۔ ان کو یہ آرڈر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کے شک کی صورت میں بے دریغ فائرنگ کر دی  
جائے۔

میں ایک خیمے میں داخل ہوا تو وہاں زخیوں کی چیخ و پکار بلند ہو رہی تھی۔ میں فردا فردا ایک  
ایک کا چہرہ دیکھنے لگا مگر مجھے رینا کہیں نظر نہیں آئی۔



”احسان کیسا انکل.....“ میں مروت سے بولا۔  
 ”بیٹے! یہ تمہارا اس بوڑھے شخص پر احسان ہی ہے، تمہیں نہیں معلوم مگر میں نے تم سے ایک جھوٹ بولا ہے اور اسی جھوٹ کی میں آج تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“  
 ”انکل! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“  
 ”نہیں بیٹا! اپنا دل ہلکا کر رہا ہوں۔ جب ندامت کا بوجھ بہت بڑھ جائے تو سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔“

”انکل! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا.....؟“  
 ”بیٹے میں نے تمہیں جھوٹ بول کے پاکستان سے بلایا تھا جبکہ تمہیں یہاں بلانے کے پیچھے کوئی اور مقصد کارفرما تھا۔“

مجھے جہاں تک یاد پڑتا تھا انکل نے مجھے اس لئے بلایا تھا کہ میں یہاں ایک ایسی ٹیم تشکیل دوں جو مارشل آرٹ کی زبردست ماہر ہو۔ انکل اس ٹیم کو ایک مشن پر بھیجنا چاہتے تھے اس مشن کا مقصد کیمبرو کے جنگل پر پھیلے خوف کو دور کرنا تھا اور ایک سال پہلے وہاں پر اسرار طور پر قتل ہونے والوں کے قاتلوں کو ڈھونڈنا تھا۔ قتل ہونے والوں میں انکل کا دیرینہ دوست بھی شامل تھا مگر جو کچھ انکل نے کہا تھا ایسا کچھ نہیں ہوا تھا نہ میں نے کسی کو ٹریڈنگ دی تھی نہ ہی کوئی کمائو ٹیم تشکیل دی تھی۔ بس یہاں آنے کے دو دن بعد میں اس سارے گروپ کے ساتھ کیمبرو کے جنگل میں آ نکلا تھا۔

اب انکل نے جو بات کی تھی اس نے میرے کافی عرصے سے سوئے ہوئے تجسس کو ہوا دے دی تھی اور میں فوراً بول اٹھا تھا۔ ”انکل! مجھے یہاں بلانے کے پیچھے اور کون سا مقصد چھپا ہوا تھا جس کے بارے میں آپ نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔“

میرے سوال پر انکل کافی دیر خاموش رہے۔ یوں لگتا تھا وہ نہیں بول سکیں گے..... مگر پھر جیسے انکل کی آواز کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔ ”بیٹے! رابعہ میری بیٹی ہی نہیں..... وہ میرا سب کچھ ہے۔ بچپن میں ہی اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ رابعہ کو میں نے ماں بن کر پالا ہے۔ باپ بن کر اس کے لاڈ دیکھے ہیں اس کے رونے پر رویا ہوں اس کے ہنسنے پر ہنسا ہوں۔ بیٹا تم سوچ بھی نہیں سکتے میں کس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ میری جان ہر وقت اس میں انکی رہتی ہے۔“ انکل اپنا فقرہ مکمل کر کے خاموش ہو گئے۔ آنسو قطار در قطار ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ انہوں نے پیار بھری ایک نگاہ سے دوسری طرف پر لپٹی رابعہ کی طرف دیکھا اور گھمبیر آواز میں بولے۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اس وقت دیکھا تھا جب بووی را نقلیں تقسیم کر رہا تھا رینا دوڑ ہوئی ایک طرف کو بھاگی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے بے بلا کا خوف اور پریشانی مثبت تھی پریشانی تو اس وقت ہر ایک کے چہرے پر تھی مگر وہ خوف اور پریشانی کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے ہر جہان ماری مگر رینا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرے دل میں بے نام اندیشے سر ابھارنے لگے۔ مر والے پانچ جنگلیوں کی لاشیں ایک گڑھا کھود کر اس میں دفن کر دی گئی تھیں۔ بارش کی رفتار میں کمی آئی تھی مگر وہ ابھی تک برقرار تھی۔ میں بارش میں بھیگتا ہوا آس پاس کا سارا علاقہ چھاننے لگا۔ آد گھنٹے کی ناکام کوشش کے بعد میں خیمے میں واپس آ گیا۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ رینا کی گمشدہ نے مجھے غمگین کر دیا تھا۔ وہ یہاں کہیں نہیں تھی تو پھر کدھر گئی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جو پریشان کئے دے تھا۔ پورے گروپ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اس افراتفری میں کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ میر خیال سے ابھی کسی کو رینا کی گمشدگی کے بارے میں علم نہیں ہوا تھا۔ میں ایک دم یہ سنسنی خبر سنا کے کہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لئے اپنے طور پر میں رینا کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا میں۔ ٹیلوں کے پار اور درختوں کے تنوں کے پیچھے ہر جگہ رینا کو ڈھونڈا تھا کہ مبادا وہ زخمی حالت میں کچا ہماری مدد کی منتظر ہو مگر ہر جگہ مجھے ناکامی ہوئی تھی۔ رینا یہاں موجود نہیں تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں ٹہلتا ہوا رابعہ والے خیمے میں داخل ہو گیا۔ رابعہ ہنوز بے ہوش تھی۔ انکل مدثر اور ہیری کرس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انکل مدثر کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی انکل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آؤ بیٹے کیسے ہو؟“ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔

”جی انکل! میں ٹھیک ہوں۔ رابعہ کو ابھی ہوش نہیں آیا.....؟“ میں سوالیہ لہجے میں بولا۔  
 ”ڈاکٹر اسمتھ کہہ کر گیا ہے کہ آدھے گھنٹے تک رابعہ کو ہوش آجائے گا.....“ ڈاکٹر اسمتھ ڈاکٹر کے ساتھ سیاحت کا بھی بے حد شوقین تھا۔ اس لئے کالج ٹرپ کے ساتھ یہاں چلا آیا تھا انکل نے لیتے ہوئے خیمے کے ایک کونے میں جا بیٹھے ان کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر دھیمے اور کمزور لہجے میں بولے۔ ”علی بیٹا! تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں ہمیشہ اپنے بیٹوں کی طرح چاہا ہے۔“

”انکل اس میں بھلا کیا شک ہے.....“ میں خوشدلی سے بولا۔  
 ”جیتے رہو بیٹا..... جیتے رہو.....“ وہ میری پیٹھ تھپکنے لگے۔  
 ”بیٹا! میں نے تمہیں اتنی دور سے یہاں بلایا اور تم چلے آئے..... یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔“

”بیٹا! رابعہ نے آج تک جس چیز کی ضد مجھ سے کی ہے وہ میں نے اسے لا کر دی ہے۔  
نے کسی بھی بات پر آج تک نہ اسے ڈانٹا ہے نہ مارا ہے۔ بچپن میں جس چیز کی طرف وہ انگلی کر  
کرتی تھی وہ میں لا کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا کرتا تھا۔ بیٹا..... آج بھی رابعہ نے اپنی  
ایک طرف اٹھائی ہے مگر آج وہ جس چیز کی تمنا کر رہی ہے وہ میں قدرت رکھتے ہوئے بھی اسے  
دینا چاہتا۔ علی بیٹا! وہ شاہنواز کو پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟“

”تو اس میں بھلا کیا حرج ہے۔“ میں اپنی ناکامیوں کو چھپاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔  
”بیٹا! میں رابعہ کو اپنے ہاتھ سے مار تو سکتا ہوں مگر شاہنواز سے اس کی شادی کبھی نہیں کر  
گا.....“

”مگر کیوں انکل؟“ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔  
”وہ بہت برا انسان ہے میں نے اسے پڑھایا، لکھایا، بڑا کیا، اس کی ہر خواہش کا احترام کیا  
وہ چیز فراہم کی جس کی اسے ضرورت تھی مگر وہ آستین کا سانپ نکلا۔ آستین کا سانپ اس نے مجھے  
ڈسنا چاہا وہ رابعہ کو جم کیٹی کے ہاتھوں بچ دینا چاہتا ہے۔“  
”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل؟“ میں حیرت زدہ سا بولا۔ میری رگوں میں خون کی گرا  
بہت تیز ہو گئی تھی۔

”ہاں بیٹا! ایسا ہی ہے۔ میں رابعہ کو ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔ ہر طرح کی کوشش میں نے  
کے دیکھ لی ہے مگر وہ ہر مرتبہ میری بات یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے پاپا! آپ کی تمام باتیں ٹھیک ہیں مگر  
کیا کروں شاہنواز اگر مجھے نہ ملا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ میں اسے ہر صورت اور ہر قیمت  
حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کے بغیر میں ادھوری ہوں..... پاپا!“

”اب تمہی بتلاؤ علی نواز میں کیا کروں..... میں رابعہ کو اس درندے سے بچانا چاہتا ہوں۔“  
”مگر انکل! شاہنواز کو جم کیٹی سے کیا مفاد ہے؟“  
”دولت..... دفتینہ..... اور کیا.....“

”دفتینہ..... یہ دفتینہ والا کیا چکر ہے؟“  
میری بات سن کر انکل گڑبڑ سے گئے تھے مگر پھر فوراً سنبھل گئے۔ ”بیٹا اس بارے میں  
تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا..... اب صرف تم میری ایک عرض سن لو۔“  
”عرض کیسی انکل! آپ حکم کریں.....“ میں تجل سا ہو کر بولا۔

انکل نے پھر طویل خاموشی اختیار کی۔ اس وقت خیمے میں میرے انکل اور بے ہوش پڑی  
رابعہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میری کرسی کب کا اٹھ کر باہر جا چکا تھا۔ انکل کی خاموشی زیادہ طویل ہوئی  
تو مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا۔ ”انکل! آپ کچھ کہنے والے تھے۔“  
”ہاں بیٹا! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی سوچتا ہوں اپنے دل کے  
جذبات کیسے تم تک پہنچاؤں۔“

”اپنا بیٹا سمجھ کر اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ کر۔“ میں ان کے گلے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔  
ایکدم سے انکل کی آنکھوں میں نمی لہرا گئی وہ نہایت گھمبیر اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

”بیٹا! تمہیں پاکستان سے یہاں بلانے کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ تم رابعہ کو اپنی طرف متوجہ  
کرو..... اس کے دل میں اپنے پیار کی جوت جگاؤ..... اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دو..... کہ تمہارے جیسی  
محبت اس دنیا میں اور کوئی نہیں کرتا۔ بیٹا! مجھے معلوم ہے۔ تم رابعہ کو پسند کرتے ہو..... اور اسے حاصل  
کرنا چاہتے ہو..... محبت کو بیچ درمیان میں چھوڑ کر نہیں جایا جاتا..... محبت کو اس کے انجام تک پہنچایا  
جاتا ہے۔ تم کل ہم لوگوں کو چھوڑ کر واپس جا رہے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ رابعہ کی محبت تمہیں ضرور  
واپس کھینچ لائے گی۔ بیٹا! اپنی محبت کو رسوا ہونے سے بچا لو..... اپنی رابعہ کو ان درندوں سے بچا کر دور  
بہت دور اپنے پاکستان لے جاؤ..... میں رابعہ کے بغیر باقی زندگی یہ سوچ کر بتاؤں گا کہ وہ پاکستان  
میں خوش باش زندگی گزارے گی۔ بیٹا! ایک بوڑھا شخص اپنی معصوم بیٹی کی زندگی کی بھیک تم سے مانگ  
رہا ہے۔“

انکل روتے روتے جھک گئے تھے۔ میں نے کندھوں سے تھام کر انہیں سیدھا کیا تھا اور ان  
کے سینے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا تھا۔ حالات نے یہ کیسا پلٹا کھایا تھا کہ منزل کے  
نئے راستے متعین ہو گئے تھے۔

میری دل کی دنیا میں ایک مرتبہ پھر سے بھونچال آ گیا تھا۔ زخم تازہ ہو گئے تھے اور میرا پیار تمام  
حشر سامانیوں کے ساتھ بیدار ہو گیا تھا۔ صرف ایک دن پہلے میں پاکستان واپس جانے کا پکا ارادہ کر  
چکا تھا۔ میرے اس ارادے کو کوئی نہیں بدل سکتا تھا۔ میں واپسی کے لئے چل بھی پڑا تھا مگر قسمت مجھے  
گھیر کے پھر رابعہ کے پاس لے آئی تھی اور اب انکل کی باتیں سننے کے بعد پاکستان واپس جانے کا  
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ اگر پاکستان جاؤں گا تو رابعہ کو ساتھ  
لے کر جاؤں گا ورنہ نہیں جاؤں گا۔ میں نے شاہنواز کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلا تھا۔ رابعہ اس وقت

”ڈاکٹر! رابعہ کو کب تک ہوش آجائے گا.....؟“ ڈاکٹر نے مونے شیشے کی عینک کے پیچھے سے غور سے میری طرف دیکھا اور عام سے لہجے میں بولا۔ ”آدھا گھنٹہ لگ سکتا ہے۔ ایک گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے۔“ میرے سوال کا جواب دینے کے بعد ڈاکٹر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اس سے پہلے کہ میں ڈاکٹر سے مزید کچھ پوچھتا لینے ہوئے زنجیوں میں سے ایک نے میری ٹانگ تھام لی وہ ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا اس کا رخ دوسری طرف تھا اس لئے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو وہ بووی تھا اس کے کندھے پر ایک تیر لگا تھا اب وہاں سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”بووی..... تم.....“ میں حیرت سے بولا۔ میں پہلے بھی یہاں سے ہو کر گیا تھا مگر میں نے بووی کو نہیں دیکھا تھا۔

”علی.....! رینا کو بچالو..... وہ..... وہ.....“

”ہاں..... ہاں بولو۔ بووی۔ کیا ہوا رینا کو..... کدھر ہے وہ.....؟“

”وہ..... اسے جنگلی اٹھا کر لے گئے ہیں پتا نہیں مارڈالا ہے یا وہ زندہ ہے.....“

”ہم کیا کہہ رہے ہو.....؟“

”م.....“ سچ کہہ رہا ہوں اس بات کا شاید کسی کو پتا نہیں میں جب تیز بارش میں سب کو رانگلئیں بانٹ رہا تھا تو پیچھے ہٹتے ہٹتے مجھے کندھے پر تیر لگا تھا اور میں نیچے ڈھلوان پے لڑھک گیا تھا جب اندھا دھند فائرنگ شروع ہوئی اس وقت میں ایک گڑھے میں گرا ہوا تھا وہاں میں نے رینا کو بے ہوش پڑے دیکھا اور پھر ایک جنگلی نے اسے کندھے پر ڈال لیا تھا اور درختوں میں روپوش ہو گیا غاس منظر کے بعد میں زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا تھا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

بووی کی بیان کردہ معلومات اگر ٹھیک تھیں تو اس وقت بڑی خوفناک صورت حال تھی۔ رینا اس وقت جنگلیوں کے گھیرے میں تھی۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ میں اپنے ذہن میں یہ پلان بنا رہا تھا کہ مجھے سب لوگوں کو فوری یہ خبر سنانی چاہئے یا کوئی اور قدم اٹھانا چاہئے ابھی میں کسی نتیجے پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ بووی بول اٹھا۔ ”علی..... آپ سے میرا ایک درخواست ہے.....“

”ہاں بولو..... بووی۔“

دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔ وہ اس وقت آزاد گھومتے ہوئے بھی نظروں کی قید میں تھی۔ رابعہ کا بھرا بھالا چہرہ دیکھتے ہی میری نگاہوں میں جم کیٹی کا منخوس چہرہ بھی گھوم گیا۔ طیش کے عالم میں میرا منٹھیاں بھینچ گئیں۔ میرا دل چاہا ابھی اٹھوں اور اس خبیث انسان کا قصہ پاک کر دوں اس کی جراثیم کیسے ہوئی تھی میری رابعہ پر بری نگاہ ڈالنے کی۔

”انکل!.....“ میں آنسو صاف کرتے ہوئے بولا..... ”آپ کا یہ بیٹا! اس جگہ آپ سے ایک وعدہ کرتا ہے، خود زندہ رہے نہ رہے آپ کی بیٹی آپ کو ضرور لوٹا کے جائے گا۔ انکل آپ بالکل مطمئن ہو جائیں..... اب رابعہ کا کوئی بال بھی بیک نہیں کر سکتا۔ شاہ نواز یا جم کیٹی..... میں کسی کی بھی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“

انکل مدثر ممنونیت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے چلے گئے پھر اٹھ کر انہوں نے مرا پیشانی چوم لی۔ ”علی نواز..... بیٹا! مجھے تم سے یہی امید تھی..... بس اس بات کو تم نے اپنے دل میں را بنائے رکھنا ہے اور دیکھو کسی وقت..... کسی موقع پر گھبرانا نہیں ہے۔“

میں انکل کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ وہ رابعہ کے متعلق مجھے کہہ رہے تھے میں نے خود اپنے دل میں یہ بٹھالیا تھا کہ کسی موقع پر مجھے حوصلہ نہیں ہارنا تھا۔ مجھے رابعہ کو حاصل کرنا تھا اس کا دل جیتنا تھا اس کے دل میں اپنے پیار کی جوت جگانا تھی۔ رابعہ کے پیار کا جو رخ شاہ نواز کی طرف تھا اسے اپنی طرف موڑنا تھا۔

ایک دم مجھے کچھ یاد آیا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا انکل بولے۔ ”کدھر کو چلے بیٹا.....“

”انکل! ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے میں ابھی آیا.....“ میں انکل کو وہاں چھوڑتے ہوئے خیمے سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے نکلتے میں نے سوئی پڑی رابعہ کے معصوم اور دربار چہرے کی طرف دیکھا اور میرا دل انجانی خوشی سے جھوم اٹھا۔

خیمے سے باہر نکلتا تو بارش رک چکی تھی تیز ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس خیمے میں داخل ہو گیا جہاں زنجیوں کی مرہم پٹی کی جارہی تھی ڈاکٹر اسمتھ مجھے وہیں نظر آ گیا اس کی عمر چالیس کے قریب تھی مگر وہ تیس سے اوپر کا نظر نہیں آتا تھا اس کی آنکھوں پر مونے شیشے کی عینک لگی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ مالنے کی طرح سرخ تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر.....“ میں اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

اس نے خوشدلی سے جواب دیا اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

میں اس وقت دو دشمنوں کے نشانے پر تھا۔ ایک طرف بھیڑیا میرا جسم ادھیڑ دینا چاہتا تھا تو دوسری طرف جنگلی میری جان کے درپے تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بھیڑیا جنگلی کو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے پنڈلی سے خنجر اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے ٹانگ کا ایک مہلک وار جنگلی کے پیٹ میں کیا اور خنجر والے ہاتھ کو اسی انداز میں حرکت دی کہ خنجر بھیڑے کو ایک گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے دونوں دشمن مجھ سے پرے ہٹے تو مجھے وقت مل گیا میں نے بھاگتے ہوئے جست کی اور جنگلی کو جالیا۔ وہ چھریرے بدن کا لمبا ترنگا جنگلی تھا اور جنگلیوں کی طرح اس کے جسم پر بال کم تعداد میں تھے مگر سر کے بال شانوں تک لہرا رہے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرا روپیڑ اور ماؤزر گھوڑے سے گرتے ہی میرے جسم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان تک پہنچ سکتا اور اگر پہنچ بھی سکتا تو اسلحہ چلانے میں ابھی خطرہ تھا روپیڑ کی پرگونج آواز جنگلیوں کو متوجہ کر سکتی تھی اسی لئے فوری طور پر اور لاشعوری طور پر میں نے اسلحے کی طرف بڑھنے سے بہتر جانا تھا کہ جنگلی کا بغیر آواز پیدا کئے خاتمہ کر دوں۔

میں نے اس کے دہلے پہلے جسم کو جھٹکنا چاہا تو اس نے میری ہوج سے بڑھ کے تیزی دکھائی اس نے بجلی کی سی تیزی سے گھوم کے میری ناک پر ایسا وار کیا کہ دماغ میں تارے سے ناچ اٹھے ابھی میں اس حملے سے سنبھلا ہی نہیں تھا کہ اس کی بھرپور نگر میرے پیٹ میں لگی اور میں پیٹ تھام کے زمین پر جا گرا۔ بھیڑیا خنجر کا کاری زخم کھانے کے بعد لونبیاں لے رہا تھا اس میں اتنی سکت باقی نہیں بچی تھی کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا۔ پیٹ میں ٹکر کھانے کے بعد میرا دماغ ابلنے لگا۔ طیش کے عالم میں گول میں آگ سی دوڑنے لگی۔ میں تیزی سے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ جنگلی اپنا سر جھکائے بھینے کی لرح دور سے دوڑا آرہا تھا۔ وہ میرے پیٹ میں آخری مہلک ضرب لگانا چاہتا تھا جونہی وہ میرے رعب پہنچا میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اس کا اپنا وار ہی اس کے خلاف استعمال ہو گیا تھا وہ درخت سے ٹکر کر بے سدھ ہو گیا۔ میں واپس مڑا اور گھوڑے کو ڈھونڈنے لگ گیا۔ گھوڑا مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا۔ پندرہ بیس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ میں نے اپنا ماؤزر ڈھونڈ کے ہولسٹر میں لگایا۔ روپیڑ کو لندھے پر لٹکایا میں ابھی گھوڑا ڈھونڈنے کے لئے رخ کا تعین کر ہی رہا تھا کہ ایک مخصوص سیٹی کی آواز بلند ہوئی میں نے چونک کر مڑ کے دیکھا تو وہ چیخ نما سیٹی بے ہوش ہونے والے جنگلی کے منہ سے نکل رہی تھی وہ ہوش میں آچکا تھا اور ایک مخصوص آواز نکال کر شاید اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر

”اگر اس لڑکی کو بچانا مقصود ہے تو صرف ایک بندہ جنگلیوں کے پیچھے جائے زیادہ جائے صورت میں وہ جنگلی پہلے ہلے میں ہی لڑکی کو مار ڈالیں گے.....“

بووی نے بات کر کے میری ساری مشکل آسان کر دی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اگر ہم لڑکے اکٹھے ہو کر جنگلیوں کا پیچھا کرتے تو ممکن تھا جنگلی طیش میں آکر رینا کو مار ڈالتے یہ امید تو تھی کہ ابھی تک زندہ ہوگی۔ اگر اسے مارنا ہی مقصود ہوتا تو جنگلی بے ہوش رینا کو کبھی اٹھا کر نہ لے جا بہت ہی مختصر وقت میں ایک فیصلہ میں نے کر لیا۔ مجھے رینا کو بچانا تھا اپنی بہن کو بچانا تھا اور مجھے اس مشن پر فوری روانہ ہونا تھا اگر میں کسی ایک سے بھی رینا کی کشدگی کا ذکر کر دیتا تو معاملہ خراب سکتا تھا۔ رینا کی کشدگی اب زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی اس لئے میں نے فوری طور سے گھوڑے زمین کسی ضروری اشیاء ساتھ لیں اور شمال کی طرف چل پڑا۔ میں اس راستے سے وہاں سے نکل کر تھا کہ کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ راستے میں ایک دفعہ خیال ضرور آیا کہ ایک دفعہ رابعہ سے قول مگر پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ رینا کی جان بچانا زیادہ ضروری تھا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی بار بار میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب رینا نے میرے گھوڑے کی لگام کھینچ کر کہا تھا۔ ”بھائی! اپنا خیال رکھنا۔“ رینا دھوکوں کی ماری لڑکی تھی اس کا اپنے ماموں کے علاوہ اس دنیا میں کوئی تھا اور ماموں بھی ایسا جس سے دشمن بھلے۔ میں نے رینا کو اپنی بہن کہا تھا اور اس سے یہ بھی کہا تھا وقت آنے پر میں ثابت کر دوں گا کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔

گھوڑا دھیمی رفتار سے جنگلی کی تاریکیوں میں چلا جا رہا تھا کسی جگہ روشنی ہو جاتی تھی کسی اندھیرا چھا جاتا تھا میں پوری طرح مسلح ہو کر کمپ سے نکلا تھا۔ میرا روپیڑ میرے پاس تھا کارتوس سائیڈ بیگ میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ میں تقریباً بیس کوس چلا ہوں گا کہ اچانک ابا طرف سے ایک خوفناک بھیڑیا برآمد ہوا اور اس نے اپنے نوکیلے دانت میرے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ پے گاڑ دیئے میں نے بھیڑیے کو پرے دھکیلنا چاہا تو وہ مجھ پر حملہ آور ہو گیا میں نے اپنے بوٹ بھر پور ٹھوکرا اس کے منہ پر رسید کی وہ تھوڑا سا پیچھے ہوا اور پہلے سے بھی زیادہ خطرناک انداز میں چھپا اس دوران میں اپنا ماؤزر نکال چکا تھا اس سے پہلے کہ میں اس پر فائر داغنا ایک طرف سے کوئی چیز دار طریقے سے مجھ سے آکر ٹکرائی۔ میرا توازن بگڑا اور میں گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ مجھ سے ٹکر والا ایک جنگلی تھا۔ اس نے کسی درخت سے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور مجھے لیتا ہوا گھوڑے سے آگیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھیڑیا صرف مجھ پر حملہ آور ہی ہو رہا تھا۔

رہا تھا۔ پلک جھپکنے سے میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں کوئی موقع ضائع کئے بنا جنگلی کے پے پہنچ گیا۔ میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور ایک مخصوص ضرب سے جنگلی دوبارہ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگا۔ مجھے جب مکمل تسلی ہوگئی کہ جنگلی اب دوبارہ اتنی جلدی نہیں اٹھ سکے گا تو میں در پاؤں وہاں سے چل پڑا۔ بھیڑیے کے پاس سے گزرا تو وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا میرے ایک وار نے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔

گھوڑے کی تلاش میں، میں ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے بہت سی آوازیں اور شور سنا دینے لگا۔ ان میں کچھ مخصوص آوازیں سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ آوازیں بالکل اس سیٹی چیخ کے مشابہ تھیں جو بے ہوش ہونے والے جنگلی نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے منہ سے نکالیں تھیں۔ کیا جنگلی بے ہوش ہونے سے پہلے اپنا کام کر گیا تھا؟ وہ اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر گیا تھا اور شاید ان کے سینکڑوں ساتھی مخصوص سیٹی نما آوازیں نکالے اس کی مدد کو چلے آ رہے تھے۔ یہ میرے حرکت نہ آنے کا وقت تھا۔ میرے پاؤں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ میں تند بگوئے کی مانند سر پٹ اڑا جا رہا تھا۔ روپیٹر کے بیٹ کو بل دے کر میں ڈال لیا تھا اور اندھا دھند بھاگا چلا جا رہا تھا پیچھے بلند ہونے والا شور لمحہ بہ لمحہ مجھ سے قریب ہو رہا تھا چند قدموں کی دوری پر مجھے اپنا گھوڑا آگیا۔ ایسے ہی تھا جیسے مرتے ہوئے بھوکے شخص کو مرغ مسکھلا کر آجائے۔ میں ایک لمبی جست ہوا گھوڑے پر سوار ہوا۔ میں نے گھوڑے کی لگام کو دائیں طرف موڑا یہ دوسرے رستوں کی نسبت سیدھا اور آسان رستہ تھا سیدھے رستے پر چڑھتے ہی میں گھوڑے کو دوڑاتا چلا گیا گھوڑا منٹوں میں ہو گیا۔ میں سمجھ رہا تھا میں جنگلیوں کی پہنچ سے بہت جلد دور نکل جاؤں گا مگر جلد ہی میری سارا امیدوں پر پانی پھر گیا سیدھا اور آسان رستہ جلد ہی اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

آگے جو رستہ تھا وہ نہایت پر پیچ اور درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ میں نے نسبتاً آسان رستے گھوڑا ڈال دیا۔ گھوڑا میرے حکم پر گھنے درختوں میں گھستا چلا گیا۔ گھوڑے کی پچھلی ٹانگ پر وار لنگڑا ہٹ آگئی تھی۔ بھیڑیے نے اس کی ٹانگ زخمی کر دی مگر وہ وفا کا پیکر اپنے مالک کے حکم پر ڈنڈا حالت میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔

گھوڑا ابھی دس منٹ کی دوری پر ہی پہنچا تھا کہ جنگلیوں کی آوازیں پھر سے آنے لگیں۔ اب کے یوں لگ رہا تھا جیسے جنگلی میرے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں نے ہمت نہیں ہاری گھوڑے بھاگا چلا گیا۔ روپیٹر کو میں نے ہاتھ میں لے کر لوڈ کر لیا تھا دس کار توں روپیٹر کے اندر تھے اور دوسرے

تعداد میں بیگ میں پڑے ہوئے تھے۔ جنگلیوں کی آوازیں اور لکارے مجھ سے قریب سے قریب تر آ رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے پیچھے آنے والے جنگلی نہیں کوئی آسپی لشکر ہے جو درختوں کو پھاندتا ہوا بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

میں خطروں کا کھلاڑی تھا۔ مشکلات میرے خون کی گردش بڑھا دیتی تھیں۔ مصائب سے لڑنا میری سرشت میں شامل تھا مگر جس صورت حال کا مجھے اب سامنا تھا وہ بڑی خطرناک تھی میں جلدی میں بہت بڑی بھول کر گیا تھا۔ مجھے بالکل اکیلے رینا کی تلاش میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ باشعور آدمی تو سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ دلائل سے اسے اپنی بات سمجھائی جاسکتی ہے مگر جنگلی تو جنگلی ہوتا ہے۔ عقل سے پیدل اور شعور سے آزاد..... اور پھر چند گھنٹے پہلے جنگلیوں نے جس طرح ہمارے پڑاؤ پر بلہ بول کر کشت و خون کا بازار گرم کیا تھا، وہ مجھے سنگین خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں اکیلا اپنے گھوڑے کو حسب توفیق بھگاتا چلا جا رہا تھا اور جنگلی انسانوں کا ایک خون آشام لشکر میرے پیچھے اٹھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ سب مجھے کسی خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ ادھوری آوازیں، مشتعل لکارے، ناقابل فہم غرائیں یہ سب مل کر ماحول کو بہت خوفناک بنا رہے تھے۔ مجھے محسوس ہونے لگا میں زیادہ دور تک نہیں بھاگ سکوں گا۔ میں نے اچانک بھاگنے ہوئے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور گھنے درخت کی ایک موٹی شاخ پر بھول کے درخت پر چڑھ گیا۔ وہ درخت بڑا گھنا تھا اگر پچاس آدمی بھی بیک وقت وہاں چھپ کر بیٹھ جاتے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ درخت کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا۔ پتوں سے لدی شاخیں دائیں بائیں سے نکل کر نیچے کو جھک گئی تھیں۔

اس لحاظ سے وہ ایک تہہ در تہہ درخت تھا۔ میں دائیں بائیں شاخوں پر قدم جماتا ہوا بہت اوپر تک چلا گیا ایک محفوظ جگہ پر پہنچ کر موٹی شاخ پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ روپیٹر لوڈ حالت میں میرے پاس تھا۔ گھوڑے سے اترتے وقت میں نے اس کی پیٹھ پر ایک مخصوص تپکی دی تھی اور میری دلی خواہش تھی کہ گھوڑا اس مقام سے دور نکل جائے اگر گھوڑا یہیں کھڑا رہتا تو میرے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

گھوڑا چند قدم بھاگنے کے بعد ایک جگہ پر کھڑا ہو گیا میں اسے وہاں سے بھگانے کے لئے نیچے بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ میں فائر کرتا تو گھوڑا وہاں سے بھاگ سکتا تھا مگر اس حرکت سے میرا دشمن خردار ہو سکتا تھا اور مجھے آسانی سے ڈھونڈ سکتا تھا۔ میری جان پے بنی ہوئی تھی میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ کچھ ایسا ہو جائے گھوڑا جلد از جلد یہاں سے بھاگ نکلے وہ یہاں سے بھاگ کر

دشمن کو دھوکے میں رکھ سکتا تھا۔

پھر شاید جیسے میری دعا قبول ہوگئی۔ وہ گلہری تھی یا کوئی گرگٹ یا اسی طرح کا کوئی جانور تھا؟ گھوڑے کی چھپلی ٹانگ کا چھو کر گزرا تھا۔ گھوڑا خوفزدہ ہو کر بدکا اور ہوا ہو گیا وہ اس بدحواسی سے لگلا کر یوں لگتا تھا جیسے وہ چار پانچ کوس سے پہلے نہیں رکے گا۔

جنگلیوں کا شور اب بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ شاخیں ٹوٹنے اور پتوں کے چرمرانے کی آواز پر بالکل قریب سے آتی معلوم ہونے لگیں۔ میں شاخ سے یوں لپٹ کے بیٹھا تھا کہ شاخ کا حصہ ہر معلوم ہو رہا تھا۔ رویٹر سر سے اوپر شاخ پر بالکل سیدھا پڑا تھا چند لمحوں میں جیسے وہاں بھونچال آگیا۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں جنگلی تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں نیزے اور تلواریں اٹھا رکھی تھیں۔ چار تہاڑ ان میں ایسے تھے کہ ان کے سروں پر بارہ سنگھے کے سینگوں سے بنی ہوئی ٹوپیاں نما خود تھے وہ سب وحشی آواز میں چنگھاڑ رہے تھے۔

جن کے سروں پر خود نہیں تھے ان کے جسموں پر بکثرت بال تھے ان کے ہاتھوں میں نیزور کی انیاں چمک رہی تھیں ان کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔ ان میں سب سے الگ تھلک ایک لم ترنگا اور خونخوار آنکھوں والا جنگلی تھا اپنی زخم کا نشان اس کی کنپٹی سے لے کر بالائی ہونٹ تک چلا گیا کسی وقت لگے زخم کے اس نشان نے اس کے چہرے کو خوفناک ترین بنا دیا تھا۔ اس نے جسم پر سفید چیتے کی کھال اوڑھ رکھی تھی۔

اس کے سر پر عجیب طرح کا خود تھا وہ جنگلیوں کو دائیں بائیں جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں وہ سادھے درخت پر لیٹا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ نیچے کو جھکے ہوئے پتوں نے مجھ کو یوں ڈھانپ لیا تھا کہ باوجود کوشش کے بھی میں نظر نہیں آسکتا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی اور بادلوں نے ایک بار پھر سے اندھیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ نے اپنی مشعلیں روشن کر لی تھیں اور کچھ نے مشعلیں روشن کئے بنا پکڑی ہوئی تھیں۔

جس نے چیتے کی کھال اوڑھ رکھی تھی وہ مجھے ان جنگلیوں کا سردار معلوم ہو رہا تھا۔ سردار کے حکم سے ہی آدھے جنگلی آگے بڑھ گئے تھے جبکہ آدھے وہیں اسی درخت کے نیچے کھڑے تھے جہاں میں چھپا بیٹا تھا میری ہلکی سی جنبش جنگلیوں کو میری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

جنگلی سردار کے حکم سے جب مشعلیں روشن کر چکے تو ایک جنگلی درخت کے تنے کے بالکل پاس چلا آیا۔ وہ مشعل کو اوپر کر کے کچھ دیکھنے لگا۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ مشعل کی روشنی

کارخ میری طرف تھا۔ جنگلی نے اپنی مشعل اپنے دوسرے ساتھی کو پکڑائی اور درخت پر چڑھنے لگا اس کے چہرے کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ یکا یک میرے اعصاب تن گئے۔ رویٹر کے دستے پر میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

وہ جنگلی بڑی تیزی سے اوپر ہی چڑھا آ رہا تھا۔ میں رویٹر کا رخ اس کی طرف موڑنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا وہ ایک شاخ پر بیٹھ کر ٹہنیوں کے آخر میں لگے ہوئے نسواری رنگ کے پھول توڑنے لگا دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کافی پھول اکٹھے کر لئے اس سے میرا فاصلہ تقریباً دو اڑھائی گز رہ گیا تھا۔ میرے سانس کھینچنے کی آواز بھی نکل جاتی تو وہ میری طرف متوجہ ہو سکتا تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا جنگلی اپنا کام مکمل کر کے بخیر و عافیت نیچے اتر گیا۔

سکون کی ایک طویل لہر میرے اندر ہی اندر جذب ہوگئی۔ سارے جنگلی آگے چل پڑے تھے جبکہ پھول توڑنے والا جنگلی پیچھے رہ گیا تھا اس کا ساتھی مشعل تھا اس کے انتظار میں درخت کے نیچے ہی کھڑا تھا اس نے درخت سے اترنے والے اپنے ساتھی سے پھول پکڑے اور مشعل اسے واپس تھما دی۔

میں آنکھیں بند کر کے اطمینان کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ مگر پھر یکا یک اطمینان کے سمندر میں بے چینی کی لہروں کا خوفناک اچھال پیدا ہوا جو جنگلی درخت سے اترتا تھا اس نے ہاتھ میں مشعل پکڑ لی تھی اور درخت کے تنے سے اوپر پہلی شاخ پر اس کی روشنی ڈالنے لگ گیا تھا۔ دفعتاً اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ پیدا ہوا۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر بجلی کی سی رفتار سے اس کی نگاہوں کا رخ اوپر کی طرف ہو گیا۔ وہ شاید میری موجودگی سے باخبر ہو چکا تھا۔ جب میں گھوڑے سے اتر کر بھاگا تھا تو بارش زدہ گیلی زمین سے میرے بوٹوں کے نیچے گیلی مٹی لگ گئی تھی درخت پر چڑھتے ہوئے بوٹ کے نشان ایک شاخ پر لگ گئے تھے جس کی وجہ سے اس نے میری موجودگی کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ دائیں بائیں اچھلنے والے انداز میں حرکت کر کے مجھے ڈھونڈنے لگا۔

میرے دل و دماغ میں گولے سے پھٹ رہے تھے۔ میرے حرکت میں آنے کا وقت آچکا تھا دفعتاً جنگلی نے نشانہ تاک کے ایک نیزہ میری طرف پھینک دیا اور ساتھ ہی ساتھ اونچی آواز میں چلانے لگا۔ نیزہ صرف ایک گز کی دوری پر ایک شاخ میں پیوست ہو گیا۔

دوسرا جنگلی بھی اپنا نیزہ ہاتھ میں تول چکا تھا۔ میں اب بھی خاموش بیٹھا رہتا تو میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا رویٹر کا رخ جنگلی کی طرف کر دیا بارہ بور کی پڑ گونج

دیکھے۔ میری طرف موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کو دیکھے..... شاید..... شاید اسی منظر سے اس کے اندر میرے پیار کی چنگاری پھوٹ پڑے..... اس کے بجز دل سے میری محبت کا چشمہ پھوٹ پڑے۔ جنگلوں کی رنگت ہوئی سرسراہٹیں لمحہ بہ لمحہ میرے قریب ہو رہی تھیں اور میری آنکھوں میں آنسوؤں کے میلے لگے ہوئے تھے۔ بارش کے پانی نے جیسے میرے تمام وجود کو چشمہ بنا دیا تھا ہر طرف پانی ہی پانی تھا بالوں سے کانوں کی لوؤں سے آنکھوں اور ٹھوڑی کے کنارے سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔

بارش کا پانی ٹھنڈا تھا آنکھوں سے بہنے والا پانی گرم اور کڑواہٹ سے بھر پور تھا۔ اس کڑواہٹ میں میری محبتوں کا نصاب لکھا ہوا تھا اس تپش میں میری دھڑکنوں کی ترجمانی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے تھے رابعہ کے دیئے ہوئے زخم قطرہ قطرہ رس رہے تھے۔ آخری ملاقات میں انکل مدثر سے میری جو بات چیت ہوئی تھی اس سے میری دھڑکنوں میں بلا کی بے چینی بھر دی تھی۔ رابعہ شاہنواز کی محبت میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی اور انکل مدثر بیٹی کی محبت میں ان جنگلوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ ہر طرح کی وعظ و نصیحت سے بھی بیٹی کو شاہنواز کی محبت سے باز نہیں رکھ پائے تھے۔ انہوں نے بیٹی کی محبت میں ہی اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا کہ مجھے پاکستان سے بلانے پر مجبور ہو گئے تھے ان کا خیال تھا میں رابعہ کی محبت کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا جس دلدل کی طرف وہ قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی مجھے اس کا رخ موڑ کر زندگی کی طرف کرنا تھا۔ جم کینی کا مکروہ چہرہ اب ہر لمحہ میری نگاہوں میں سما رہا تھا۔ جم کینی شاہنواز کے ذریعے رابعہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پھر بار بار شاہنواز کی وہ بات بھی میری سماعت میں گونجتی رہتی تھی۔ ”جان من! وہ میری بہترین دوست ہے ہم اکٹھے پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہیں میں نے کبھی اس کے بارے میں ایسا سوچا ہی نہیں..... میری بننے والی دلہن کا نام رینا ہے۔“ شاہنواز سے رابعہ کے ساتھ شادی سے لاقلمی ظاہر کی تھی اور رینا کو اپنی دلہن بنانے کا مژدہ سنایا تھا۔ اس سارے چکر میں دینے کا راز کار فرما تھا شاہنواز دینے کے حصول کے لئے رابعہ کو آگ میں جھونک رہا تھا اور وہ اتنی یگی تھی اس کے پیار میں اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ اس کی ہر بات آنکھ بند کر کے مانتی چلی جا رہی تھی۔ یکا یک بجلی اس زور سے چمکی کہ جنگل کی ہر چیز ایک لمحے کے لئے دودھیا روشنی میں نہا گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک جنگلی ایک شاخ پے بندر کی طرح اچھل کود کرتا میزری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے پنڈلی سے خنجر اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ چشم زدن میں وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا میں نے دائیں بائیں اوپر نیچے نگاہ

آواز نے قرب و جوار لرزادے۔ روپیڑ کے دھانے سے آگ اگلی اور نیزہ ہاتھ میں تولنے والے جنگل کے بائیں کندھے کے چیتھرے اڑ گئے۔ وہ پشت کے بل نیچے گرا۔ اس کے ساتھی نے اپنے ساتھی یہ حال دیکھا تو طیش کے عالم میں آگے جھکتے ہوئے اپنے مرنے والے ساتھی کے ہاتھ سے نیزہ لے کر بڑی تیزی سے مڑا بھی اس کا نیزہ پھینکنے والا ہاتھ بلند ہوا ہی تھا کہ روپیڑ نے اس کا بھیجا اڑا دیا۔ وہ بے خوفناک منظر تھا۔ فائرنگ سے اس کے سر نے عجیب شکل اختیار کر لی تھی یوں لگا جیسے کوئی بھیا نک روز نیزہ ہاتھ میں تھا مے زمین بوس ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے بائیں طرف سے اچانک بہت شور سنائی دیا۔ لگا۔ میں اپنی جگہ پے کھڑا ہوا اور ایک موٹی شاخ پے تقریباً بھاگتا ہوا ساتھ والے درخت پے پہنچ گیا یہاں پے درخت یوں آس پاس کھڑے تھے کہ ان کی شاخیں آپس میں بغل گیر ہوتی تھیں۔

ساتھ والے درخت پے ایک جگہ موٹی شاخوں نے گھیرا سا بنایا ہوا تھا۔ یہ جگہ میرے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میں یہاں محفوظ رہتے ہوئے اپنے دشمن پر فائرنگ کر سکتا تھا۔ میں نے ایک شاخ پے گھومتے ہوئے جگہ بنائی اور ان شاخوں کی پناہ میں سما گیا۔ استعمال ہو جانے والا دوکارتوس بھی میں نے لوڈ کر لئے تھے۔ جس درخت کو میں چھوڑ چکا تھا اس کے نیچے تقریباً ڈیڑھ درجن جنگلی کھڑے غرار ہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک سو کے قریب جنگلی وہاں آمو جھوٹے پھر وہ کسی سیلاب کی طرح آس پاس پھیل گئے ان کی غراہٹیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ غصے کے عالم میں درختوں کی شاخیں کاٹتے چلے آ رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ درختوں پر چڑھنے لگے۔

بادل گرے بجلی ترپتی اور آٹھ پہر کی رکی ہوئی بارش پھر سے برسنے لگی۔ رہ رہ کے بجلی ترپتی اور قرب و جوار روشن ہو جاتے تھے۔ میں اکیلا چاروں طرف سے خونخوار جنگلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ان کوئی جنگلی فرشتہ اجل کا روپ دھار کے میرے سامنے آ سکتا تھا۔ رابعہ کے زمبابوے آ جانے کے بعد میں نے پاکستان میں بہت کٹھن وقت گزارا تھا۔ میں نے اسکرود کے بریلے موسم سبے تھے۔ جاپا۔ میں اپنے ٹیپر ”لی چو“ کی سزائیں سہی تھیں۔ یہ سب میں نے رابعہ کی محبت میں کیا تھا اب جبکہ میرے چاروں طرف موت کے ہر کارے گشت کر رہے تھے۔ مجھے رابعہ ہی یاد آ رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب انسان پے مشکل وقت پڑتا ہے اسے اپنا پیارا ساتھی یاد آتا ہے شاید اس لئے کہ اسے اپنی مصیبت اپنی پریشانی سے آگاہ کر کے اس کی دلی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے ہمدردی بھی پیار کا دوسرا نام ہے نا.....

اس لمحے میرے دل میں بھی یہ سوچ سر اٹھا رہی تھی کہ کاش یہاں رابعہ ہو اور میری مشکلات

چلے جاتے تھے۔

یہاں بھی یہی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ میرے پاؤں دلدلی زمین پر پھسلنے چلے جا رہے تھے۔ تیروں کی برسات شروع ہو چکی تھی۔ کوئی لمحہ گزرتا تھا کہ کوئی تیر میرے وجود میں ڈھنس جاتا۔ بھاگتے بھاگتے یکا یک اک ٹیس سی میری کمر سے ابھری دوسری ٹیس پنڈلی کے پاس محسوس ہوئی۔ وہ چوٹی لمبائی کے دو عدد تیر تھے جو میری کمر اور پنڈلی کو زخمی کر چکے تھے۔ میری چال میں لنگڑاہٹ آچکی تھی مگر چارونا چار میں گھسنا ہی چلا جا رہا تھا۔ پانچ چھ درختوں کا کلاوہ کاٹتے ہوئے مجھے روشنی کی کرن دکھائی دے گئی۔ میرے بائیں طرف ڈھلوان تھی۔ ڈھلوان جنگلی مٹی کی گار سے اٹی پڑی تھی اگر میں خود کو اس ڈھلوان پر لڑھکانے میں کامیاب ہو جاتا تو میری زندگی بچ سکتی تھی۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر اپنی تمام قوت اکٹھی کی اور ڈھلوان کی طرف دوڑ لگا دی۔ ڈھلوان جب مجھ سے چار گز کی دوری پر رہ گیا تھا میں نے پاؤں کی حرکت روک لی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اپنی کلاس روم کے دروازے کے قریب روک لیا کرتا تھا اور دور تک پھسلتا چلا جاتا تھا۔ یہاں بھی یہی ہوا میں چار گز کا فاصلہ پھسلنے ہوئے چلا گیا۔ میری پنڈلی سے ناقابل برداشت ٹیس ابھری۔ سنسناتے ہوئے تیر میرے دائیں بائیں سے گزرتے زمین میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی سینکڑا ایک مختصر حصہ میں ہوا میں معلق رہنے کے بعد ڈھلوانی گار پر گرا اور کسی تند پہاڑی نالے کی طرح گار میں بہتا چلا گیا میں نے اپنا رخ دائیں پہلو کی طرف موڑ لیا تھا دایاں ہاتھ بڑھا کے کندھے پر لگنے والا تیر میں نے نکال باہر کیا۔ اس امید نے میرے اندر قوت کوٹ کوٹ کے بھر دی تھی کہ اب میں بچ جاؤں گا مگر میری یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہوگئی۔ میری نگاہ اوپر کو اٹھی تو نصف درجن کے قریب جنگلی میری طرح سلائیڈ کرتے ہوئے میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

ڈھلوان ختم ہونے کے بعد جس جگہ میں جا کر رکا وہاں دلدلی گڑھا بنا ہوا تھا۔ میں بمشکل اس گڑھے سے نکل سکا ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کوئی چیز میرے سر کے ساتھ آکر ٹکرائی میری نگاہوں میں دودھیا روشنی سی بکھر گئی۔ وہ ایک جنگلی تھا جس کی ٹکر نے مجھے بادلوں میں بھی تارے دکھا دئے تھے۔ میں اس کی ٹکر سے ابھی سنہلنے بھی نہیں پایا تھا کہ چاروں طرف سے مجھ پر یلغار ہوگئی وہ ایک درجن کے قریب جنگلی تھے جو بے دردی سے مجھے پیٹ رہے تھے۔

ان کی ٹھوکریں، ان کے اپنی ہاتھ مسلسل میرے جسم پر برس رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک جنگلی نے آگے بڑھ کے نیزہ ہاتھ میں بلند کیا تھا اس کا نشانہ میرا پیٹ تھا اس نے پوری قوت

دوڑائی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا؟ میں بے حد چونکا ہو گیا۔ اچانک مجھے اپنے قدموں کے پاس کچھ ریگلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے کمر شاخ سے نکاتے ہوئے نیچے دیکھا: میرا کلیجہ حلق میں آگیا۔

چار کے قریب جنگلی میرے نیچے کھڑے تھے ان کے سر میرے پاؤں سے چھونے کے قریب تھے۔ وہ بڑی غصیلی اور خون خوار لگا ہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں روپیٹر ابھی سیدھا ہی کر رہا تھا کہ کوئی چیز سنسناتی ہوئی آئی اور میرے بازو اور کندھے کے درمیانی حصہ میں پیوست ہوگئی۔ وہ چھوٹے سائز کا تیز دھار خنجر تھا جس نے میرے کندھے میں انگارے ہی انگارے بھر دیئے تھے۔ میں نے روپیٹر سیدھا کیا اور فائر جھونک دیا دو جنگلی ایک ساتھ جھولتے ہوئے درخت سے نیچے جا پڑے۔ بایاں کندھا زخمی ہو جانے کی وجہ سے میں روپیٹر کو دوبارہ لوڈ نہیں کر سکتا تھا مجھے اپنی بے بسی پر رونا آگیا۔ کار تو سوں سے بھرا ہوا روپیٹر اب میرے لئے بے کار ہو گیا تھا۔ میں نے روپیٹر پھینکتے ہوئے ہوسٹر سے ماؤزر نکال لیا۔ اس دوران دونوں جنگلی مجھ سے پرے ہٹ گئے تھے ان کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ میرے ماؤزر نے دو شعلے اگلے دونوں جنگلی ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ فائرنگ کی آواز اور مرنے والے جنگلیوں کی چیخیں سن کر جنگلی بھیڑیوں کی طرح درخت کے گرد جمع ہونے لگے میں نے دیکھا آگے نکل جانے والے بارہ جنگلی کے خودوں والے جنگلی بھی واپس پلٹ آئے تھے ان کی رفتار میں عجیب سی تیزی تھی۔ یکا یک کوئی وزنی چیز دھم سے میری پشت کے ساتھ آکر ٹکرائی مجھے پیچھے مڑ کے دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ کوئی جنگلی ہی تھا جس نے درخت کی شاخ پر جھولتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں میری پشت پر ٹکائے تھے۔ میں کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا ایک جنگلی کے سر پر گرا۔ حواس باختہ تو میں تھا ہی مگر گرتے ہی میں سنبھلا، ماؤزر خوش قسمتی سے میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا تھا اس کی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ ان نازک حالات میں میری گرفت ماؤزر پر بہت سخت تھی۔ میں بے دریغ فائرنگ کرتا ہوا ایک طرف کو بھاگ نکلا شاید یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں اکیلا تھا تو دوسری طرف کیل کانٹے سے لیس جنگلیوں کا لشکر تھا۔ میں اندھا دھند بھاگتا چلا جا رہا تھا وہ بڑی عجیب دوڑ تھی..... گیلی دلدلی زمین پر میرے پاؤں جہاں پڑتے تھے وہاں سے چار فٹ آگے تک کھسک جاتے تھے، بچپن میں سکول کے زمانہ میں سکول کے برآمدے میں ہم بچے ایک کھیل کھیلا کرتے تھے بھاگتے ہوئے آتے تھے اور خاصی رفتار میں اپنی پاؤں کی حرکت روک لیا کرتے تھے اس سے یوں ہوتا تھا کہ چپکنے فرش پر ہمارے جو گر پھسل



سے نیزہ میرے پیٹ میں دے مارا تھا مگر قدرت کو شاید ابھی میری زندگی منظور تھی ایک جنگلی کی ٹھوک سے میں اپنی جگہ سے تھوڑا پرے کھسک گیا تھا میرے پیٹ میں لگنے والا نیزہ میرے دائیں پہلو اور ہڑتا ہوا گزر گیا تھا۔ میں درد کی شدت سے دھڑک رہا ہوا کر رہ گیا۔ ٹھوک میں مسلسل میرے جسم پر برس رہی تھیں کوئی اور لمحہ ہوتا تو مجھے ان ٹھوکوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ میں اپنے جسم کو برہتہ کنٹرول میں لے آیا۔ مگر یہاں مسئلہ کچھ اور تھا میں جو نبی جسم کو برہتہ کنٹرول میں لانے کے لئے جسم میں سانس بھرتا تھا۔ میرے زخم بھرا جگر خون اگلنا شروع کر دیتے تھے۔ دائیں پہلو کو چھو کر گزرنے والے نیزے نے میرا ہسپاد ختم بھی کر دیا تھا۔

میری آنکھوں میں دھند ہی دھند بھر گئی تھی اس دھند کی اوٹ سے میں نے دیکھا ایک کرخت شکل جنگلی آگے بڑھا اس کے سر پر عجیب و غریب قسم کا خود تھا۔ اس نے اپنی تلوار ہوا میں بلند کر کے میرے سینے میں اتارنی چاہی مگر عین وقت پر سفید چیتے کی کھال اوڑھے سردار نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ جنگلی کے پیر کی شدید ٹھوک میرے سر پر لگی آنکھوں میں چھائی دھند میں اذیتوں کے رنگ سے کم گئے۔ دھند چھٹنے لگی اور اس میں سے سیاہ بادل نمودار ہونے لگے پھر دیکھتے ہی دیکھتے میری بصارت سیاہ چادر سی تن لگی مجھے کچھ ہوش نہیں تھی میں کہاں ہوں۔ اس زمین پر ہوں یا آسمان کی بے کراں وسعتوں میں بکھر گیا ہوں۔ پھر ایک دم اچانک سیاہ چادر نگاہوں سے ہٹ گئی اور گہری دھند نے ہ استقبال کیا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور نہ کھلنے کے برابر تھیں۔ میرا رخ سیدھا آسمان کی طرف میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر کسی درخت کی موٹی شاخ سے بندھے ہوئے تھے اور اس شاخ کے دونوں سروں پر دو جنگلی تھے جو اس شاخ کو تھامے ہوئے چلے جا رہے تھے ان کے ہر ہر قدم پر ہلکا بری طرح ہلتی تھی اور میرے ٹخنے اور ہاتھوں میں درد کی لہریں دوڑ جاتی تھیں۔

میرے زخموں پر کچھ پتے دوا کی صورت بندھے ہوئے تھے ان زخموں سے بھی ٹیسس اٹھ رہی تھیں اس منظر کے بعد میری آنکھوں میں سیاہ چادر پھرتی گئی اس اندھیرے اجالے کی آنکھ چوٹی دن تک چلتی رہی۔

اس وقت کی یاد کچھ بے ربط سے مناظر پر مشتمل ہے۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، کبھی روٹی، اندھیرا کبھی بارش کبھی دھوپ، کبھی میں خود کو ایک اندھیرے غار کے اندر لیٹا ہوا پاتا۔ کبھی کسی نیلے ساتھ ٹپک لگائے ہوئے، کبھی میرے منہ میں دوا اندلی جا رہی ہوتی تو کبھی میرے جسم پر پتے لگے جا رہے ہوتے تھے۔ یہ بات اچھی طرح میرے ذہن میں تھی کہ ہم لوگ مسلسل سفر میں تھے۔

وہ سہ مراد باقی جنگلی تھے۔ یہ پورا قافلہ حالت سفر میں تھا اور جنگلی مجھ بد نصیب کو پتا نہیں کیوں ہاتھ ساتھ اٹھائے پھر رہے تھے؟ میں نے ان کے درجن کے قریب ساتھی ہلاک کئے تھے۔ وہ چاہتے تھے اسی وقت ہلاک کر دیتے جب میں ان کی گرفت میں آیا تھا مگر نہ صرف یہ کہ انہوں نے مجھے بال نہیں کیا تھا بلکہ مجھے اٹھائے پھر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ میرا علاج بھی کر رہے تھے۔

رہ رہ کے میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم جاتا تھا جب سردار نے ہاتھ کے اشارے سے تلوار میرے سینے میں اتارنے والے جنگلی کو منع کر دیا تھا۔ موت مجھ سے دونٹ کے فاصلے سے ہو کر گزر گئی تھی۔ یہ پتا نہیں کس دن کی بات تھی بادل صاف ہو گئے تھے اور آسمان پر سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہر طرف گیلے سبزے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کسی قریبی درخت سے کوئی پرندہ باراگ الاپ رہا تھا۔ میں نیم جان سا ایک درخت کی چھاؤں تلے لیٹا تھا۔ میرے حلق میں سخت لگی دواؤں کی کڑواہٹ کھلی ہوئی تھی۔ دھیمی دھیمی چلتی ہوا سے پتوں پر ٹھہرا بارش کا پانی قطرہ قطرہ میں پر گزر رہا تھا، میں نے اٹھنا چاہا تو ایک ٹیس سی داہنے پہلو میں جاگ اٹھی۔ میں لیٹا کا لیٹا ہی رہ گیا۔ مجھے یاد آیا داہنے طرف پیٹ کے قریب مجھے گہرا زخم آیا تھا۔ بے بسی میں میری آنکھوں سے آنسو اگلے ہوئے۔ میرے منہ سے بے اختیار دلہلہ دواؤں کی لہر نکلتی تھی۔

جس جگہ میں لیٹا تھا اس سے کچھ فاصلے پر جنگلیوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ سالم رینچ کو کھال میت آگ بے بھونا جا رہا تھا، مجھے اپنے جسم پر چوئیاں سی رنگتی محسوس ہوئیں۔ میں نے ایک بار ہلکے سے کوشش کی مگر ناکام ہو گیا۔ پڑاؤ کے آس پاس بہت چھل پھل نظر آرہی تھی ایک جنگلی ڈھول کی طرح کی کوئی چیز پیٹ رہا تھا اور دوسرے جنگلی دیوانہ وار اس پر رقص کر رہے تھے۔

وہ بڑا بڑا جوش اور ہيجان آمیز رقص تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں میچ لیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں رینا کی تلاش میں نکلا تھا اور مجھ پر ایک قیامت آ کر گزر گئی تھی۔ جنگلیوں کا ہمارے پڑاؤ پر حملہ رینا کی کشدگی، میرا رینا کی تلاش میں نکلتا، جنگلی کو بے ہوش کرنا اور پھر جنگلیوں کے عظیم لشکر کا میرے پیچھے لگ جانا۔ میرا شدید زخمی ہونا سب کچھ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

رابعا! تم بہت بری ہو..... اچانک میرے ذہن میں آواز ابھری۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا رابعی وجہ سے ہی ہو رہا تھا۔ رابعی کی محبت ہی مجھے ان مہیب جنگلوں میں گھسیٹ لائی تھی موت اور مشکل حالات سے میں نے ڈرنا نہیں سیکھا تھا۔

میرے ساتھ جیسے بھی حالات پیش آتے مجھے کچھ پروا نہیں تھی مگر دکھ صرف اس بات کا تھا کہ

راہ میرے پیار کو سمجھ نہیں رہی تھی جس کے لئے میں سب مصائب کاٹ رہا تھا اسے میری ذرا برا پرواہ نہیں تھی۔ میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک مجھے اپنے قریب سے بہت ناگوار بو آئی میں نے آنکھیں کھولیں تو دنگ رہ گیا۔ ایک جنگلی نے میرے آگے بھنے ہوئے رپچھ کے گوشت کا ٹکڑا پھینکا اور اپنی زبان میں تلخ لہجے میں بولا۔ ”دیوتاؤں کے دشمن! جلدی جلدی یہ کھانا منہم کرو اور صحر مند ہو جاؤ۔ منزل پے پہنچنے سے پہلے تمہارا تندرست ہونا بہت ضروری ہے۔ دیوتاؤں کے میلے میں تمہیں تمام دکھوں سے نجات ملنے والی ہے۔“ بات ختم کرنے کے بعد جس مٹی خیز انداز میں جنگلی مسکرا رہا تھا اس نے میری دھڑکنوں میں بے چینی بھر دی تھی جنگلی مسکراتا ہوا وہاں سے واپس ہوا تو میں آدھ بھنا گوشت کا بدبودار ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ کر پرے پھینک دیا۔

میں نے کہنیوں کے بل گھسٹتے ہوئے اپنا سر درخت کے تنے سے ٹکایا۔ ابھی میں سیدھا گم نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک جنگلی ایک طرف سے دندنا ہوا برآمد ہوا اس نے اپنے پاؤں کی زوردار ٹھوک میری پسلیوں میں رسید کی اور غراتے ہوئے بولا۔ ”یہ گوشت تم نے کھایا کیوں نہیں؟“ مجھ اس کی یہ بات سمجھ میں آگئی میں آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ گوشت میں سے سخت بدبو آرہی ہے میں یہ گوشت نہیں کھا سکتا۔ پتا نہیں اسے میری پوری بات سمجھ میں آئی یا نہیں آئی اس نے غراتے ہوئے گوشت کا ٹکڑا اٹھا اور میرے منہ میں ٹھونسنے لگا اس کی ناقابل برداشت بو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ مجھے ابکاٹی آ گئی میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی تھام لی۔ میرا کلائی تھامنا میرے لئے مصیبت بن گیا۔ جنگ نے گوشت کا ٹکڑا پرے پھینکا اور مجھ پر پل پڑا وہ بے دردی سے مجھے پیٹنے لگا۔ چہرہ بچانے کیلئے میں نے ہاتھ آگے کر لئے۔ اس سے پہلے کہ میرے جسم پے کوئی نیاز ختم نمودار ہو جاتا پڑاؤ کی طرف سے ایک بوڑھا جنگلی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے مجھ پر تشدد کرنے والے جنگلی کو بمشکل مجھ سے دور ہٹایا۔ میری ناک سے خون بہنے لگا تھا دائیں ابرو پر بھی ہلکا سا کٹ لگا تھا جس سے معمولی خون رسنے لگا تھا۔ بوڑھا جنگلی اپنے نوجوان ساتھی کو کھینچتا ہوا پڑاؤ کی طرف لے گیا۔ چند منٹ گزرنے کے بعد بوڑھا جنگلی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گول مٹول تر بوڑ کی شکل کے جنگلی پھل موجود تھے اس نے تر بوڑ نما پھل میرے پاس رکھے اور بڑی محبت سے میری گردن کے پیچھے سے ہاتھ ڈال کر میری ٹیکہ درخت کے تنے کے ساتھ لگوادی۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ وہ مقامی زبان میں بڑی محبت سے بولا۔

اس کا محبت بھرا لہجہ مجھے جھلستے ہوئے ریگستان میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی مانند لگا۔ میں بھیکے لہجے میں بولا۔ ”آپ لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟“

”اونچے پہاڑوں کے درمیان دیوتاؤں کا میلہ ہو رہا ہے ہم سب وہاں جا رہے ہیں۔“ بوڑھا جنگلی چونکہ آہستہ آہستہ بات کرتا تھا اس لئے مجھے سمجھنے میں دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد بوڑھا جنگلی سورج کی روشنی سے چمکتے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بہت تعجب ہوا اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ”تمہیں صرف اس لئے ابھی تک زندہ رکھا گیا ہے..... کہ“ بوڑھے جنگلی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا میں بے چینی سے ہاتھوں کے بل تھوڑا سا اوپر ہو کر بولا۔ ”آپ خاموش کیوں ہو گئے؟“

”تمہیں برب کے میلے میں پہنچنے کے دوسرے دن ہی بڑے دیوتا کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر تمہارے لہو سے دیوتا کو غسل دیا جائے گا۔“

بوڑھے جنگلی کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ گویا ان جنگلیوں نے ابھی تک مجھے اس لئے ختم نہیں کیا تھا کہ وہ میرے لہو سے اپنے دیوتا کو غسل دینا چاہتے تھے۔

میرے اندر بڑی سختی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ دل دماغ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ میرے قدم لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے تھے میں رینا کی تلاش میں آیا تھا مگر رینا کا پتا دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

بوڑھے جنگلی نے مجھے مغموں دیکھ کر ادھر ادھر دیکھا اور قدرے میرے قریب ہوتے ہوئے دلا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”علی نواز“ میں آہستہ سے بولا۔

”ایلی نیوز۔“ وہ میرے نام کو بگاڑ کے بولا۔ ”ایلی نیوز میرا نام ناکو ہے۔ مجھے تم اپنا ہمدرد سمجھتے ہو۔ میں تمہیں اس مصیبت سے نکالنا چاہتا ہوں۔“ بوڑھا جنگلی چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا اور اُسے بے چینی سے پہلو بدل کے بولا۔ ”مگر..... مجھے لگتا ہے میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاؤں گا۔ میں تمہیں تندرست ہونے کے بعد یہاں سے بھاگ بھی دوں تو تم ان کی پہنچ سے نکل نہیں سکو گے۔ یہ تمہیں..... ذبح کر کے ہی چھوڑیں گے۔“ جنگلی بوڑھا اپنا فقرہ مکمل کرنے کے بعد کسی گہری دھماکے میں ڈوب گیا پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اس کی آنکھوں میں ایک دم سے عجیب سی چمک نمودار ہوئی تھی۔ وہ بے چینی سے میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ ”نوجوان! تم فکر

مت کرو میں تمہیں اتنی جلدی مرنے نہیں دوں گا..... اتنی جلدی.....“ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ پڑا اور پڑاؤ طرف ہولیا میں حیرت سے اس کو جاتے دیکھتا رہ گیا۔

یہ کیسا عجیب گورکھ دھندا تھا جس میں، میں پھنس گیا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھے پکڑ والے جنگلی آدم خور نہیں تھے ان میں جسم پر بکثرت بال رکھے والے جنگلی بھی موجود تھے اور بغیر بال کے سوکھے چمڑے والے جنگلی بھی موجود تھے مگر کسی میں ایسی خصلت موجود نہیں تھی کہ وہ انسان گوشت کھاتے ہوں۔

آدم خور جنگلیوں والی بات کہانیوں اور کہادوتوں تک تو ٹھیک ہے۔ حقیقت میں ایسا کچھ ہے؟ میں میرے خیال میں کوئی صداقت نہیں مجھے ان جنگلیوں کے ساتھ چلتے نامعلوم کتنے دن ہو گئے تھے جنگلی میں، میں نے ایسے آثار نہیں دیکھے تھے کہ اس نے آدم خور نظروں سے میری طرف دیکھا ہو۔

بوڑھا جنگلی کب کا پڑاؤ کی طرف جا چکا تھا مگر میں ابھی تک سوچوں میں غلطاں تھا یہ بوڑھا جنگلی کون ہے اور مجھ سے اس قدر ہمدردی کیوں جتا رہا ہے؟ اس کو مجھ سے کیا غرض ہو سکتی ہے؟ نے ایک درجن کے قریب ان کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا اس کا رویہ بھی مجھ سے دوسرے جنگلیوں طرح معاندانہ ہونا چاہیے تھا مگر اس نے کہا تھا میں تمہارا ہمدرد ہوں اور تمہیں اس مصیبت سے نکلنا چاہتا ہوں۔

مصیبت کا لفظ ذہن میں آتے ہی میرا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے چلنے لگا۔ مجھے زندگی اور والے گھیسٹ کر مجھے موت کی بے رحم وادی میں لئے جا رہے تھے۔

میرے جسم میں ابھی اتنی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ میں کوئی غیر معمولی قدم اٹھا سکتا یا۔ بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچ سکتا۔ امید کی واحد کرن بوڑھے جنگلی کی صورت تھی جس نے اپنا نام بتایا تھا۔ تو کیا نا کو مجھے اس خونی بھنور سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں، میں دھنستا ہوا جا رہا تھا۔

رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا۔ پڑاؤ میں جا بجا مشعلیں روشن ہو گئی تھیں۔ دو جنگلیوں۔ مجھے گھیسٹ کر ایک نیلے کی اوٹ میں کر دیا تھا جس جگہ پڑاؤ والا گیا تھا وہاں ہر طرف چھوٹے بڑے نیلے موجود تھے نیلوں کی کچی طرف چھوٹے چھوٹے غار سے بن گئے تھے جنگلی جا بجا غاروں اور نیلا پر لیٹے ہوئے تھے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جلتی مشعلیں بجھادی گئی تھیں اکا دکا مشعل روشن تھی۔ نیند پر

آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک نیلوں سے پرلی طرف کسی کے دوڑنے اور پھر چلانے کی آواز آئی۔ پھر ایک بہت سی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جنگلی آپس میں بھڑ گئے ہوں پھر آنا فانا سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ دو جنگلی تھے جو نیلے سے چھلا گئیں لگا کر نیچے اتر آئے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر تھے اور وہ ایک دوسرے کو مرنے مارنے کے لئے بالکل تیار دیکھتے تھے۔

ایک جنگلی نے خونخوار انداز میں دوسرے پر حملہ کیا اس نے جھکائی دے کر اس کا وار پچایا اور سر کی بھر پور ٹکراؤ کے چہرے پے دے ماری۔ یہ سب کچھ مجھ سے چند قدموں کی دوری پر ہو رہا تھا۔ دونوں جنگلی لڑتے لڑتے خون میں نہا گئے اتنے میں سوئے ہوئے تمام جنگلی بیدار ہو چکے تھے۔ اچانک ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ لڑتے ہوئے دونوں جنگلیوں میں سے ایک میری طرف بڑے خونخوار انداز میں بڑھا مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس جنگلی نے اچانک خنجر کا ایک بھر پور وار میرے چہرے پے کیا عین وقت پر اس سے لڑنے والے دوسرے جنگلی نے اس کا خنجر والا ہاتھ تھام لیا۔ اب پوزیشن کچھ یوں تھی کہ ایک جنگلی مجھ پر حملہ کرنا چاہ رہا تھا جبکہ دوسرا میرے بچاؤ کے لئے ڈھال بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا آخر کار میری حفاظت کرنے والے جنگلی نے دوسرے کو زور دار دھکا دیا وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

پھر ایک دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں کی لڑائی عروج پر پہنچ گئی۔ اتنے میں ایک طرف سے چپے کی کھال اوڑھے جنگلیوں کا سردار نمودار ہوا اس کے تیور چڑھے ہوئے تھے اور وہ خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ سردار نے آگے بڑھ کر لڑنے والے دونوں جنگلیوں کو کندھے سے پکڑ کر علیحدہ علیحدہ کیا اور غصیل آواز میں ان سے بات چیت کرنے لگا۔ دونوں جنگلی بھی بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر الزام زائی کرنے لگے ان کی جو باتیں مجھے سمجھ آئیں انہوں نے میرے خون کی حدت کو عروج پر پہنچا دیا۔

ان دونوں کے بیچ لڑائی اس بات پر ہو رہی تھی وہ ایک جنگلی مجھے جان سے مارنا چاہتا تھا جبکہ دوسرے کا کہنا تھا کہ اسے دیوتا کے قدموں میں قربان کرنا ہے اس کو یہیں قتل کرنا ٹھیک نہیں اس بات پر دونوں ٹکرائے تھے۔

میرے قتل کا منصوبہ بنانے والے جنگلی کے دو بھائی اور چچا میرے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے اور اس کا کہنا تھا کہ وہ ابھی اسی جگہ مجھے قتل کر کے حساب برابر کرے گا۔ سردار اس سے بات چیت کر رہا تھا جبکہ وہ جنگلی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا اور تکرار کئے چلا جا رہا تھا۔ پھر اچانک ایک منظر نے سب کی

خیر جنگیوں کا معرکہ ایک گھنٹے تک جاری رہا پھر ایک ٹولہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ میری خوش فہمی کہ بھاگنے والا ٹولہ میرے فوری قتل کا متنی تھا۔ اس ٹولے کے بھاگنے سے جیسے میری زندگی کے دن کچھ اور بڑھ گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی سردار روبان کے ٹولے کے ساتھ سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ اب یہ سفر مختلف طرح کا تھا۔ میری حفاظت پر چھ عدد جنگلی مامور تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں عریاں تلواریں سونت رکھی تھیں اور وہ مخصوص آوازیں نکالتے چلے جا رہے تھے۔ ٹولے کی رفتار پہلے سے بہت تیز تھی۔ یہ مشکل سفر تقریباً مزید پندرہ دن تک جاری رہا راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

یہ سولہویں روز کی بات تھی۔ آسمان کے نیلے نمل پر سورج کا تھال اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ایک بڑے پہاڑ کا کلاوا کاٹ کر ہم لوگ ایک وادی میں داخل ہو گئے پہاڑ کی ڈھلوان سے اترتے ہوئے ایک عظیم الشان منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

ان پندرہ دنوں میں میرے زخم بھر گئے تھے اور میں نے اپنے پیروں پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ وادی میں ہر سوسر ہی سر نظر آرہے تھے۔ وہ سب جنگلی تھے جو اپنے دیوتا کے درشن کرنے اس وادی میں اترے تھے۔ میدان میں ٹیلوں پر پہاڑ کی ڈھلوانوں اور رستوں پر ہر جگہ جنگلی ہی جنگلی تھے۔ جنگلی عورتیں بھی آدمیوں کے ساتھ شانہ بشانہ شریک تھیں۔ یہاں پہنچ کر میں نے پہلی دفعہ جنگلی عورت دیکھی تھی۔ جنگلی عورتوں نے سر کے بالوں کی مینڈھیاں بنا رکھی تھیں اور ان کے سروں پر جنگلی تیتڑ کے پروں کا تاج دھرا رہتا تھا۔ جب سے میں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔ سردار روبان نے میرے ساتھ ایک جنگلی لگا دیا تھا جو ہر وقت مجھ سے چپکار رہتا تھا۔

جنگلیوں کے اس مصنوعی شہر کو آباد کرنے کے لئے جنگلی جھاڑ جھکار سے تقریباً پانچ سو کے قریب ہٹ بنائے گئے تھے۔ ہر ہٹ دس سے پندرہ آدمیوں کو اپنے اندر سمو سکتا تھا۔ میری حفاظت پر متعین جنگلی مجھے ایک ہٹ میں لے گیا۔ ہٹ کی چار دیواری سے بھی سورج کی کرنیں جھن جھن کر اندر آتی تھیں۔ اس نے مجھے لینے کا مشورہ دیا اور خود باہر نکل گیا جب سے میں نے چلنا پھرنا شروع کیا تھا میں نے غور کیا تھا کہ میری پہلے سے بھی زیادہ آؤ بھگت شروع ہو گئی تھی۔ مجھے میری مرضی کے مطابق کھانا اور پھل دیا جا رہا تھا۔ میں ہر دن پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اب بھی میں ہٹ میں لینا ہوا تھا اور میری حفاظت پر مامور جنگلی باہر نکل گیا تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے کھانے کے لئے کچھ لینے گیا ہے۔

ابھی میں ٹیک لگا کر سیدھا ہی ہو رہا تھا کہ ایک جنگلی نوخیز لڑکی دندناتی ہوئی ہٹ میں گھس آئی۔

آنکھیں پتھر ا دیں۔ سردار نے اپنی وزنی تلوار نکالی اور تکرار کرنے والے جنگلی کے سینے سے آر پار دی۔ اس منظر کو دیکھنے والے جنگلیوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے چہرے سے نکلے جا رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے پڑاؤ میں ہلچل پیدا ہوئی اور جنگلیوں کا ٹولہ حصوں میں منقسم ہو گیا۔

ایک طرف مرنے والے جنگلی کے حامی تھے تو دوسری طرف سردار کے حامی..... مرنے والے جنگلی کے حامی تندو تیز آواز میں نعرے بازی کر رہے تھے۔ اشتعال ان کے چہروں سے ٹپک رہا تھا۔ برہمی ان کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چند لمحوں میں یہاں بڑا خون ریز معرکہ ہونا والا ہے۔ نیزوں کی ایناں شعلوں کی مدہم روشنی میں چمک رہی تھیں۔

میں نے مدہم روشنی میں دیکھا سردار مخالف پارٹی کی قیادت کرنے والا وہی جنگلی تھا جس نے میرے پیٹ میں تلوار اتارنا چاہی تھی اور آخری وقت پر سردار کے حکم سے اس نے تلوار واپس کھینچ لی تھی اور پاؤں کی زور دار ٹھوک میرے سر میں رسید کی تھی جس کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

اچانک ایک طرف سے آواز ابھری سردار روبان! تم نے "راکو" کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ ہمیں سے یہ امید نہیں تھی اب اس کا صرف ایک ہی مداوا ہے کہ تو اس باہر کی دنیا کے آدمی کو ہمارے حوالے کر دے یا ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ بات کرنے والا وہی مخالف ٹولے کی قیادت کرنے والا جنگلی تھا اس کا نام حزیر تھا۔

"حزیر! مجھے تیری کوئی شرط منظور نہیں، یہ قیدی دیوتاؤں کے قدموں میں ہی قربان ہوگا اگر برب پہنچنے سے پہلے اسے کوئی نقصان پہنچا تو اس کے ذمے دار تم ہو گے۔"

"سردار روبان! برب پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے اس بات کا فیصلہ ابھی اور اسی جگہ ہوگا....." حزیر کے فقرہ ادا ہونے کی دیر تھی دونوں ٹولے آپس میں ٹکرائے وہ سب جنگلی لوگ تھے بوجہ نام کی کوئی چیز ان میں نہیں تھی۔ تلواریں تکرار ہی تھیں غرائیں اور لالکارے بلند ہو رہے تھے اس نے اندھیری جگہ پر میدان کا راز گرم ہو چکا تھا۔

میں ہاتھوں کے بل گھسٹتا پیچھے ہی پیچھے ہٹنے لگا۔ میں ایک بڑے پتھر کا کلاوا کاٹتے ہوئے ان کے پیچھے چھپ گیا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ پتھر کی جڑ میں ایک مڈی اپنا راگ الاپ رہی تھی کتنی خفا قسمت تھی وہ..... اسے کسی بات کا خوف کسی بات کا غم نہیں تھا اور میری طرح اس کا جسم زخمی بھی نہ تھا۔ وہ چل اور بھاگ سکتی تھی..... کسی پتھر کے باریک سوراخ میں گھس کے اپنا دفاع بھی کر سکتی تھی۔

”یہ رواؤد کون ہے؟“

”تمام جنگلی قبیلوں کا سردار..... اس کا قانون ہی یہاں چلتا ہے۔“

”تم مجھے اس لڑکی کے پاس لے کر جاسکتی ہو.....“

جنگلی لڑکی نے کچھ لمحے سوچا پھر بولی۔ ”رات کو جب دیوتا کی پوجا شروع ہوگی تو سب لوگ بڑے دیوتا کے سامنے ناچیں گے اس وقت وہ لڑکی اکیلی بٹ میں ہوگی میں تمہیں وہاں لے چلوں گی۔“

”یہ بٹ کیا چیز ہے؟“

میرا سوال سن کر وہ مسکرا دی اس کی مسکراہٹ گنگنا تے پہاڑی چشموں کی سی تھی۔ ”تمہیں بٹ کے بارے میں نہیں معلوم.....؟“

میرا جواب نفی میں پا کر وہ بولی۔ ”جس جگہ بے تم بیٹھے ہوئے ہوا سے بٹ کہتے ہیں۔ خیر تم تو ادھر کے نہیں ہو تمہیں کیا معلوم بٹ کیا ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تم بھی باہر کی دنیا سے اس لڑکی کی شادی میں شریک ہونے آئے ہو۔“

”..... شادی..... میں؟“ میں حیرت آمیز سوالیہ لہجے میں بولا۔

”ہاں برب کے ملے کے بعد اس لڑکی کی شادی سردار رواؤد سے ہو جائے گی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں زیر لب بڑا بڑاتے ہوئے اندر ہی اندر چیخ و تاب کھا کر رہ گیا۔ میں جب سے اس ہٹ میں آکر لیٹا تھا یہ لڑکی حیرت انگیز انکشاف کرتی چلی جا رہی تھی۔

اچانک میرے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن پھوٹی۔ ہو سکتا تھا جسے میں ریٹا سمجھ بیٹھا تھا وہ کوئی اور لڑکی ہو خیر یہ تو اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی پتا چل سکتا تھا۔

جنگلی لڑکی نے واپس جاتے ہوئے اپنا نام ساسا بتایا تھا وہ بڑی خوش باش لڑکی تھی۔ وہ منگتی ہوئی ہٹ سے باہر نکلی تو میری حفاظت پر مامور جنگلی اندر چلا آیا اس کے ایک ہاتھ میں خشک گوشت اور ”دوسرے میں جنگلی پھلوں سے بھرا ٹوکرا تھا۔ وہ میرے سامنے پھینکتے ہوئے بولا۔ ”کھاؤ۔“ وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ بھوک تو مجھے پہلے سے لگی ہوئی تھی میں نے گوشت پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا میں نے غور کیا تھا جب سے میں گوشت کھا رہا تھا میرے زخم بھی بھر گئے تھے اور میں خود کو پہلے سے تو اتنا محسوس کرتا تھا۔ گوشت اور پھل ہی میری روزانہ کی خوراک تھی۔

میں گوشت اور پھل کھا کر بے خبر سو رہا موت کی تلوار میرے سر پر لٹک رہی تھی مگر میں دنیا جہاں سے بے خبر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ رات کا نہ جانے پہلا پہر تھا یا دوسرا، میرے

میں نسبتاً اندھیرے کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس لئے شاید اسے میری موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ دھم سے ایک کونے میں ڈھسے گئی اور آنکھیں بند کر کے منہ میں کچھ بدبانے لگی۔ اس کی لمبی صراحی دار گردن میں ہاتھی دانت کے موتیوں کی مالا جھول رہی تھی۔ اس نے بالوں کی مینڈھیوں میں گلاب کا ایک کالا پھول ٹہنی سمیت اڑس رکھا تھا۔ اس کا رخ مجھ سے مخالف سمت تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ گنگنا رہی تھی اور لہک رہی تھی پھر اچانک اس نے اپنا رخ پھیرا اور میری طرف لپکا۔ میں اس سے چند گز کی دوری پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا رخ میری طرف تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر یکایک اس نے آنکھیں کھول لیں اور میری آنکھیں آپوں آپ ہی بند ہو گئیں۔ مجھے سہمی ہوئی ہلکی سی چیخ سنائی دی مگر میں نے آنکھیں نہیں کھولیں چند لمحے خاموشی کے گزر گئے پھر اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے جھپ سے آنکھیں کھول دیں۔ و حیرت کی صورت بنی بڑے غور سے مجھے نکلے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس آمیز حیرت مجسم کر رہی تھی۔

”تم کون ہو؟.....“ اس کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

میں نے اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ مجھ سے یہی سوال کیا میرا آنکھوں میں نمی لہرا گئی میں صرف اتنا کہہ سکا۔ ”موت کا منتظر.....“

میری بات شاید اسے سمجھ نہیں آئی وہ میرے مزید قریب ہو کر بولی۔

”وہ لڑکی تمہاری ساتھی ہے؟“

جھماکا سا ہوا اور میری رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ گئی میں تیزی سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ لڑکی کے سوال نے بہت سے سوالات میرے ذہن میں ابھار دیئے تھے میں بے چینی سے سیدھا ہو کر بولا۔ ”کس لڑکی کی بات کر رہی ہو تم.....؟“

”وہی لڑکی جس سے تمہارے جیسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔“

ریتا نے گمشدگی سے پہلے شکاری لباس پہن رکھا تھا اور میں بھی اس وقت شکاری لباس زیب تن کئے ہوئے تھا تو کیا ریتا یہیں کہیں میرے آس پاس ہی موجود تھی۔

”جس لڑکی کا تم ذکر کر رہی ہو وہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں جنگلی لڑکی کے ذرا قریب ہو کر

بولا۔ ”وہ ٹھنک کر تھوڑا پرے ہٹ گئی۔“

”وہ اس وقت رواؤد کے پاس ہے.....“

کان کے پاس کوئی سرگوشی گونجی اور کسی نے جھجھوڑ کر مجھے اٹھانا چاہا۔ میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساسا میرے قریب بیٹھی مجھے اٹھانے میں مشغول تھی۔

”کیا بات ہے ساسا؟“ میری بوجھل آواز ابھری۔

”چلو جلدی اٹھو تم نے لڑکی سے ملنے کا ذکر کیا تھا ناں..... میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“ ساسا کی بات سن کر میں اپنی جگہ سے اٹھا پھرا چانک میرا چہرہ اتر گیا میں ساسا کے ساتھ کیسے جاسکتا تھا ہر میری رکھوالی کے لئے جنگلی جو موجود تھا۔

میں نے اپنا مطیع نظر اس کے سامنے پیش کیا تو وہ مسکرا دی۔ وہی گنگناتے پہاڑی چشموں کی سی ہنسی ہنس کر وہ بولی۔ ”میں اسے بڑے دیوتا کی طرف رخصت کر چکی ہوں تمہاری رکھوالی کی ذمہ داری میں نے سنبھال لی ہے۔“

”چلو اب جلدی کرو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بولی۔

ایک لہری میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ مجھے بے طرح رابعہ یاد آگئی وہ اس وقت کس حال میں تھی مجھے کچھ خبر نہیں تھی ہو سکتا تھا تمام لوگ زمبابوے واپس لوٹ گئے ہوں۔ سارے نہ لوٹے ہوں انکل اور رابعہ ہی واپس چلے گئے ہوں۔ مگر پھر مجھے خیال آیا وہ واپس کیسے جاسکتے تھے وہ تو ایک طرح سے کھلی قید میں تھے جم کیٹی، شاہنواز اور گوگی کی کنون انہیں گھیرے ہوئے تھی مجھے تو اس کنون کو توڑنا تھا۔

ساسا کے ہمراہ جب میں ہٹ سے باہر نکلا تو عجیب سا بندھا ہوا تھا ہر طرف مشعلیں ہی مشعلیں نظر آرہی تھیں وہ مشعلیں گردش کر رہی تھیں اور کچھ مشعلیں عجیب رخ پر رقص کر رہی تھیں۔ ایک پڑھول گونج تھی جو جنگلوں کے منہ سے بلند ہو رہی تھی۔ دوری کے سبب مجھے دیوتا یا اس کا عکس نظر نہیں آ رہا تھا بس نیم برہنہ جسم تھے اور مشعلوں کی روشنیاں تھیں نو جوان لڑکیاں مختصر لباس پہنے دیوانہ وار ناچ رہی تھیں۔ ساسا مجھے لیتی ہوئی ایک طرف کو چل پڑی یہاں ایک لائن میں ہٹ دور تک چلے گئے تھے۔ دوسری طرف بھی اسی طرح کی لائنیں تھیں۔ ساسا کئی موڑ مڑتی ہوئی ایک ہٹ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ ہٹ دوسروں سے بالکل مختلف تھا اسے درختوں کے تنوں کو تراش کے بڑی خوبصورتی سے کھڑا کیا گیا تھا۔ میں ساسا کے ساتھ اندر داخلہ ہوا تو ایک مسحوری خوشبو نے میرا استقبال کیا میرا دل بہت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ابھی جس چہرے کا میں دیدار کرنے والا تھا وہ رینا بھی ہو سکتی تھی۔ ہٹ کو اندر سے بھی بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کوئی لڑکی بھی ہٹ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا۔

اچانک پڑے کی اوٹ سے ایک لڑکی برآمد ہوئی میں نے سرتا پاتا سے دیکھا جو لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی وہ رینا نہیں تھی اس نے جنگلوں جیسا لباس پہن رکھا تھا بالوں کی مینڈھیاں اس کے چہرے پر اور دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ اس کے دونوں کان چار چار جگہ سے چھدے ہوئے تھے آنکھوں میں گہرا سرمہ اور ہونٹوں بے اخروٹ کے درخت کے چھلکے کی سرخی تھی۔

”ساسا! تم اسی لڑکی کی بات کر رہی تھی ناں.....؟“ میں نے کہا۔

”ہاں..... یہی ہے وہ لڑکی.....“ ساسا آہستہ آہستہ اس لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ مجھے ایک طرح سے خوشی بھی ہو رہی تھی اور ایک طرف غم نے بھی میرے من کے اندر ڈیرے ڈال لئے تھے، خوشی تو اس بات کی تھی کہ جس لڑکی کی شادی سردار سے ہونے والی تھی وہ رینا نہیں ہے اور غم اس بات کا تھا کہ رینا اگر یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں چلی گئی کہیں خدا نخواستہ اسے قتل نہ کر دیا گیا ہو۔

”میں نے ساسا سے کہا کہ چلو یہاں سے.....“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”تم اس لڑکی کو نہیں پہچانتے؟“

”نہیں میں اسے نہیں جانتا۔“ میں چہرہ دوسری طرف موڑ کے بولا۔

ساسا کے چہرے بے عجیب طرح کی اضطرابی کیفیت تھی وہ کچھ کہتا پچھتا رہی تھی مگر کہہ نہیں پاری تھی میں نے اپنا رخ باہر کی طرف موڑا اور چل دیا ابھی میں نے چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا وہ آواز رینا کی آواز تھی میں نے بجلی کی سی تیزی سے مڑ کر پیچھے دیکھا کرے میں اس لڑکی اور ساسا کے علاوہ کوئی نہیں تھا میں سوچ میں ڈوب گیا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ میرا وہم ہے یا حقیقت ہے۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آواز پھر ابھری اور اب اس آواز نے مجھے میرے نام سے پکارا۔

”علی نواز! اپنی بہن کو بھول گئے.....“ میں نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جس سے ملانے کے لئے مجھے ساسا لے کر آئی تھی۔ اچانک جھماکا سا ہوا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا چند قدموں کی دوری پر جو لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی وہ رینا ہی تھی۔ اس کے عجیب و غریب حلقے نے اس کی شکل کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔

میری بہن چند قدموں کی دوری پر کھڑی آنسوؤں کے نوے پڑھ رہی تھی۔ میں بڑی تیزی سے اس کی جانب لپکا اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا ہا ہٹ ہوئی اور بہت سے قدم ہٹ کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ رینا کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ ساسا

نکیلے اور چمکتے ہوئے نیزے بھالے میرا وجود ادھیڑ دیتے۔

ایک جنگلی قہرناک انداز میں کلباڑا بلند کرتے ہوئے میری طرف بڑھا اس کی غراہٹ کھولتے ہوئے پانی کے مشابہ تھی اس سے پہلے کہ اس کا طوفانی وار میرے سر کے دو ٹکڑے کر دیتا، رینا بلند آواز میں چیختے ہوئے میرے اور اس حملہ آور کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ننھے پھولے ہوئے تھے اور آنکھیں جوش کے مارے سرخ ہو رہی تھیں اس کے ہاتھ دونوں طرف کواٹھے ہوئے تھے۔

”خبردار اس سے پیچھے ہٹ جاؤ۔“ وہ جنگلیوں کو مجھ سے پرے ہٹا رہی تھی۔

”ہم اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ لمبا ترنگا جنگلی غرایا۔ ”اس نے سردار کے ہٹ میں گھس کر ناقابل معافی جرم کیا ہے۔“

”اگر تم نے اسے مار دیا تو سردار تمہیں مار ڈالے گا۔“ رینا چیختے ہوئے بولی۔

”وہ ہمیں کیوں کچھ کہے گا؟“

”اسے بڑے دیوتا کے آگے قربان کرنا ہے۔ قربانی سے پہلے اگر اسے کچھ ہو گیا تو سردار تم سب کو زندہ جلادے گا سمجھے تم سب!“

رینا کی بات ختم ہوتے ہی کمرے میں سناٹا چھا گیا اٹھی ہوئی تلواریں بھٹک گئیں بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہو گئے۔

لمبا ترنگا جنگلی کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر بے رحمی سے میرا بازو دو بوجا اور تقریباً مجھے گھینٹتے ہوئے باہر کولے گیا اس کے گماشتے بھی اس کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ مختلف موڑ مڑتے ہوئے وہ ایک ہٹ کے سامنے پہنچا یہ وہی ہٹ تھا جہاں سے کچھ دیر پہلے ساسا مجھے اٹھا کر لے گئی تھی۔

لمبے ترنگے جنگلی نے مجھے ایک زوردار دھکا دیا میں الٹ کر ہٹ کے اندرونی جانب گرا۔ دو نیزہ بردار پہرے دار کھڑے کر کے جنگلی خونخوار نظروں سے مجھے گھورتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں گم صم سالیٹا چند منٹ پہلے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا جو کچھ میں نے دیکھا تھا کتنا عجیب اور ناممکن سا تھا۔ رینا جنگلی روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی جب میں نے اس سے پہلے آخری بار اسے دیکھا تھا تو وہ تب پریشانی کے عالم میں ایک طرف کو بھاگ رہی تھی جب جنگلیوں نے ہمارے پڑاؤ پر شب خون مارا تھا انہوں نے ہمارے پڑاؤ پر اتنا خوفناک حملہ کیا تھا

کی بھی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں ساسا بڑی تیزی سے ہماری جانب لپکی وہ جیسے مجھ کو کہیں چھپانا چاہتی تھی اس نے میرے پاس پہنچ کر میرا بازو تھاما ڈری ہوئی ہرنی کی طرح دائیں بائیں دیکھا اور تیزی سے ایک طرف کو بھاگی ابھی میں نے بمشکل دو چار قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ جنگلیوں کا ایک ٹور ہٹ کے اندر گھس آیا۔ اس ٹولے کے تمام جنگلیوں کے سروں پر وہی خودمنا ٹوپیاں تھیں جن پر بار سنگھ کے سینک جڑے ہوئے تھے۔ وہ تعداد میں دس کے قریب تھے وہ دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے تیور بڑے خطرناک دکھتے تھے ان میں ایک لمبا ترنگا جنگلی جس کی آنکھوں میں خونی سرخی اتری ہوئی تھی بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے ساسا کی گردن بڑی مضبوطی سے دبوچ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساسا کی آنکھیں باہر کواہل آئیں۔ اس کی گردن کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں یوں لگتا تھا جیسے کچھ دیر اور اس وحشی جنگلی نے اس کو نیز نازک سی لڑکی کی گردن نہ چھوڑی تو وہ لڑکی دنیا چھوڑ جائے گی۔ حالات کی سنگینی کا مجھے اندازہ ہو رہا تھا کیا ایک میں آگے بڑھا اور میں نے جنگلی کی کلائی تھام لی اتنی قوت اب بھی مجھ میں تھی کہ میں اس کو لگنی کا ناچ نچا سکتا تھا۔ لمبے ترنگے جنگلی نے نہایت غضب کے عالم میں گھور کر میری طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ کی زوردار ضرب میرے چہرے پر ماری میں اس حملے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے تیزی سے جھکتے ہوئے اس کا یہ ہلک دار بچایا اور سرعت سے اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے اپنے دائیں پہلو میں کھڑے جنگلی کی پیٹ سے تلوار کھینچ کر اس کی نوک لمبے ترنگے جنگلی کی گردن سے لگا دی اور چمکھاڑتے ہوئے بولا۔ ”اس لڑکی کو چھوڑ دو۔“ دوسرے جنگلی ششدر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میری بات کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو میں دوبارہ حلق کے بل چیخا۔

”میں کہتا ہوں اس لڑکی کو چھوڑ دو۔۔۔۔۔“

ساتھ ہی میں نے تلوار کی نوک کا دباؤ مزید بڑھا دیا اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اس جنگلی نے ساسا کی گردن چھوڑ دی۔ ساسا گردن کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے ڈھے گئی۔ وہ کھینچ کھینچ کے سانس لے رہی تھی۔ میرا دھیان ایک لمحے کے لئے ساسا کی طرف گیا وہی لمحہ میرے لئے مصیبت بن گیا۔ لمبے ترنگے جنگلی نے چیتے کی طرح چھینا مارا اور تلوار مجھ سے اچک لی۔ ایک دم ہی میں بالکل نہتا ہو گیا دس کے قریب جنگلی نیزے، بھالے، کلباڑے اور تلواریں لئے میری طرف بڑھنے لگے۔ ایک طرف وہ مسلح خونخوار جنگلی تھے تو دوسری طرف میں بالکل بے یار و مددگار اور نہتا تھا۔ فرش اجل کے پروں کی پھر پھر اہٹ مجھے کہیں آس پاس سے ہی سنائی دے رہی تھی کوئی لمحہ گزرتا تھا کہ

اڑتا لیس گھنٹوں سے پہلے پہلے رواؤ کے گماشتے مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ رینا کی کہی ہوئی

بات بڑی شدت سے میری سماعت میں گونج رہی تھی، اسے بڑے دیوتا کے سامنے قربان کرنا ہے قربانی سے پہلے اگر اسے کچھ ہو گیا تو سردار تم سب کو زندہ جلا دے گا۔ گویا اب حفاظت پر مامور جنگلی میری زندگی لینے کے مجاز نہیں تھے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔

ہٹ کے پچھلی طرف سے میں نے جھاڑ جھکار سے بنی ہوئی دیوار کو آہستگی اور آرام کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے پرے دھکیلنا شروع کر دیا دیوار پر بے ہمتی چلی گئی اور بیچ میں ایک خلا نمودار ہو گیا یہ خلا اتنا تھا کہ ایک بندہ آسانی سے اس میں سے نکل سکتا تھا۔

میں اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریگ گیا۔ اچانک ایک پہرے دار کی نظر مجھ پر پڑ گئی وہ بڑی تیزی سے میری طرف لپکا۔ میں ایسی کسی بھی افتاد کے لئے بالکل تیار تھا۔ میں نے ہوا میں

جست کی اور اسے لیتا ہوا زمین پر آ رہا میرا ایک ہاتھ سیدھا اس کے ہونٹوں پر جم گیا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی تلوار والی کلائی تھام لی تھی۔ کلائی کو ایک جھٹکا دیا تو تلوار پہرے دار کے ہاتھ سے چھوٹ گئی میں نے اس کی کلائی چھوڑ کے اس کی گردن پر ایک مخصوص ضرب لگائی جس سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اب دوسرے پہرے دار سے ملنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ میں ہٹ کا کلاوا کاٹتے

ہوئے دوسری جانب پہنچا تو پہرے دار وہاں موجود نہیں تھا اچانک میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی گونج اٹھی۔ پہرے دار یہاں نہیں تھا تو پھر کہاں گیا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہٹ کے اندر

مجھے کچھ کھٹ پھٹ سنائی دی میں تیزی سے ہٹ کے اندر لپکا دوسرا پہرے دار میرے فرار کی جگہ پر نمودار ہونے والے شگاف کو حیرت سے دیکھ رہا تھا میں نے دبے پاؤں بھاگتے ہوئے ٹانگ کا ایک

مہلک وار اس کی گردن پر کیا وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر آ رہا۔ میں نے جلدی سے دونوں پہرے داروں کو ہٹ کے ایک کونے میں ڈالا۔ شمشیر بے نیام ہاتھ میں تھا میرا اپنا لباس اتار کر

ایک جنگلی کالباس زیب تن کیا اور تقریباً دوڑتا ہوا ہٹ سے باہر نکلا میرا رخ رینا کے ہٹ کی طرف تھا جو بیڑوں کی لمبی قطار کے پچھلی طرف ڈھلوان تھی ڈھلوان میں اونچے نیچے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ میں

نے دوڑتے ہوئے جست کی اور ڈھلوان پہ لڑھکتا چلا گیا جب میں اٹھا تو میرا جسم کچھ نما راکھ سے لگی جگہ سے سیاہ ہو چکا تھا۔ دور جلتی مدہم شعلوں کی روشنی میں، میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا اور فوراً

ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ میں نے تلوار ایک جانب رکھی اور زمین پر لیٹ کر لونبیاں لینے لگا۔ کوئی اور وقت

اس کی ابھی تک سمجھ نہیں آ سکی تھی۔

مجھے ابھی تک یاد تھا۔ رابعہ پڑاؤ سے غائب تھی اس کی کشدگی پر میری اور گوگی کی لڑائی ہو رہی تھی پھر اچانک ایک طرف سے رابعہ کا گھوڑا برآمد ہوا تھا اور اس نے گھوڑے سے گرتے ہوئے

گھبراہٹ کے عالم میں کہا تھا وہ آرہے ہیں..... اسے تو یہی ثابت ہوتا تھا جنگلی رابعہ کے پیچھے پڑاؤ میں پہنچے ہیں۔ وہ رابعہ کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟ وہ اسے کیوں پکڑنا چاہتے تھے؟ انہوں نے پڑاؤ

پے ایسی خونی یلغار کیوں کی اور پھر رینا کو پکڑ کر کس مقصد کے لئے لے گئے؟..... اچانک جھماکا سا ہوا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں کہیں..... کہیں جنگلی رینا کو رابعہ کے دھوکے میں تو پکڑ

نہیں لے گئے تھے۔ رینا نے بھی رابعہ جیسا شکاری لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ”او میرے خدایا!“ اچانک میرے منہ سے نکلا۔ جنگلی یوں ہی پڑاؤ سے واپس نہیں لوٹ گئے تھے بلکہ جس مقصد کے لئے

انہوں نے پڑاؤ پر بلہ بولا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس وقت میرا رینا سے ملنا بہت ضروری تھا۔ رینا سے بھی پتا چل سکتا تھا کہ یہ سب کیا گورکھ

دھندہ ہے۔ ہٹوں سے پرے کھلے میدان میں جنگلیوں کی دیوتا کے حضور عبادت جاری تھی ہٹ سے باہر دو جنگلی میری حفاظت پر مامور تھے۔ ہٹ میں ہی درازوں سے دو درختوں کا سیلاب بہتا نظر آ رہا تھا۔ ہٹ بلندی پر تھا میں وہاں سے نکلنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں بار

کھڑے پہرے داروں کو چمکے دینا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ میں اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور ہٹ میں گھوم پھر کر کسی ہتھیار کی موجودگی کا اندازہ لگانے لگا

مجھے یہاں قید کرنے والے اتنے نا سمجھ نہیں تھے کہ وہاں میرے لئے ہتھیاروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا بہت جلدی میں کرنا تھا۔ میرے ہاتھ

وقت بہت کم تھا۔ زندگی اور موت کے بیچ اڑتا لیس گھنٹوں کا فاصلہ تھا۔ دیوتاؤں کے میلے کو تین دن جاری رہنا تھا آج پہلا دن تھا باقی دو دن میرے پاس تھے تیسرے دن میرا کام تمام کیا جانا تھا۔

ہٹ کے ایک کونے میں کچھ لکڑی کے برتن دھرے تھے میں برتنوں کو پرے کر کے دیکھنا کہ شاید کوئی ایسی چیز ہاتھ آجائے جسے میں استعمال میں لاسکوں مگر باوجود کوشش کے کوئی چیز ہاتھ نہ

لگی۔ میں اضطراب کے عالم میں ہٹ میں ادھر سے ادھر چکرانے لگا۔ سر پر اور موت کے خوف۔ میری ذہنی صلاحیتیں بھی سلب کر لی تھیں۔ کاسے سر میں سوچ کا کوئی سکھ نہیں گر رہا تھا پھر یکایک آپ

وزنی سکھ گرا اور کاسے سر میں ہر طرف شادمانی ناچ اٹھی۔



”میں جھوپڑے سے اپنی مشعل لینے آیا تھا۔“ فوراً میں نے بہانہ تراشا۔ میری بات ختم ہوتے ہی گرائیڈل جنگلی نے اپنے کلباڑے کا اوچھا وار میرے سر پر کیا اگر میں اس طوفانی حملے کے لئے تیار نہ ہوتا تو یقیناً یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ میرا سر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔

میں نے تیزی سے تلوار اٹھائی کہ اپنے سر کے سامنے کی تھی کلباڑے کا وار تو رک گیا تھا مگر میری تلوار کام آگئی تھی۔ وہ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ اب میں بالکل نہتا تھا۔ میرا دشمن مجھ سے ایک بالشت اونچا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ وہ عجیب جنونی انداز میں مجھ پر کلباڑا چلا رہا تھا میں مسلسل کلباڑے سے بچ رہا تھا اور کسی موقع کی تاک میں تھا پھر اچانک مجھے موقع مل گیا۔ ایک وار میں جنگلی کا کلباڑا درخت کے تنے میں ڈھنس گیا۔ اتنا وقت ہی میرے لئے کافی تھا۔ میں نے ہوا میں اچھلتے ہوئے دائیں ٹانگ اس زور سے اس کی گردن پر رسید کی کہ کلباڑے کا دستہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ زمین پر آ رہا۔ اسے میری طرف سے اس برق رفتار حملے کی توقع قطعی نہیں تھی۔ وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا اٹھا اور مجھ پر جھپٹا میں اسے مزید موقع نہیں دینا چاہتا تھا پھر اچانک میرا جسم مشینی حرکت میں آ گیا۔ میری ٹانگیں میرے گھونے میری کہنی اور گھٹنے کی مسلسل اور شدید ضربوں نے مد مقابل کو منوں میں خون جانے پر مجبور کر دیا اس کی ناک کا بانیہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ ذبح ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا میں نے گردن پر مخصوص ضرب لگائی اور وہ بے ہوشی میں چلا گیا۔

میں نے اسے تھکیت کر گھائی سے نیچے پھینک دیا اور پھر واپس پلٹا اور بڑی سرعت سے رینا کے خیمے میں گھس گیا۔ جنگلی کا وزنی کلباڑا میں اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ میں دندناتا ہوا اندر داخل ہوا اور رینا کو پکارنے لگا اچانک ایک کونے سے رینا برآمد ہوئی اور ایک ٹک مجھے دیکھنے لگی۔ میں آنکھوں میں آنسو بھرے ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھانے لگا مگر اس وقت مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب رینا نے قدموں پیچھے ہٹنے لگی اس کی آنکھوں میں خوف اور چال میں لڑکھٹا ہٹ تھی۔

”رینا.....“ میرے منہ سے حیرت ناک جملہ نکلا۔

اچانک رینا اپنی جگہ ٹھکی اور حیرت سے مجھ کو دیکھنے لگی پھر ایک دم مجھے سب سمجھ میں آ گیا میں اس وقت جنگلی لباس اور جنگلی حملے میں تھا رینا مجھے پہچان نہیں سکی تھی یہ بھی عجیب اتفاق تھا پہلی ملاقات میں رینا کو پہچان نہیں پایا تھا جبکہ دوسری ملاقات میں وہ مجھے پہچاننے میں قاصر رہی تھی۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”رینا! میری بہن..... یہ میں ہوں۔“ علی نواز..... تمہارا بھائی دیکھو کتنی دور سے تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔“

ہوتا تو میرے بار احاب یہ منظر دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے مگر میں اس وقت زندگی اور مرہ کے درمیان حد فاضل کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا جسم جنگلیوں جیسا نہیں تھا مگر اب راکھ کی سیاہی جانے سے میرے جسم کی سفیدی چھپ گئی تھی جب مجھے تسلی ہوگئی کہ اب میرے جسم کا نظر آنے کوئی گوشہ بھی میرا بھانڈا نہیں پھوڑے گا تو میں اچھلتا ہوا تاریک سائے کا حصہ بن گیا۔

نگلی تلوار میرے ہاتھ میں چمک رہی تھی اور میں سیاہ جسم کے ساتھ ٹیلوں گھائیوں میں سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ پر مجھے ٹھنک کر رک جانا پڑا اور جنگلی ایک گھائی کے قریب بیٹھے زمین کھود رہے تھے۔ میں ان کو دیکھ کر فوراً ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گیا ان کی آنکھوں میں غور اور حرکت میں اضطراب کی کیفیت تھی۔ ایک جنگلی تیزی سے زمین کھود رہا تھا جبکہ دوسرا آس پاس دھیرا رکھے ہوئے تھا۔ ان کی حرکتیں مجھے بڑی عجیب اور مصنوعی سی لگ رہی تھیں۔ سارے جنگلی دیوتا پوجا میں مصروف تھے مگر یہ دونوں جنگلی ان تاریک گھائیوں میں کیا کر رہے تھے؟ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ بلندی سے ایک جنگلی پکار کر ان دونوں کو بلانے لگا۔ دونوں نے بدحواسی میں اپنا کام ادا چھوڑا اور وہاں سے بھاگ نکلے میں نے چند لمحے رک کر اطراف کا جائزہ لیا پھر میں آگے کو بڑھ گیا۔ میرے پیروں میں پارے پھل رہے تھے۔ میری نگاہیں تیزی سے دائیں بائیں ہو رہی تھیں۔ تلوار کے دستے پر میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں تاریک گھائیاں عبور کر کے جب بلندی پر پہنچا تو رینا کا بڑا ہٹ مجھ سے چند قدموں دوری پر تھا۔ میں پلک جھپکتے سے رینا کے ہٹ کے پچھواڑے پہنچ گیا ابھی میں اندر داخل ہونے راستہ تلاش کر رہی رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک بھاری جسم کا جنگلی برآمد ہوا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا وہ گہری تاریکی میں سایہ ہی نظر آتا تھا اس کے ہاتھ میں ایک وزنی کلباڑا تھا۔

اس کی نگاہیں میرے جسم کو ٹٹول رہی تھیں پھر اس کی سرسراتی ہوئی آواز نکلی ”کون ہو تم.....؟“

”میرا نام بونا ما ہے۔“ میں جھجکے بغیر بولا۔

”کس قبیلے سے ہو؟“ وہ درشتی سے بولا۔

اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا میں جلدی سے کوئی مناسب نام سوچنے لگا۔ میرا خاموشی نے مجھے اس کی نظروں میں اور بھی مشکوک بنا دیا وہ مزید میرے قریب ہو کر بولا۔ ”یہاں؟ کر رہے ہو؟“

ہے وہ.....

”یہ بوگا لے کون ہے؟“ میں نے کہا۔

سب سے بڑے سردار رواڈو کا نائب ہے۔ رواڈو نے اپنے تمام کام بوگا لے کو سونپ رکھے

ہیں۔“

”یہ سردار رواڈو وہی ہے ناں جس سے تمہاری شادی برب کے میلے کے بعد ہونے والی ہے؟“ میں رینا کی آنکھوں کی گہرائی میں دیکھتے ہوئے بولا۔

رینا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا ایک دم ہی وہ ہلدی کی طرح زرد نظر آنے لگی تھی گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”علی نواز! صرف آج کی رات انتظار کر لوکل میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گی اور پلیر اس سے آگے کوئی سوال مت کرنا..... میں بہت مجبور ہوں۔“

مجبوریاں انسان اپنے لئے خود پیدا کرتا ہے میں ایک لمحے کے لئے رکا پھر رینا کے کندھے ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ”رینا! میں تمہیں یہاں سے ہر صورت لے جاؤں گا دنیا کی کوئی بات میرا رستہ نہیں روک سکتی مگر..... اگر تم ہی نے میرا حوصلہ پست کر دیا تو میں کچھ نہیں کر پاؤں گا پلیر مجھے اس وقت تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔“ میں گڑبڑاتے ہوئے بولا۔

رینا متذبذب دکھائی دینے لگی۔ یوں لگا جیسے وہ سخت کشمکش میں ہے ابھی کسی نتیجے پر پہنچے گی گے بڑھے گی اور میرا ہاتھ تھام کر کہے گی چلو علی نواز..... میں تمہارے ساتھ ہوں مگر ایسا کچھ نہیں دا۔ رینا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔

”علی نواز! خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ ابھی کوئی آجائے گا۔ اگر پھر کسی نے تمہیں یہاں پکڑ لیا تو بہت غضب ہوگا۔“ وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

”رینا! میں یہاں سے ایک قدم نہیں ہلوں گا..... اگر تم.....“

فقرہ ابھی میرے منہ میں ہی تھا کہ اچانک باہر آہٹ ہوئی یوں لگتا تھا جیسے کوئی بڑی تیزی سے رار رہا ہے۔ میں کلبھاڑا تھام کے فوراً ایک لکڑی کے ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا میں اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا مجھے رینا کو لے کر یہاں سے فرار ہونا تھا۔ میرے سنے میں جو بھی آتا اسے آج خون میں نہانا تھا۔ میں کلبھاڑی دونوں ہاتھوں میں لے کر سیدھی کر چکا۔ ایک جنگلی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا میں کلبھاڑی کو سر سے بلند کر چکا تھا اس سے پہلے کہ میری ہلاڑی جنگلی کے ککڑے کر دیتی میرے ہاتھ اچانک رک گئے۔ وہ بوڑھا جنگلی ناکو تھا وہی ناکو جو مجھ

میری آواز سن کر رینا چونکی اس کی آنکھیں سمٹیں اور پھر ان آنکھوں میں درد کی بے نام سی گئی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور میرے کندھے سے لگ گئی اس کے آنسو میرا کندھا بھگونے لگے کی ہچکیوں نے میرے سینے میں دھواں ہی دھواں بھر دیا۔ رینا گلو گیر آواز میں بولی۔

”علی نواز! کیوں میری خاطر تم نے خود کو آگ میں جھونک دیا۔ میں تو اس دنیا میں ایک لکڑی کی ماں باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد میرا کوئی نہیں تھا پھر تم نے اتنا پیار کیوں دیا کہ پھر سے مجھے تمنا پیدا ہونے لگی، پھر سے کسی کے لئے دل پریشان ہونے لگا۔ میں جب سے یہاں پہنچی ہوں صدمہ تمہاری طرف سے فکر مند رہتی ہوں۔ میرے دل کے ہر کونے سے یہی دعا نکلتی تھی کہ تم جہاں کہیں ہو پریشانیوں سے محفوظ رہو۔ میں تو دن رات تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھی پھر.....! نے کیوں خود کو اس مصیبت میں ڈال لیا.....“ رینا ایک لمحے کے لئے چونکی وہ مجھ سے علیحدہ ہوئی پھر ہذیبانی انداز میں جلائی۔

”علی نواز! تم واپس لوٹ جاؤ..... مم..... میں..... تمہیں یہاں سے نکال دوں گی میں تمہیں اس موت کی وادی سے نکال سکتی ہوں۔“

میرے ہونٹوں پر ایک چھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میری آنکھوں کے کونے ہلار آنسوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں دیانت داری سے یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں رینا کو شاید اہمیت نہیں دے پایا تھا جس کی وہ حقدار تھی۔ وہ زمانے کی ٹھکرائی ہوئی لڑکی تھی کوئی اپنا نہیں رہا تھا اپنا تھا وہ دشمنوں سے بڑھا ہوا تھا کوئی اس کے ساتھ پیار نہیں جاتا تھا میں نے تھوڑا سا پیار جتایا تھا وہ جھلی ہو گئی تھی۔ وہ میرے لئے ایسے فکر مند رہنے لگی تھی جیسے واقعی میرا اس سے کوئی خونی رشتہ ہو۔

”رینا! میری بہن اتنا وقت میرے پاس نہیں کہ میں تم سے پوچھ سکوں تم اس جگہ کیسے پہنچی میں تو بس تمہیں یہاں سے لینے کے لئے آیا ہوں جلدی کرو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ رینا کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔

وہ ہاتھ چھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”نہیں علی نواز! میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی..... نہ یہاں سے اکیلے ہی جانا ہے۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”بچپن کی باتیں مت کرو رینا..... میں سینکڑوں مصائب جھیل کر صرف..... صرف تمہا خاطر یہاں آیا ہوں اور تمہیں لے کر ہی یہاں سے لوٹوں گا۔“

”علی نواز! ایسا نہیں ہو سکے گا..... تم بوگا لے کو نہیں جانتے درندوں سے زیادہ خطرناک اند

”میری گڑبادی پیاری بہن! خواب صرف خواب ہوتے ہیں۔ تم یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارے ساتھ جانے سے میری زندگی کو خطرہ ہے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں اگر تم میرے ساتھ نہ چلیں تو میں خود کو ان جنگلوں کے حوالے کر دوں گا پھر مجھے جینے کا کوئی شوق بھی نہیں رہے گا۔“ میری بات سن کر رینا اور زیادہ سسکتے لگی۔

”میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تم جہاں کہو گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ مگر میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ میں بولا۔

”میں جہاں کہیں زخمی ہو جاؤں یا دشمن کے گھیرے میں آ جاؤں تم اپنی جان مصیبت میں نہیں ڈالو گے بلکہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاؤ گے۔“ رینا نے اس انداز میں کہا کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ بہر حال میں معاملہ فہمی سے اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے رینا..... جیسے تم کو ہوں ویسے ہوگا۔“

میرے جھوٹے اقرار کے بعد رینا نے صرف وہاں سے ایک چرمی تھیلا اٹھایا اور ہم دونوں ناکو کی ہرکابی میں چھوٹی بڑے سے باہر نکل کر چلے گئے۔ ناکو نے بتایا تھا کہ تمام جنگلی اس وقت شراب کے نشے میں مست لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں ادا سے نکلنے تک کوئی خطرہ نہیں تھا بس جہاں وادی کی حد بندی ہوتی تھی اور جہاں سے بھوری چٹانیں شروع ہوتی تھیں وہاں جنگلی پہرے دار مسلسل گشت کرتے تھے۔

ناکو نے بھی وہی راستہ چنا تھا جس راستے سے میں تھوڑی دیر پہلے رینا کے جھوپڑے میں پہنچا تھا ہم اندھیرے نیلے اور گھائیوں سے ہوتے ہوئے مسلسل بھوری چٹانوں کی طرف بڑھ رہے تھے ناکو نے اپنے ہاتھ میں ایک نیزہ تھام رکھا تھا۔ میری انگلیاں کلبھاری کے دستانے میں پوسٹ ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ آج جو بھی سامنے آتا اسے خاک و خون میں نہانا تھا۔ ابھی ہم لوگوں کو چلتے ہوئے بمشکل میں منت ہی ہوئے ہونگے کہ ہمارا ناکرا تین عدد جنگلیوں سے ہو گیا۔ یہ وہی جنگلی تھے جنہیں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور جو بیٹھے ایک جگہ سے زمین کھود رہے تھے ان کی نظر جونہی ہم پر پڑی وہ ایک دم ہتھیار تول کر سیدھے ہو گئے انہوں نے کوئی بات نہیں کی اور اچانک ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ نیم اندھیرے میں تلواریں چمکیں کلبھارا حرکت میں آیا۔ نولاد کا خونی ملاپ ہوا اور خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ ناکو نے نیزے سے ایک جنگلی کو ابدی نیند سلا دیا تھا اب دو جنگلی ہم دو کے مقابلے میں تھے۔

سے بڑے محبت بھرے لہجے میں پیش آیا تھا اور جس نے مجھے یہ امید افزا خبر سنائی تھی کہ وہ مجھے پہاڑ سے نکال دے گا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے اتنی جلدی مرنے نہیں دے گا۔ اس کا چہرہ دیکھ ہی مجھے اس کی کہی ہوئی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ میں کلبھاری نیچے کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھتا ہوں۔ اس نے میری کلائی تھامی اور ایک طرف کو کر کے بولا۔

”ایلی نیوز! میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میں تمہیں اتنی جلدی مرنے نہیں دوں گا۔ تم تیار ہو۔ میں سارا انتظام کر آیا ہوں۔“ وہ بڑا پر جوش ہو رہا تھا۔

”ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے.....؟“ میں نے سرگوشی کی۔

”یہ سب تم مجھ پر چھوڑو..... بس اب یہاں سے نکلنے والی بات کرو..... وقت بہت کم ہے۔ اور..... اپنی ساتھی لڑکی کو بھی ساتھ لے لو.....“ میں حیرت سے ناکو کا چہرہ دیکھنے لگا وہ میرے اور کے تعلق کے بارے میں کیسے جانتا تھا بہر حال یہ وضاحت طلب کرنے کا وقت نہیں تھا میں نے جلد سے رینا کو صورت حال سے آگاہ کیا اور بولا۔ ”رینا! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے تمہیں جو کچھ لینا لے لو۔“

رینا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے وہ بھیگے لہجے میں بولی۔ ”علی نواز! کیوں؟“ مصیبت میں ڈالتے ہو..... میں تمہارے ساتھ بالکل نہیں جا رہی۔“ وہ ٹھوس اور اٹل لہجے میں بولی مجھے بھی غصہ آ گیا۔

”رینا! ایک بات بتاؤ تم میرے ساتھ جا رہی ہو یا نہیں.....؟“

علی نواز..... رینا کی آواز گھٹ کے رہ گئی اس سے پہلے کہ میں غصے کے عالم میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ رینا بھرائے لہجے میں بولی۔

”علی نواز! اصل میں..... کل رات میں نے بہت برا خواب دیکھا تھا میں نے دیکھا تھا تم ساتھ لے جانے کے چکر میں..... مارے.....“ اس سے آگے وہ ایک لفظ نہ بول سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے دیئے جل اٹھے کتنی عجیب و غریب لڑکی تھی۔ صرف ایک خواب کی خاطر وہ میرے ساتھ نہیں چل رہی تھی اس کا خیال تھا خواب کے مطابق اگر میرے ساتھ واپسی کا سفر اختیار کرے گی تو میں مارا جاؤں گا۔ مجھے رینا پر ٹوٹ کے پیار آیا میں آگے بڑھ کر رینا کو خود سے لگایا آنسو قطار اندر قطار میری آنکھوں سے بہہ نکلے تھے میرے سینے دھواں سا بھر گیا تھا۔

ناکونہتا تھا جبکہ میرے پاس وزنی کھاڑا تھا مجھے وار کرتے ہوئے ناکو کبھی کور کرنا تھا۔

ایک جنگی کی تلوار کا وار میں نے جھکتے ہوئے بچایا اور میرے کھاڑے کا وزنی وار مد مقابل پیٹ پھاڑتے ہوئے گزر گیا اس کی انتزیاں باہر کو نکل پڑی تھیں۔ میں اپنے ایک دشمن کو تو ختم کر تھا مگر دوسری طرف سے میں خطا کھا گیا تھا دوسرے جنگی نے تلوار کے وار سے ناکو شدید زخمی کر تھا۔ تلوار اس کے داہنے کندھے پہ لگی تھی اور اور تین انچ گہرا زخم دے گئی تھی۔ ناکو زمین پر گرا رہا تھا ناکو پے وار کرنے والا جنگی یک لخت ایک سمت کو بھاگ نکلا میں نیچے گرے پڑے اپنے خم سنبھالنا چاہتا تھا مگر اس محسن نے اشارتا مجھے یہ سمجھایا کہ بھاگنے والے کا پیچھا کرو میں نے کھاڑا بچھوئے تلوار اٹھائی اور فرار ہونے والے جنگی کے پیچھے بھاگ نکلا حیرت کی بات یہ تھی کہ جنگی خاص آواز نکال کر اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ جلد ہی میں نے اسے اس نے بھاگتے ہوئے ایک اوچھا وار مجھ پر کیا جو میں نے جھک کر بچایا ساتھ ہی میری تلوار تیزی حرکت میں آئی اور مد مقابل کے آ رہا ہو گئی اسے ختم کرنے کے بعد میں واپس لوٹ آیا ناکو اپنی آواز سانس گن رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے ہونٹ پھر پھڑپھڑا رہے تھے۔ میں نے ا قریب کر کے سنا تو وہ ساسا کو پکار رہا تھا ساسا کو پکارتے ہوئے ہی اس نے دم دے دیا ہمارا ہمیں اکیلا چھوڑ کے راہی عدم ہوا تھا وہ کون تھا! کیا تھا؟ ہم سے اتنی ہمدردی کیوں جتا رہا تھا، یہ راز بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا بس اس کے آخری الفاظ ہی شاید اس حقیقت سے پردہ اٹھا: تھے ساسا شاید اس کی بیٹی تھی جس کو پکارتے پکارتے اس نے دم دیا تھا۔

ناکو مر چکا تھا اور ہمیں ایک اندھے رستے پر چھوڑ گیا تھا اندھیرے کی پرچھائیاں تھیں او نیچے نیلے تھے اور پہاڑیوں کی صورت اس خونی وادی کی بلند فصیلیں تھیں۔

ایک طرف میں تھا..... ایک نازک سی لڑکی تھی اور دوسری طرف وحشی انسانوں کا ایک عظیم تھا جو کبھی..... کسی لمحے بھی یہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

میں نے تلوار رینا کو دے کر خود کھاڑا سنبھال لیا تھا غمناک آنکھوں سے ہم اپنے محسن کی ا کو الوداع کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ہمیں جلد از جلد بھوری چٹانوں تک پہنچنا تھا۔ جنگی لباس میں تھا جبکہ رینا بھی خوبصورت جنگی لباس زیب تن کئے ہوئی تھی۔ میرا ذہن ابھی تک الجھن میں گرفتار تھا کہ وہ تینوں جنگی ہم پر بغیر تصدیق کئے کیوں حملہ آور ہوئے تھے؟ کیا..... روادو کے حکم کے پابند نہیں تھے یا..... یا وہ بھی اس جنگی وادی میں ہم جیسے باہر کے آدمی تھے۔

وہ منظر میری نگاہوں میں گھوم گیا جب ان میں سے دو جنگیوں کو میں نے ٹیلوں کے اندھیرے حصے میں زمین کھودتے ہوئے دیکھا تھا وہ کیا چیز ڈھونڈ رہے تھے زمین کھود کر کیا نکالنا چاہتے تھے؟ جب سب جنگی دیوتا کی عبادت میں مصروف تھے تو ان تین جنگیوں کو اندھیرے اور ویران ٹیلوں میں کس چیز کی جستجو گھیر لائی تھی۔ خیر یہ سب راز ان کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گئے تھے۔

میں رینا کا ہاتھ تھامے اونچے ٹیلوں میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا میرا دھیان اس برج نما بھوری چٹان پر تھا جہاں دیوتاؤں کے نشان والا کالا جھنڈا نما کپڑا لہرا رہا تھا۔

جھنڈا اس امر کا احساس دلا رہا تھا کہ ہم ٹھیک سمت قدم بڑھا رہے ہیں اگر ہم اس فصیل نما بھوری چٹان کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہماری زندگی کی امید پیدا ہو سکتی تھی۔

چلتے چلتے اچانک رینا ٹھکی اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے وہ نہایت لجاجت سے بولی۔  
”علی نواز! میں اب بھی کہوں گی کہ واپس لوٹ چلیں..... ہم..... ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے.....“

”رینا! قدم بڑھایا ہے تو موت سے کیسا ڈرنا؟“

”علی نواز! مجھے اپنی فکر بالکل نہیں.....“ وہ مغموم سی میری طرف دیکھ کر بولی۔  
”رینا! میں اپنی زندگی بچانے کے لئے تمہیں موت کے منہ میں نہیں ڈھکیں سکتا..... کیا..... کیا تم یہاں رہ لو گی۔ کیا تم روادو کی دہن بننا پسند کرو گی..... نہیں..... رینا نہیں..... تم یہ سب نہیں کر پاؤ گی۔ پھر..... پھر واپس پلٹنے کی باتیں کیوں کرتی ہو.....؟“

”اس لئے کہ میں اپنے بھائی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ عجیب سے چمکتی آنکھوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری زندگی کے عوض مجھے سب کچھ قبول ہے۔ میں.....“

”بس رینا..... بس..... اس سے آگے تم ایک لفظ بھی بولیں تو میں کبھی تمہارا چہرہ نہیں دیکھوں گا۔ تم..... کیا سمجھتی ہو تم میری زندگی کی خاطر خود کو آگ میں جھونک لو گی۔ میں ایسی زندگی پر ہزار بار لعنت بھیجوں گا۔ رینا..... تم اس خیال کو دل سے نکال باہر پھینکو کہ میں تمہیں یہاں ان جنگیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا میں تمہاری تلاش میں نکلا تھا اور تمہیں لے کر ہی واپس لوٹوں گا۔“

میری بات سن کر رینا سسکتے لگی اور گویا آواز میں بولی۔ ”علی نواز! کیوں مجھ جیسی بد قسمت کے لئے خود کو مشکل میں ڈالتے ہو.....؟“

”رینا! جن بہنوں کے بھائی موجود ہوں وہ بہنیں کبھی بد قسمت نہیں ہوا کرتیں۔“

پہنچ چکا تھا۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا اپنے دوستاقتیوں کا انجام وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس نے تلوار ہوا میں لہرائی اور تیزی سے میری طرف بڑھا اس کی آنکھوں میں بلا کا اعتماد تھا وہ مجھ تک پہنچا اور پھر اس کی تلوار مجھ پر برسے گی۔ بلاشبہ وہ بلا کا تلوار زن تھا۔ اس کا پیچھے ہٹنا اور پھر تیزی سے آگے بڑھنا اور مجھ پر چھپنا بڑا خطرناک تھا۔ میں اس کی تلوار کے وار بڑی مشکل سے روک رہا تھا۔ بار بار نو لدا کا اتنی ٹکراؤ ہوتا تھا اور چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی تھیں۔ رینا پہاڑی کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی تین جنگلی اسی سمت سے اوپر چڑھتے چلے آ رہے تھے ماہر تلوار زن جنگلی کو ختم کئے بنا میں رینا کی مدد کے لئے نہیں پہنچ سکتا تھا اور وہ جنگلی اس انداز سے مجھ پر حملہ آور تھا کہ قریب قریب کوئی ایسی امید نظر نہیں آ رہی تھی کہ میں اس سے چھٹکارا پاسکوں گا۔ مجھے اپنا دفاع کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی میں رینا کی طرف سے سخت پریشان تھا اگر رینا ان جنگلیوں کی گرفت میں آجاتی تو میں خود بخود ہی دشمن کے سامنے ہتھیار بھینک دیتا۔ اس لمحے رینا کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے اور میں خود ہی خود میں مسکرا کر رہ گیا میں جہاں کہیں زخمی ہو جاؤں یا دشمن کے گھیرے میں آ جاؤں تو تم اپنی جان مصیبت میں نہیں ڈالو گے بلکہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاؤ گے۔ کتنی بھولی تھی رینا اتنا سی بھی بات بھی نہ سمجھ پاتی تھی کہ جسے ڈھونڈنے کے لئے میں اتنے خونیں دریا پار کر کے آیا تھا اسے لئے بنا کیسے واپس چلا جاؤں گا۔

رینا کا خیال ذہن میں آتے ہی میرے اندر جیسے ایک نئی توانائی بھر گئی میرے حلق سے ایک تھراک چنگھاڑ برآمد ہوئی جو مجھے خود کو بھی نامانوس سی لگی اور میں عقاب کی طرح اپنے دشمن پر جھپٹ پڑا جب تک میں دفاع کر رہا تھا میں چلا جا رہا تھا جو نبی میں نے زوردار طریقے سے اس پر حملہ کیا تو وہ اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میرے منہ سے نکلنے والی بے اختیار چنگھاڑ نے ایک بہت اہم کام سرانجام دے دیا تھا۔

جو تین جنگلی رینا کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے اور قریب ہی تھا کہ وہ رینا کو دیکھ لیتے مگر عین وقت پر میری آواز نے انہیں میری طرف متوجہ کر دیا تھا انہیں اپنا واحد دشمن نظر آچکا تھا اور وہ پہاڑ کے تریچے راستے سے میری طرف بڑھنے لگے۔ اس منظر نے میرے اندر ایک نیا ولولہ اور امنگ جگا دی میرے ہاتھوں میں جیسے بجلیاں بھر گئیں۔ میرا مقابل صرف تلوار چلانا جانتا تھا کراٹے کے داؤ سے وہ قطعی ناواقف تھا۔ جو کام میں کرنے والا تھا اس میں میری جان جانے کا اندیشہ بھی تھا مگر یہ کرنا بھی ناگزیر تھا۔ اگر اس ماہر تلوار زن کی موجودگی میں تینوں جنگلی مجھ تک پہنچتے یا تو نہ خطرناک

رینا تڑپ کر میرے بازو کے ساتھ لگ گئی۔ وہ افریقہ میں پلی بڑھی جوان ہوئی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ مشرق میں رشتوں کے تقدس کے لئے جان کی بازی تک لگا دی جاتی ہے۔

رینا! خود کو آنے والے وقت کے لئے تیار کر لو میں تمہیں ہوا کے جھونکے کی مانند یہاں سے اڑا لے جاؤں گا اگر ہم اس برجی کو صبح ہونے سے پہلے پہلے پار کر لیں تو دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہل ہم یہاں سے بہت دور نکل سکتے ہیں۔“ میں دور ایک طرف اشارے کرتے ہوئے بولا یکا یک ہم دونوں کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی اور فرانے بھرتی ہوئی اونچے نیچے ٹیلوں سے گزر رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ ہمیں ٹھنک کر رک جانا پڑا بھوری چٹانوں پے چڑھتے ہوئے ایک ٹیلے کے پر کی طرف نصف درجن کے قریب جنگلی بیٹھے گئیں ہانک رہے تھے۔ تلواریں انہوں نے اپنی گود میں دھری تھیں اور کوئی کھیل کھیل رہے تھے میں نے ٹیلے کی اوٹ سے آس پاس کا اندازہ اچھی طرح سے لگا لیا وہ چٹان تھے ان کا کوئی اور دوسرا ساتھی دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا ان سے مقابلہ کئے بنا یہاں سے نہیں نکلا جاسکتا تھا۔ میں مقابلے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا اگر وہ سب بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوتے تو شاید میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب سامنے آئی میں نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ٹیلے کی اوٹ سے ایک بھاری پتھر ان جنگلیوں کی طرف لڑھکا دیا پتھر لڑھکنیاں کھاتا ہوا ان جنگلیوں کے درمیان جا پڑا وہ یکا یک اپنی جگہ سے اٹھے اور تلواریں سونت کر ادھر ادھر دیکھنے لگے میں نے ایک اور پتھر نیچے پھینکا اور تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی تین جنگلی تیزی سے بھاگتے ہوئے اوپر چڑھنے لگے۔ دوسرے تینوں بھی کچھ دیر سوچنے کے بعد پہاڑی کے دوسرے سرے سے اوپر چڑھنے لگے ان تینوں کا چڑھائی چڑھتے ہوئے آپس میں کافی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا اب چیز ہمارے حق میں بہتر تھی۔

جو چال میں نے کھیلی تھی جنگلی اس میں بری طرح پھنس چکے تھے میں بلندی پے ہوئے ہوئے ان سب کو باسانی دیکھ سکتا تھا جبکہ وہ مجھے دیکھنے سے قاصر تھے میں نے رینا سے تلوار لے کر کلبھاڑا اسے تھما دیا تھا۔ میں ایک جنگلی کی تاک میں بلندی پر اوندھے منہ لیٹ گیا جو نبی وہ جنگلی پہاڑ تلوار کی رتخ میں پہنچا میری تلوار آسانی صاعقہ کی طرح چمکی اور جنگلی کی گردن سے سر صاف غائب ہو گیا۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور دوسرے جنگلی کی تاک میں بیٹھ گیا۔ دوسرا جنگلی میری تلوار کے ایک ہی وار سے گھائل ہو کر نشیب میں لڑھک گیا اتنی دیر میں تیسرا جنگلی میرے

صورتحال پیدا ہو سکتی تھی۔

عبور کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ جاؤں۔ میں کسی نتیجے پر بھی نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ایک منظر نے میری دھڑکنوں کو طمانیت کی چادر اوڑھادی۔ پہاڑ کے پرلی طرف سے ریٹا اچانک برآمد ہوئی تھی اور اس نے کلبھاڑی جنگلی کو دے ماری تھی۔ جنگلی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو ریٹا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے کوئی موقع ضائع کئے بغیر اس کا ہاتھ تھاما اور نشیب میں اترتا چلا گیا۔ خون آلود جنگلی تلوار ابھی تک میرے ہاتھ میں لہرا رہی تھی۔

نشیب میں ایک جگہ آگ کا الاؤ روشن تھا۔ شاید مرنے والے جنگلی اسی آگ کے قریب بیٹھتے تھے۔ الاؤ کے قریب ہی ایک پہاڑی کھوہ بھی تھی میں تیزی سے کھوہ کے اندر داخل ہوا کھوہ اندر سے ایک کھلی سرنگ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ میں اندر داخل ہوتے وقت ایک روشن مشعل اٹھالایا تھا۔ اچانک ایک مخصوص سی بو نے میرا استقبال کیا تو میرے دل کے تار بج اٹھے اور جسم کے ہر رونسے دعا نکلنے لگی خدا کرے جو میں سمجھ رہا ہوں وہی کچھ ہو..... اور پھر شاید میری دعا قبول ہو گئی جوں ہی میں آگے بڑھا ہلکی سی آہٹ ہوئی اور پھر گھوڑے کے ہنہانے کی آواز آئی۔ یہ آواز جیسے دنیا کی سب سے حسین آواز بن گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر مشعل کی روشنی ڈالی تو میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ ایک توانا گھوڑا تھا اس کی پچائی جلد مشعل کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ گھوڑے کے ساتھ خرچین بھی لٹک رہی تھی۔ میں نے گھوڑے کی بائیں تھانیں اور اسے لیتا ہوا غار سے باہر آگیا۔ گھوڑا دیکھ کر ریٹا کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔ یہاں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ریٹا کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھی تھی۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا تو ریٹا بھی میرے پیچھے سوار ہو گئی۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا جب ایک جنگلی ہاتھ میں کلبھاڑا اٹھائے ہماری طرف بڑھا یہ شاید وہی جنگلی تھا جو میری تلوار کے وار سے گھائل ہو کر نشیب میں گرا تھا۔ وہ عجیب ہڈیانی انداز میں ہماری طرف بڑھا تھا۔ ریٹا کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

اس نے کلبھاڑے کا وزنی وار میری ٹانگ پر کیا جو میں نے گھوڑے کو گھماتے ہوئے اپنی تلوار پر روکا پھر وہ دیوانگی سے مجھ پر وار کرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اونچی آواز میں چلانے لگا۔ یہ خطرناک صورتحال تھی۔ میں چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ جنگلی مسلسل اپنے حلق سے تیز سیٹی نما آوازیں نکالنے لگا۔ میرے تمام جسم کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ سیٹی نما آواز خطرے کا سگنل تھی۔ میں نے گھوڑے سے اترتے ہی جنگلی کو تہ تیغ کر دیا مگر مرتے ہوئے وہ اپنا کام کر چکا تھا دور بہت دور سے جنگلیوں کی جوابی آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا جنگلیوں کا غول

میں نے تلوار چلاتے ہوئے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور اپنے مد مقابل کو پہاڑی ڈھلوان کے قریب لے آیا میرا مد مقابل اس سے بے خبر تھا کہ میں اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں میں مسلسل تلوار چلا رہا تھا اور جنگلی کو اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔ میری تیز نظریں مسلسل ایک موقع کی تلاش میں تھیں۔ پھر یکا یک موقع میرے ہاتھ لگ گیا۔ جنگلی کی تلوار کا ایک وار خالی جا کر بھوری چٹان سے ٹکرایا میں نے اس مختصر وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تلوار اس کی جھکی ہوئی تلوار پر ماری اور پھر بجلی کی سی تیزی سے میری بیک راؤنڈ کلک جنگلی کو اس کی تلوار زنی سے نجات دلا گئی۔ میرے جاپانی ٹیچرلی جو اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ علی نواز تہاری بیک راؤنڈ کلک لوہے کو پانی میں تبدیل کر سکتی ہے۔ انہوں نے مجھے اس کلک پر بہت محنت کرائی تھی اور وہ اکثر اپنے شاگردوں کے سامنے اس بات پر فخر بھی محسوس کیا کرتے تھے۔

اب اسی طوفانی کلک نے میرے مد مقابل کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی تھی اور وہ ٹوٹی گردن سمیت نشیب میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔ تینوں جنگلی دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے میں نے جہنم واصل ہونے والے جنگلی کی تلوار اٹھائی اور نیزے کی طرح پوری قوت سے ایک جنگلی کی طرف پھینک دی۔ تلوار آنا فانا جنگلی کے سینے سے آر پار ہو گئی اس کے حلق سے اک دل سوز کراہ نکلی اور وہ بھی ڈھلوان پر لڑھکتا چلا گیا۔ اب میرے مقابل دو جنگلی تھے میرا حوصلہ ان پہاڑوں جیسا بلند ہو چکا تھا جو اس وقت میرے سامنے ایستادہ تھے۔ میں تلوار کو لہراتے ہوئے ان کے مقابل آگیا ان کی آنکھوں میں اعتماد نام کی کوئی چیز نہیں تھی یوں لگتا تھا باقی ساتھیوں کی موت نے ان پر میری ہیبت طاری کر دی ہے۔ چارونا چاروہ مجھ سے بھڑ گئے میں انہیں کوئی موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میری تلوار ان دونوں پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی میں آگے بڑھا تو وہ پیچھے سے ہٹتے چلے گئے۔

میری تلوار بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ پھر آنا فانا میری تلوار نے ان میں سے ایک کی کھوپڑی توڑ ڈالی۔ دوسرا جنگلی یہ منظر دیکھ کر ایک طرف کو سرپٹ دوڑ پڑا۔ وہ اس تیزی سے وہاں سے بھاگا کہ میں حیران رہ گیا۔ اگر وہ اس جگہ سے فرار ہو جاتا تو ہمارے لئے سخت مشکل پیش آ سکتی تھی۔ مگر تلوار سونت کر اس کے پیچھے بھاگ نکلا اس کا اور میرا درمیانی فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ میں ایک لمحے کے لئے عجیب کشش کا شکار ہو گیا۔ کبھی سوچنے لگا جنگلی کا پیچھا کروں اور اسے؟ لوں کبھی میرے دل میں خیال آنے لگا جنگلی کو چھوڑ دوں ریٹا کو لوں اور اس خونی وادی کی فیصلوں؟

مخصوص آوازیں نکالتا اس سمت بڑھا چلا آ رہا ہے۔ یکا یک میرے اعصاب تن گئے میں نے رینا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔

”رینا! تم ٹھیک ہونا؟“

”علی نواز!..... علی نواز!.....“ وہ صرف اتنا کہہ سکی اس کی آنکھوں میں وہ خوف تیر رہا تھا جس نے میری رگوں میں سردی کی لہر دوڑادی تھی وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی۔

”علی نواز! میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ مت بھاگو..... میرے خواب جھوٹے نہیں ہوتے.....“

میں نے ایک دفعہ مڑ کر اس طرف دیکھا جدھر سے جنگیوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں پھر جست کی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا میرا اشارے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ آگے ایک تنگ گھاٹی تھی اگر میں جلد از جلد اسے عبور کر لیتا تو اس سے آگے رستہ صاف اور سیدھا تھا۔ میں گھوڑے کو گھاٹی کی طرف بڑھاتا چلا گیا۔ گھاٹی تنگ اور ناہموار تھی گھوڑے کو چلنے میں سخت دقت پیش آنے لگی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نشیب میں ہر طرف مشعلیں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے مشعلوں کا رخ گھاٹی کی جانب ہو گیا بہت سے مشعل بردار جنگی ہماری سمت بڑھے آ رہے تھے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ میں نے گھوڑے کو گھاٹی سے ڈھلوان کی طرف اتارا اور بھگتا چلا گیا۔ رینا نے مضبوطی سے مجھے پیچھے سے تھام لیا تھا۔ گھوڑا طوفانی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ میرے سینے میں اس وقت ایک طوفان پل رہا تھا میں اس وقت زندگی اور موت کی فسیل پر کھڑا تھا مجھے موت کی فسیل توڑتے ہوئے زندگی کی پرسکون وادی میں داخل ہونا تھا زندگی کی وادی..... جہاں میرا سب سے محبوب چہرہ بستا تھا..... گھاٹی سے ڈھلوان کا سفر ہم نے بڑی تیزی سے طے کیا اور نشیب میں پہنچ گئے۔ میں نے ایک دفعہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو گھاٹی کے تنگ رستے پر جنگیوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا ان کی جینیں ان کے لٹکارے، مدھم آواز کی صورت ہم تک پہنچ رہے تھے۔

میں نے گھوڑے کو ایک سیدھے رستے پر ڈالا اور ہوا کر دیا۔ گھوڑے کی ٹاپیں پتھر پٹی زمین؟ گونج پیدا کرنے لگیں یہ زندگی کی گونج تھی ہمارے قدم زندگی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے اور موت کا خوفناک تندر یلا ہمارے پیچھے لپکا چلا آ رہا تھا۔ جس راستے پر گھوڑا بھاگ رہا تھا اس سے آگے چند قدموں پر ایک اندھا موڑ تھا موڑ مڑنے کے لئے مجھے گھوڑے کی رفتار سست کرنا پڑی۔ مڑتے ہوئے اچانک مجھے کسی روشنی کا احساس ہوا۔ گھوڑا کچھ اور آگے بڑھا تو میرے بدترین خدشات

حقیقت کا روپ دکھار گئے اندھا موڑ ختم ہوتے ہی ایک سیدھا رستہ شروع ہوتا تھا اور اس رستے پر اس وقت ایک درجن کے قریب جنگی ہاتھوں میں مشعلیں اٹھائے ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میں نے تیزی سے گھوڑے کی باگیں موڑیں گھوڑا اسی رستے پر واپس ہو کر سر پٹ دوڑنے لگا۔ چند قدموں کی دوری پر جا کر ایک رستہ بائیں طرف کو مڑ رہا تھا میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا درختوں کی جھکی شاخیں ہمارے جسموں کا حال حوال پوچھنے لگیں۔ میں نے سر جھکا کر گھوڑے کی گردن سے لگا لیا تھا رینا کو بھی میں نے ایسا کرنے کا کہا تھا۔ شاخوں کے چرے رینا کے نازک جسم کو زخم دینے لگے بار بار اس کی گھٹی گھٹی چیخ بلند ہوتی تھی اور میرا دل لرز اڑتی تھی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس کو لگنے والے سارے زخم خود پے سہہ لیتا ابھی اس رستے پر چلتے ہوئے ہمیں دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ جھاڑیوں میں سے ایک طرف سے دو جنگی بڑی تیزی سے برآمد ہوئے اور ہم پر چبھے۔ میرے پاؤں کی سیدی ٹھوکر ایک جنگی کے سینے پر لگی اور وہ پشت کے بل درخت سے جا کر ٹکرایا ٹھوکر اتنی زوردار تھی اور جنگی کا درخت سے ٹکراؤ اتنا خوفناک تھا کہ جنگی درخت سے ٹکرانے کے بعد وہیں ڈھیر ہو گیا شاید اس کے سر کا پچھلا حصہ درخت سے ٹکرایا تھا۔

دوسرا جنگی اپنی تلوار کے ساتھ مجھ سے آمادہ پیکار تھا اس کی تلوار میرا جسم چھید دینا چاہتی تھی مگر میرے سینے میں اس وقت جو آگ بھڑک رہی تھی اس کا اندازہ شاید اس جنگی کو نہیں تھا۔ یہ آگ اس سارے جنگل کو جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ میں نے ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے تلوار کا ایک خونی وار اس پر کیا تھا۔ اس نے تلوار سے یہ وار روکنا چاہا تھا مگر وہ اس وار کے پیچھے لگائی گئی طاقت کا اندازہ لگانے میں خطا کھا گیا تھا۔ وار روکنے کیلئے اٹھی ہوئی تلوار جنگی کے ہاتھ سے گر کر دور جا گری تھی اور میری تلوار کی آب دار نوک جنگی کا سینہ شق کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ دونوں جنگیوں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے گھوڑا دائیں رستے پر موڑا اور ڈھلوان پے اترتا چلا گیا ہانپتا ہوا گھوڑا جونہی ڈھلوان اتر کر میدانِ حصے میں آیا تو میں نے ایک دفعہ پھر سے اسے بھگانا شروع کر دیا۔

گھوڑا منٹوں میں آندھی اور طوفان بن گیا۔ وہ اندھیرا جنگل تھا یا کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ حقیقت تھی یا کوئی طلسم تھا۔ یہی دھرتی تھی یا کوئی اور جہاں تھا میرا گھوڑا اندھیرے جنگل کے ویرانوں میں اڑا جا رہا تھا اور جنگیوں کا خونی لشکر بادلوں کے سائے کی طرح جنگل کو لگتا چلا آ رہا تھا کوئی لمحہ گزرنا تھا کہ جنگی ہمارے سروں پر پہنچ جاتے۔ بھوری چٹائیں ہم کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے دور جنگیوں کی مشعلیں جگنوؤں کی طرح ٹٹمار ہی تھیں۔ ان کے لٹکارے صور اسرافیل کی مانند گونج رہے تھے۔ ہمارا

اچانک بوگالے نے گھوڑے کی لگام چھوڑی اور ہماری طرف بڑھا اس کے قدموں کی حرکت سے گلے میں پڑی مالائیں رقص کرنے لگیں میں مختصر وقت میں بہت کچھ سوچ چکا تھا میں نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور تن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ بوگالے مجھ سے چند قدموں کی دوری پے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھی گھوڑوں پے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں جیسے موت کی دستک تھیں میں جنگیوں کے ڈیڑھ درجن کے قریب ساتھی ہلاک کر چکا تھا ان کی نظر میں میں کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ مجھے یہاں اپنی جان کی قطعی پروا نہیں تھی بس ایک ہی بات دل میں تھی کسی طرح رینا کی جان بخشی ان لوگوں سے کروادوں۔ اس غرض سے میں آگے بڑھا اور گھٹنا زمین سے لگا کر میں نے تلوار نیچے رکھ دی اور نہایت لجاجت سے بولا۔

”سردار بوگالے! میں آپ لوگوں کا مجرم ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لئے میں نے آپ کے کئی ساتھیوں کو ہلاک کیا میں سزا کا حقدار ہوں۔ مجھے چاہے سزا دیجئے مگر..... مگر دیوتاؤں کے صدقے اس لڑکی کو یہاں سے رہائی نصیب فرمادی جائے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیسا آپ کہیں گے ویسا ہوگا میں ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔“ میری بات ختم ہوئی تو ہمارے تعاقب کرنے والا جنگیوں کا گروہ بھی موقع پر پہنچ گیا ان کے لاکاروں سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب جنگی عام خود پہنے ہوئے تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کے نعرے لگا رہے تھے اور بوگالے سے کوئی مطالبہ کر رہے تھے۔ میں زندگی اور موت کی دہلیز پے بیٹھا ہوا تھا۔ بوگالے نے عصا والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پھر پورے زور سے عصا زمین میں گھونپ دیا۔ سب جنگی یکا یک رکوع کے بل جھک گئے۔ بوگالے اونچی آواز میں ناقابل فہم زبان میں جیسے کوئی جاپ کرنے لگا اس کا وہ جاپ تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہا پھر اچانک بوگالے نے زمین میں گھونپا ہوا عصا اکھاڑا ہاتھ میں تولی اور پھر اس کی تیز دھار نوک کارخ میری طرف کر کے اس نے حیرت انگیز انداز میں دوڑ لگا دی میں اپنی جگہ پے ٹھنکا، میں نے وہ جگہ تیزی سے چھوڑی یہ ایک فطری رد عمل تھا۔

ہر طرف ایک شور محشر برپا ہو گیا۔ گھوڑوں پے بیٹھے جنگی اچھل کود کر رہے تھے جو جنگی گھوڑوں کے بغیر تھے وہ بھی والہانہ انداز میں رقص کرنے لگے تھے وہ وحشت زدہ رقص زندگی کا رقص قطعی نہیں تھا، وہ موت کا رقص تھا..... میں نے ایک نظر بے ہوش پڑی رینا کی طرف دیکھا پھر اس سے ہٹ کر میری دوسری نظر بوگالے سے ٹکرائی وہ ہمارے سر پر پہنچ چکا تھا اس کا عصا والا ہاتھ پوری طرح تن چکا تھا۔ میری آنکھوں میں ماں کی نورانی شبیہ لہرائی، راجہ کا اجالوں جیسا چہرہ چکا اور میری آنکھوں خود

گھوڑا بری طرح ہانپ چکا تھا مگر میرے سینے میں ولولوں کا ایک سمندر موجزن تھا میں گھوڑے کو بڑھا چلا جا رہا تھا پیچھے آتے جنگیوں کا فاصلہ مجھ سے تین کوس کے قریب تھا۔

اس فاصلے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بہت دور نکل جانا چاہتا تھا کہ یکا یک میری آنکھوں۔ ایک منظر دیکھا اور میرے دل میں خوف آمیز یاسیت اترتی چلی گئی۔ جس رستے پر میں سرپٹ گھوڑا رہا تھا اسی رستے پر سامنے سے جنگیوں کا ایک بہت بڑا لشکر ہاتھوں میں مشعلیں اور کا۔ جھنڈے لئے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ سب گھوڑ سوار تھے مشعلوں کی روشنی میں ان کے سیاہ چہرے غیر پر اسرار لگ رہے تھے۔ آنا فانا گھوڑ سوار جنگیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا اچھا گیا تھا۔ سب کچھ خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا رینا کے ہاتھوں کی گرفت مجھ پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ میں نے تیزی سے مڑ کر رینا کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں خوفناک انداز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی ”بوگالے“ اور پھر رینا گھوڑے پر جمبول گئی، بے ہوش ہوئی اور گھوڑے سے نیچے جا پڑی۔ میں جست لگا کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور تیزی سے رینا کی طرف بڑھا میں نے اس کا سراپے گھٹنے پر رکھا اور اسے ہوش دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ رینا کے ہونٹوں سے جو آخری الفاظ ادا ہوئے تھے وہ بوگالے کے تھے۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے لشکر کی طرف دیکھا..... گھوڑ سوار جنگیوں کے سروں پے بارہ سنگھ کے سینگوں والے فوج تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں ان کے خونخوار چہرے تھمارے تھے۔ دفعتاً ایک چہرہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک چیخ سی میرے وجود میں بلند ہوئی بوگالے ہاں وہ بوگالے ہی تھا وہ اس جنگ دھرتی کا منحوس ترین چہرہ تھا اس کے اوپر والے تین دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کی جگہ ایک میسب خلا نظر آ رہا تھا اس کے الجھے اور گندے بال شانوں سے نیچے تک لٹک رہے تھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب خونی کشش تھی۔ آنکھوں کی طرف دیکھتے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپنے کا۔ بھورے ہاتھ میں ایک لمبا عصا تھام رکھا تھا۔

عصا کی نوک زمین میں دھنسی ہوئی تھی جبکہ بالائی کنارے پے لکڑی کا عجیب و غریب نشان کندہ تھا۔ غور سے دیکھنے سے وہ نشان سانپ کے مشابہ نظر آتا تھا۔ ایسا سانپ جس نے اپنا منہ کھول رکھا ہو اور اس میں سے آگ نکل رہی ہو۔ بوگالے کی بھنویں عجیب انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں، اس کے چہرے کو خوفناک ترین بناتی تھیں اس کے گلے میں کثرت سے ہڈیوں کی مالائیں جھول رہی تھیں وہ ہڈیاں شاید مختلف جانوروں کی تھیں۔



بخود بند ہو گئیں میں ان دو خوبصورت ترین چہروں کو اپنی آنکھوں میں بسا کے دنیا سے رخصت چاہتا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ پھر یکا یک کوئی گاڑھا محلول میرے چہرے پہنے اور ناگوں پر گرا ایک خوفناک چیخ میری سماعت میں گونجی ”خون“ میں جھٹ سے آنکھیں کھول دیں ساتھ ہی گھوڑے کے بری طرح جہنہانے کی آواز آئی جو منظر پر آنکھوں نے دیکھا وہ بڑا لرزا خیز تھا۔ بوگا لے کا عصا ہمارے گھوڑے کے پیٹ میں لگا تھا اور خور ایک فوارا سا ابل پڑا تھا بے تحاشا بہتے خون نے رینا اور میرے جسم کو آلودہ کر دیا تھا گھوڑے انتریاں زمین پہ لنگ رہی تھیں اور گھوڑا بڑی قابل رحم حالت میں اچھل کود کر رہا تھا۔ دفعتاً ایک منظر نے مجھے لرزا کے رکھ دیا۔ بوگا لے نے نہایت تیزی سے آگے بڑھ کے گھوڑے کی انتریاں ہاتھ میں تھام لی۔ اس نے انتری کو ایک مخصوص جھکا دیا تو گھوڑا بری طرح جہنہانا ہوا ایک سمت کو پڑا وہ بڑا روح فرسا منظر تھا۔ گھوڑے کی انتری کا ایک سرا بوگا لے کے ہاتھ میں تھا جبکہ گھوڑا اُپ طرف کود رہا تھا اور انتری کے بل کھلتے جا رہے تھے۔ گھوڑے اور بوگا لے کے درمیان ایک رسا سا کھنچ گیا تھا۔ یہ ایسا منظر تھا جس نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ کٹا گھوڑا آخر ایک جگہ بے دم ہو کر گرا اور سالت ہو گیا۔ گھوڑے کے گرتے ساتھ ہی شور غوغا بلند ہوا یوں لگا جیسے ساری دنیا کے انسان مل کر چلا رہے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگلیوں کے غول کے فو میری سمت بڑھنے لگے پھر یکا یک لکڑی کے بنے ایک بڑے سے تختے کو میرے قریب لایا گیا میر سر پر بوگا لے نے ایک تاج نما خود رکھ دیا مجھے بڑی عزت و احترام کے ساتھ لکڑی کے تختے پہ کے جنگلیوں نے تختہ اپنے کندھوں پہ اٹھالیا میرے آس پاس جنگلیوں کا ایک جم غفیر ٹھاٹھیں مار رہا وہ سب منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ میرے آس پاس مشعلوں کا ایک جال سا ہوا تھا میں قدرت کی کارہ گری پر بار بار حیران ہو رہا تھا یہ کیسا سراب کیسی طلسم کاری تھی۔

میں تو سزائے موت کا مستحق انسان تھا مگر یہ عجیب و غریب ناقابل فہم جنگلی مجھے عزت و احترام کے رتبے پہ فائز کر کے میرے سر پہ تاج سجا کے مجھے اپنے جلو میں لئے چلے جا رہے تھے۔ بار میری نظریں پیچھے رینا کی طرف اٹھ رہی تھیں میں اس کی طرف سے پریشان تھا پھر معاً میری مشکل ہو گئی رینا مجھے نظر آگئی وہ بھی میری طرح لکڑی کے تختے پر تھی فرق اتنا تھا کہ میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ تختے پر لیٹی ہوئی تھی اور اس تختے کے آس پاس مشعلوں کا ایک دریا بہتا چلا آ رہا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ صبح ہونے میں چند گھنٹیاں باقی تھیں مشرق کی طرف سے ہلکا

دن پوری طرح چڑھ چکا تھا جب ہم جنگلیوں کی معیت میں وادی کے اندر پہنچے۔ وادی میں ہر جگہ پہل پہل نظر آرہی تھی۔ سب جنگلی جیسے عمل تویم کے زیر اثر اپنے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے کوئی کسی طرف دھیان نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں منہمک تھے۔ جنگلی عورتیں بڑے بڑے پتھر کے کڑاہوں میں بھونجن تیار کر رہی تھیں ایک طرف چند جنگلی سور اور ریچھ کی کھال اتار رہے تھے شاید کڑاہیوں میں پکنے والا کھانا انہی جانوروں کا تھا ان سے چند گز آگے ایک بوڑھا جنگلی آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ بد بدارہا تھا اور اس کے آگے سوڈیڑھ سو کے قریب جنگلی دم بخود بیٹھے تھے۔

اس سے آگے ایک جگہ ڈیڑھ درجن کے قریب بچے لکڑی کی چھڑیوں اور جانوروں کی ہڈیوں کی مدد سے کچھ کھیلنے میں مصروف تھے عین اسی جگہ مجھے ساسا نظر آئی، وہی معصوم بھولی بھالی سی ساسا جس کی لمبی صراحی دار گردن میں خوبصورت ہڈیوں کی مالا جھولتی رہتی تھی اور وہی ساسا جس کا نام لیتے ہوئے ناکو نے اپنی سانسیں توڑی تھیں۔ ساسا سے میرا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ میں آواز دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا مگر اسے آواز دینے کا کوئی موقع نہیں تھا میں لکڑی کے تختے پہ براجمان بیس بجسک جنگلیوں کے ہمراہ آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا۔ بوگا لے سمیت باقی تمام جنگلی وادی میں پیچھے ہی بجھل گئے تھے اب صرف پچیس کے قریب جنگلی میرا اور رینا کا تختہ اٹھانے نامعلوم جگہ کی طرف بڑھ رہے تھے میں اس بات سے از حد حیران تھا کہ کسی جنگلی کی آنکھوں میں میرے اور رینا کے لئے نفرت

اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ رینا کو کچھ نہیں ہونے والا۔ میں ڈیڑھ درجن کے قریب جنگلیوں کو قتل کرنے والا اگر صحیح سلامت تھا تو رینا تو بہت زیادہ رعایت کی مستحق تھی۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک چوٹی دروازہ کھلا اور کوئی اندر آ گیا۔ وہ ایک خادمہ تھی۔ اس کی عمر میں پچیس کے درمیان رہی ہوگی اس کا رنگ سانولا اور نقوش تیکھے تھے اس کے لمبے سیاہ بالوں میں رنگ برنگ جنگلی پھولوں کے گجرے سجے ہوئے تھے وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور نہایت ادب سے جھک کر بولی۔

”میں آپ کی خادمہ ہوں! حضور..... آپ مجھے جو حکم بھی دیں گے میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گی۔“ اس نے اتنی بات کی اور پھر جھک کر کھڑی ہو گئی اس کا مودب لہجہ سن کر مجھ میں حوصلہ پیدا ہوا اور میں اپنی آواز کو بھاری بناتے ہوئے بولا۔

”یہ کون سی جگہ ہے.....؟ اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے.....؟“

”حضور! یہ سردار روڈو کا محل ہے اور آپ اس وقت ان کے مہمان خاص ہیں آپ کو یہاں اس وقت تک رہنا ہے جب تک سردار روڈو چاہیں گے یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”مگر مجھے اس مقصد کیلئے یہاں رکھا جا رہا ہے.....؟“

”اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی..... مگر ایک بات ضرور عرض کروں گی آپ بڑے خوش قسمت ہیں جو آپ کو سردار روڈو کے محل میں رہنا نصیب ہو رہا ہے۔“

”سردار روڈو اس وقت کہاں ہیں.....؟“ میں بھنویں اچکاتے ہوئے بولا مجھے یہاں اپنی نشیبت کا اندازہ ہو چکا تھا۔

”وہ اس وقت محل میں موجود نہیں ہیں آج دیوتاؤں کی عبادت کی آخری رات ہے اسی سلسلے میں وہ مصروف ہیں ان سے آپ کی ملاقات کل ہوگی۔“

”کیا میں اس عبادت میں شریک نہیں ہوں گا.....؟“

”آپ کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے آج کی رات آپ اپنے کمرے میں آرام کریں گے کل کی وقت سردار محترم آپ کو ملاقات کا شرف بخشیں گے۔“

میرے سینے سے طمانیت کی ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ جنگلی مجھے میلے کی آخری رات دیوتا کے آگے قربان کرنے والے تھے۔ اس سلسلے میں جنگلیوں کے دو گروہوں کی آپس میں لڑائی بھی ہو چکی تھی ایک گروہ مجھے فوراً قتل کر دینا چاہتا تھا جبکہ

یا غصہ نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ چلنے والے جنگلی اور اس پاس کام کرنے والے تمام جنگلی معمول کے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہ بات ہمارے لئے حوصلہ افزاء تھی۔

میرا دھیان مسلسل ساسا کی طرف تھا اس کا بایاں پہلو میری طرف تھا اور وہ کسی بچے کو ڈاڑھ رہی تھی۔ اس کا دھیان میری طرف قطعی نہیں تھا میں میڑھا ہو کر کوشش کرنے لگا کہ شاید اس طرح ساسا کی صورت نظر آجائے مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ اچانک ساسا سے ڈانٹ کھانے والے بچے نے اُسے میری طرف اشارہ کیا تو ساسا کا دھیان خود بخود میری طرف ہو گیا اس کی لمبی سیاہ آنکھوں! آنسوؤں کی سرخی مجھے دور سے ہی دکھائی دے گئی۔ اس کے ہونٹ عجیب حسرت کے عالم میں کھلے تھے جیسے کچھ کہتے کہتے وہ رک گئی ہو۔ ایک دم اس نے اپنے سامنے کھڑے بچے کو گود میں اٹھایا اور اُسے سمٹ کو بھاگنے لگی وہ کافی دیر تک مجھے درختوں سے پرے بھاگتی نظر آتی رہی پھر وہ میری نظروں! اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی تختہ نما سواری زمین پر رکھ دی گئی۔ بڑے اعزاز کے ساتھ مجھے سے اتارا گیا۔ میں اپنی پذیرائی پر حیران رہ گیا۔ جنگلی میرے آگے جھکے جھکے جا رہے تھے۔ ان کا سے رویہ ایسا تھا جیسے میں ان کے لئے بہت معتبر ہستی ہوں۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ اگلے لمحوں میں مجھے ایک نہایت روشن غار میں پہنچا دیا گیا۔ غار کا اندرونی حصہ دیکھ کر میں دنگ گیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی جنگل میں کوئی اتنی خوبصورت جگہ بھی ہو سکتی ہے۔ غار کا دہانہ تھا جبکہ غار اندر سے جا کر نہایت وسیع ہو گیا تھا۔

مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں اس وسیع وعریض غار میں ایک پورا شہر آباد ہر طرف چہل پہل جاری تھی۔ پہاڑ کو اندر سے تراش کر خوبصورت کمرے اور راہداریاں بنائی گئیں۔ حسین خادما میں یہاں سے وہاں گردش کر رہی تھیں۔ ایک وسیع احاطہ عبور کر کے مجھے ایک سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا کمرے کی آرائش دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

خوبصورت چوٹی مسہری وسیع کمرے کے درمیان میں دھری تھی مسہری کے آس پاس نہایت خوبصورت پھولوں کے گلدستے رکھے ہوئے تھے۔ ہر طرف لوہان کی خوشبو گردش کر رہی تھی۔ پھول اور لوہان کی خوشبو نے مل کر عجیب مسکور کن خوشبو کو جنم دیا تھا۔ مجھے ساتھ لانے والے جنگلی مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں پھر کمرے کو دیکھنے لگا۔ ہر چیز قرینے اور سلیقے سے سجی ہوئی تھی وادی میں پہنچتے ہی رینا مجھ سے ملے ہو گئی تھی اس کو اٹھانے والے جنگلی اسے اور سمت لے گئے تھے میں رینا کی وجہ سے پریشان تھا مگر

نہا کر جب میں نے نئی پوشاک زیب تن کی تو ایک عجیب طرح کا سرور میری طبیعت پر چھا گیا۔ میں بالوں کو ابھی خشک ہی کر رہا تھا کہ پوباشے میرے لئے ناشتہ لے کر آگئی۔ ناشتے میں جنگلی پھل اور ہرن کا دودھ میرا منتظر تھا۔ میں نے جی بھر کے پھل کھائے اور دودھ پیا اتنی دیر پوباشے میرے سامنے کھڑی رہی جب میں سیر ہو گیا تو اس نے برتن میرے آگے سے اٹھائے اور باہر نکل گئی اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ دوسری جنگلی عورتوں کی طرح اس نے بھی بالوں کی مینڈیاں بنا رکھی تھیں۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کا ارادہ بھانپ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا اپنی جگہ سے میں اٹھتے ہوئے بولا۔

”پوباشے! میری ساتھی عورت اس وقت کہاں ہے؟“ میرے بدلے تیور اور اچانک ایسے سوال سے پوباشے گڑبڑا سی گئی شاید وہ میری طرف سے کسی اور رد عمل کی توقع لگائے بیٹھی تھی سنبھلتے ہوئے بولی۔

”آقا! وہ اس وقت بالکل خیریت اور حفاظت میں ہیں بہت جلد آپ سے ان کی ملاقات کروا دی جائے گی۔“

”میں ابھی اور اسی وقت اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ایسا نہیں ہو سکے گا! آقا!..... ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔“

”کیوں ایسی کیا بات ہے.....؟“ میں اپنے لہجے کو رعب دار بناتے ہوئے بولا۔

”اس وقت بستی کی عورتیں اسے تیار کر رہی ہیں؟“

”تیار کر رہی ہیں میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“ میں نے جملہ ادا کیا پھر معاً مجھے خیال آیا اور میں سر تا پا لرز کر رہ گیا۔ میلہ ختم ہونے کے بعد رینا کی شادی سردار رواڈو کے ساتھ ہونا تھی تو کیا یہ سب پذیرائی رینا کی شادی کے سلسلہ میں تھی۔ میں دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

”اسے کس لئے تیار کیا جا رہا ہے؟“ میں تیز لہجے میں بولا۔

”اس بارے میں تو مجھے کچھ خبر نہیں۔“ پوباشے کی بات سن کر میں مسہری کے گرد پکڑنے لگا بار میرا دھیان ان تلواروں کی طرف اٹھ رہا تھا جو مسہری کے دائیں طرف دیوار پے آویزاں تھیں۔ سردار رواڈو مجھ سے ملنے آنے والا تھا میرے لئے سنہری موقع تھا میں رواڈو کا سر قلم کر کے یہ شادی رکوا سکتا تھا۔ لہجہ میرے تیور بگڑنے لگے میری آنکھوں میں خونی ڈورے تیرنے لگے۔

پوباشے نے جیسے میرا چہرہ پڑھ لیا اٹھتے ہوئے بولی۔ ”آقا! آپ کے من میں اگر کوئی غلط

دوسرے گروہ والے لوگ مجھے دیوتا کے آگے قربان کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات مجھے ناکو سے معلوم ہو چکی تھی اور ناکو کی ہی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ جنگلی جو فیصلہ ایک دفعہ صادر کر دیں اس سے پیچھے نہیں ہٹے ناکو ہی کے ذریعے مجھے یہ بھی معلوم پڑا تھا کہ جنگلی مجھے ہر صورت میلے کی آخری رات دیوتا کے آگے قربان کر دیں گے مگر یہ خادمہ مجھے اور ہی کہانی سنار ہی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق مجھے عبادت والی جگہ پر نہیں جانا تھا اور کل سردار رواڈو مجھ سے ملاقات کرنے والے ہیں۔

خادمہ کی معلومات کس حد تک ٹھیک تھیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا مگر میری چھٹی م پکار پکار کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ علی نواز! خوش قسمتی کا قرعہ تمہارے نام نکل چکا ہے تم ذلت کی مورد سے بچ کر عزت کی مسند پر آ بیٹھے ہو تمہاری جان بخشی ہو چکی ہے۔

وہ سارا دن اور آگلی رات میری بہت مشکل میں کئی رہ رہ کر مجھے یہ خیال آتا تھا کہ ابھی دوا جلا قسم کے جنگلی کمرے میں داخل ہوں گے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے مقتل کی طرف لے چلیں گے۔ مگر چیخ و پکار کروں گا مگر کوئی میری بات نہیں سنے گا اور مجھے فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا مگر خدا کا شکر! کچھ نہیں ہوا۔ ٹویل اور صبر آزمائے مارت گزر گئی۔ تمام رات ڈھول ڈھمکے اور عجیب و غریب آوازیں آ رہیں اور پھر زندگی کی رعنائیوں سے بھر پور دن چڑھ گیا۔

کل والی خادمہ ہاتھوں میں خوبصورت پوشاک لئے کمرے کے اندر آگئی۔ پوشاک پر جا ترشے خوبصورت پتھر اور نگینے لگے ہوئے تھے۔ خادمہ (جس کا نام پوباشے تھا) نے ایک ادا سے میرا طرف دیکھا اور کپڑے مسہری پر ڈھیر کر کے میرے قریب چلی آئی۔ مخمور نگاہ مجھ پر ڈال کر بولی۔

”آقا! آپ رات آرام میں تو رہے۔“

”ہاں بالکل آرام میں رہا۔“

”آپ جلدی سے نہا کر تیار ہو جائیں۔ سردار آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ میرا طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ ”نہانے کی جگہ کہاں ہے؟“ میں نے ماتھے پے تیوری ڈال کر پوچھا۔ اس نے ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ میں کمرے کے اندر ہی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی گلی میں گزر کر غسل خانے میں پہنچ گیا۔ بڑے سے پتھر کے بنے ہوئے قدرتی ٹب میں پانی بھرا ہوا تھا۔ غسل خانے میں ہر طرف کسی چیز کی خوشبو رچی ہوئی تھی وہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ خوشبو پانی کے اندر اٹھ رہی تھی۔ پانی میں عرق گلاب اور بیری کے پتے ڈالے گئے تھے جس نے پانی کو خوشبو دار کر

ہمیں مل جائے گی۔ وہ بھی تمہیں ملنے کے لئے بے حد بے چین ہے۔“ سردار کی بات سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا میں خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ سردار جسے میری محبوبہ کہہ رہا تھا وہ رینا تھی۔ وہ لوگ رینا کو میری محبوبہ سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ جو بھی سمجھتے مجھے میری بہن واپس مل رہی تھی۔ میں دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا۔ سردار کی بات سچ ثابت ہوئی دوسرے دن ہی رینا محل میں پہنچ گئی۔

وہ بزارقت آمیز منظر تھا۔ رینا روئے جا رہی تھی غم اور خوشی کے آنسو اُس کی آنکھوں میں گڈ گڈ ہو گئے تھے۔ میں نے بھی خود کو رونے سے بمشکل سنبھالا تھا۔ سردار نے رینا سے شادی کیوں نہیں کی اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا۔ مجھے اس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میری بہن میرے پاس موجود تھی مجھے اور کچھ نہیں چاہئے تھا۔ اس رات ہم دونوں بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رینا کی زبانی ہی مجھے پتا چلا کہ یہ لوگ رینا کو رابعہ کے دھوکے میں اٹھالائے تھے۔ کیوں اٹھالائے تھے رابعہ نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اتنا خوفناک شب خون ہمارے پڑاؤ پر مارا تھا۔ اس بارے میں رینا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ جنگیوں نے رینا کو کسی سزا کا مستحق کیوں نہیں ٹھہرایا تھا۔ رینا کی سردار سے شادی بھی ملتی ہو گئی تھی۔ یہ قدرت کی کیسی کرشمہ سازی تھی۔ شاید میری بہادری جو ان جنگیوں کی نظر میں قائم ہو چکی تھی اُس کی بدولت سارے طوفان ختم گئے تھے۔ خیر جو کچھ بھی تھا ہمارے حق میں بہتر تھا۔

اس دن کے بعد رینا نے میرے ساتھ والے کمرے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لئے ہم نے ایک بہانا تراش کر جنگیوں کو مطمئن کر لیا تھا۔

یہ پہاڑ کی کھوہ میں بنا ہوا ایک عظیم شان محل تھا۔ کمرے، راہداریاں، غلام گردش، باغیچے، پھولداریاں، اصطلیل، سب کچھ اس محل میں تھا۔ انسانی ہاتھوں نے کمال مہارت سے اس محل کو تراشا تھا۔ پہاڑ کے درمیان پانچ سو گز محیط کا کھلا احاطہ تھا۔ پہاڑ کی چوٹی کی نہایت خوبصورتی سے اوپر سے صاف کر دیا گیا تھا اب اس قطع زمین پر باغیچے لہلہا رہے تھے اور باغیچوں کے گرد گرد پہاڑ کے اندر تراشے ہوئے کمرے اور راہداریاں تھیں مہذب دنیا میں اگر یہ محل ہوتا تو شاید ایک شاہکار کی مانند ہوتا۔ دوسرے دن سہ پہر کے وقت جب میں رینا کے ہمراہ باغ کی طرف گیا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ سورج کی الوداعی کرنیں سرسبز باغیچے اور پھولوں کی لمبی قطار پر پڑ رہی تھی۔ پھولوں کی لمبی قطار میں رنگ برنگے نسل نسل کے پھول لہلہا رہے تھے۔ اتنے خوبصورت پھول دیکھ کر اچانک میرے دل میں

خیال پل رہا ہے تو اسے اپنے من میں سے نکال دیجئے آپ یہاں بالکل محفوظ اور مامون ہیں یہاں آپ کو کسی قسم کی پریشانی یا تکلیف نہیں اٹھانا پڑے گی۔“

”پوہاٹے! سردار کب آرہے ہیں؟“

بس ابھی تھوڑی دیر میں ہی پہنچنے والے ہیں..... ابھی اس کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ باہر غلام گردش میں کھٹ پٹ سنائی دی۔ پوہاٹے بڑی تیزی سے باہر کی طرف لپکی میں بھی اپنی جگہ پڑا کھڑا ہوا اسی دوران بہت سے قدموں کی آواز آئی اور پھر دوسرے ہی لمحے چار نفوس کمرے میں موج تھیں۔ ان میں سے ایک کریمہ شکل بوگالے تھا دوسرا سردار روہان تھا جو مجھے اس وادی تک لے کر آیا تھا تیسرا سردار رواڈو تھا اور چوتھا وہ گرانڈیل جنگلی تھا جسے میں نے رینا کے ہٹ کے باہر یادگار پھینکی تھا تھی اس کے ناک کا بانہ ٹوٹ گیا تھا بعد ازاں وہ بے ہوش ہوا تھا اس کی ناک ایک طرف کو مڑ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ عجیب صورت اختیار کر گیا تھا اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے لپک رہے تھے۔ مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے نظریں پھیر کے سردار رواڈو کی طرف دیکھا وہ چھٹنڈا چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا وہ دوسروں سے قدرے خوبصورت تھا وہ چند لمحے غور سے مجھے دیکھتا رہا میرے قریب پہنچ کر میرے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”تو تم ہو..... وہ جوان۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ پھر ہنکارہ بھر کے بولا۔ ”تم نے تن تنہا ہمارے کئی ساتھیوں کو ہلاک اور زخمی کیا..... ہم تمہاری بہادری کی قدر کرتے ہیں۔ بہادر لوگ ہمیں بہت پسند ہیں۔ ہمارے اتنے آدمی اگر تم نے کسی کی مدد سے کسی کے ساتھ مل کر مارے ہوتے تو تمہاری سزا یقیناً موت ہوتی مگر یہ کارنامہ تم نے اکیلے سرانجام دیا ہے۔ جس کی وجہ سے تم موت کی بجائے انعام کے حقدار ٹھہرے ہو۔ ہم تمہیں اپنے خاص مشیروں میں شامل کرنے آئے ہیں۔“ سردار رواڈو نے یہ کہنے ہوئے بوگالے کے ہاتھ پر رکھا ہوا خود نما تاج میرے سر سے اتار کر ایک اور طرف رکھ دیا وہ گینڈے کے سینک کا بنا ہوا تھا۔

میں موقع کی تلاش میں تھا کہ سردار رواڈو سے رینا کے متعلق بات کر سکوں۔ یہ خوش خبری میرے لیے بہت بڑی تھی کہ میری جان بخشی ہو چکی تھی مگر میں رینا کے بدلے میں اپنی زندگی حاصل کرنا چاہتا تھا اگر مجھے ایسی زندگی ملتی تو وہ ہزار موتوں سے بدتر ہوتی۔ میں نے رینا کی بات کر کے لئے اپنے لب کھولے ہی تھے کہ سردار رواڈو نے میری بات کاٹی اور وہ بولا۔ ”نو جوان! تم وادی میں بالکل محفوظ اور مامون ہو۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو جو چاہو کر سکتے ہو۔ تمہاری محبوبہ بھی“

اداسی کی ایک طویل لہر اتر گئی۔ ایک مہتابی چہرہ ہزار ہا شدتوں کے ساتھ میرے پردہ بصارت سے جلوہ افروز ہو گیا۔ رابعہ مجھے بے طرح یاد آئے گی۔ آج اُسے دیکھے ہوئے پورے ایک ماہ ہو چلا تھا۔ ایک ماہ میرے لئے بہت بڑی مدت تھی۔ آخری دفعہ میں نے رابعہ کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا۔ خوابیدہ چہرہ ان رنگ برنگے پھولوں کی ہی مانند تھا۔ ان لال پیلے سفید ہرے گلابی پھولوں میں سے ہی کوئی پھول اُس اجالوں جیسے چہرے کے مشابہ تھا۔ میں ایک پھولاری کے قریب بیٹھ کر ایک نازک سی پھول کی کلی کو انگلی کے پودوں سے چھونے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ کلی نہ ہو بلکہ رابعہ کا نازک رخسار ہو۔ جیسے میں رابعہ کے پاس بیٹھا ہوں اور اُس سے ہم کلام ہوں۔ اچانک میرے دل سے اک صدا سی بلند ہوئی۔ ”رابعہ! دیکھو تمہارے پیار کی طلب نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔ میں درد کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ اب میرا حوصلہ جواب دیتا جا رہا ہے۔ میری نبض ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے تمہارے ایک چھوٹے سے اقرار کی ضرورت ہے ایسا اقرار جو مجھے ہر امتحان سے بچا کر سرخرو کر دے اور میں تمہیں لے کر واپس لوٹ جاؤ۔ جہاں دو بوڑھی آنکھیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔“

میں اپنے خیالات سے تب چونکا جب رینا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے جھنجھوڑا۔ میں نے رینا کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں بے نام سے اداسی تیر رہی تھی۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

”علی نواز! کیا سوچ رہے ہو.....؟“

”کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں.....“ میں رینا سے نظریں پُرا کر بولا۔

”علی نواز! اپنی بہن سے چھپاؤ گے.....؟“

میں خاموش رہا وہ میرا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ”علی نواز! مجھے معلوم ہے تم رابعہ! خود سے بھی بڑھ کر چاہتے ہو اور اسی کے لئے تم پاکستان سے یہاں آئے ہو۔“ میں حیرانگی سے رینا کا چہرہ دیکھتا چلا گیا۔ ”تم کیسے جانتی ہو؟“

”مجھے سب انکل مدثر نے بتایا تھا۔“

رینا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”علی نواز! رابعہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت پیاری اور سمجھدار ہے۔ تمہارا جیون ساتھی اُس سے اچھا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر ایک خرابی ہے جو ہر خرابی بھاری ہے۔ رابعہ شہناز کو ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ وہ اُس کے بنا نہیں جی پائے گی۔ میری بات سے یقیناً تمہارا دل ٹوٹا ہوگا مگر ایک عورت اور رابعہ کی سہیلی ہونے کے ناطے میں یہ یقین کے ساتھ کہتا

ہوں کہ رابعہ کے دل میں اور کوئی مرد اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ یہ سب باتیں میں تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ پوری دنیا میں اس وقت تم مجھے سب سے عزیز ہو۔ اور یہ بہن کبھی نہیں چاہے گی کہ اُس کا بھائی کسی غلط فہمی میں اپنی زندگی برباد کر لے۔ علی نواز..... رابعہ کو ایک سہانا پسنا سمجھ کر بھول جاؤ۔ جس رُخ تم جا رہے ہو وہ تمہاری منزل نہیں ہے۔“

یکا یک میری ہچکی بندھ گئی اور میں روتا چلا گیا۔ رینا میرے پاس بیٹھ گئی میرا سر اپنے کندھے پر رکھ کر مجھے دلاسہ دینے لگی۔ وہ جوں جوں دلاستہ دیتی میں اور زیادہ بلکنے لگتا۔

میری ہچکیاں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئیں۔ آواز آہستہ ہوتی چلی گئی۔ رینا مجھے برابر دلاسہ دے رہی تھی۔ ”رونے سے آدمی کا من ہلکا ہو جاتا ہے۔ آنسو آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کے داغ بھی دھو ڈالتے ہیں۔ جی بھر کے رو لو علی نواز! کیونکہ آج کے بعد تمہیں رابعہ کے لئے نہیں رونا ہے..... تمہیں اُس کو بھولنا ہے۔“ رینا اپنی دانست میں بولتی جا رہی تھی اور میرے دل میں موت کے لئے اندھیرے چھا رہے تھے۔ وہ بے چاری سمجھ رہی تھی میں ٹھوڑی دیر رولوں گا اور چپ کر جاؤں گا۔ مگر اُسے بھلا کیا معلوم تھا کہ رابعہ کی چاہت کی آگ نے مجھے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔

رات کا شاید دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا میں مشعل کے قریب بیٹھا سوچ میں گم تھا کہ اچانک باہر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا میں اپنا چہرہ موڑ ہی رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ کھلے دروازے میں سے کوئی ہیولہ ریگ کر اندر داخل ہوا ہے۔ دروازے کے قریب اندھیرا تھا میں بغور وہاں دیکھنے لگا مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اسے اپنا وہم جانا مگر پھر میرے دماغ میں شک نے سر اُٹھا میں نے مشعل ہاتھ میں تھامی اور اس اندھیرے کونے کی طرف ہولیا۔ ابھی میں دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک جسم میری طرف بڑھا اُس کے ہاتھ میں چمکتی تلوار مجھے دور سے نظر آگئی تھی۔ پہلا وار اتنا خوفناک تھا کہ اگر ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو تلوار میرا دایاں کندھا بازو سمیت اتار دیتی۔ عین وقت پر میں نے حملہ آور کا وار جھکائی دے کر بچایا۔ تلوار پتھر کی دیوار کے ساتھ ٹکرائی اور ہر طرف چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ حملہ آور مکمل سیاہ لباس میں تھا اس کا چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک مشعل ہی تھی جو اس آڑے وقت میں کام آسکتی تھی۔ میں نے مشعل کو تلوار کی صورت ہاتھ میں تھا اور حملے کا انتظار کرنے لگا۔ حملہ آور بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور پے در پے مجھ پر وار کرنے لگا۔ اُس کی پھرتی، تیزی اور دلیری سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ آور میرے قتل کے ارادہ سے آیا ہے۔ اُس کے وار میں پیچھے ہٹ کے بچا رہا تھا۔ میں کبڈی کے

انداز میں پورے کمرے میں گھوم رہا تھا پھر ایک جگہ میرا دواؤ چل گیا۔ اُس کا ایک وار خالی گیا تو میری مشعل کی بھرپور ضرب اُس کی کمر پے لگی وہ دوہرا ہو کے رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اُس پر مزید وار کرتا اُس کی تلوار چشم زون سے حرکت میں آئی اور لکڑی کی مشعل میرے ہاتھ میں دو ٹکڑے ہو گئی۔ مشعل کی جلتی آگ نیچے گری تو ایک دم سے روشنی مدہم ہو گئی حملہ آور نیم اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گیا۔ میں نے باہر نکل کر اُس کا پیچھا کافی دور تک کیا مگر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تمام پہرے دار اپنے حجروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میں نے سنسان راہداریوں کی طرف ایک دھیان مارا ہر راہداری میں ایک ایک مشعل روشن تھی۔ وہاں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں واپس لوٹ گیا۔ دیوار سے لگی تلوار اتاری اور اپنی گود میں رکھ لی میرا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ حملہ آور کون تھا؟ وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟ کہیں سردار رواؤ وہی تو حملہ آور کو بھیجے والا نہیں تھا؟ مگر نہیں اس بات کو میرا ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ سردار رواؤ با اختیار تھا مجھے مارنا مقصود ہوتا تو وہ سرعام یہ فعل سرانجام دے سکتا تھا کوئی اُسے روکنے والا نہیں ہوتا۔ کہیں بوگا لے نے ایسا تو نہیں کیا تھا مگر ذہن نے اس بات کی بھی نفی کی بوگا لے مجھے لکڑی کے تختے سے بٹھا کر عزت و احترام سے یہاں لانے والا تھا وہ بھلا ایسا کیونکر کر سکتا تھا۔ پھر دفعتاً میرا دھیان اُس گرائڈیل جنگلی کی طرف چلا گیا جو میرے ہاتھوں سے گھائل ہو کر اپنا ناک تڑوا بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی جلتی ہوئی نگاہیں یاد آئیں اور سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا ہونہ ہو یہ اسی کا کام تھا۔ میرے دل نے کہا۔ مگر حملہ آور تو دہلا پٹلا تھا جبکہ وہ جنگلی خاصا بھاری جسم کا مالک تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے کسی ساتھی کو بھیجا ہو؟ دماغ نے تو جیہہ پیش کی۔ وہ رات میں نے تلوار گود میں رکھ کر گزاری دی۔ رہنا یا کسی اور ملازم کو اس لئے نہیں اٹھایا کہ یوں شور مچ جائے گا۔

ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ اسی طرح ہنسی خوشی میں گذر گیا۔ اس ڈیڑھ ہفتے میں مجھے یہ معلوم پڑ چکا تھا کہ ایک چھوٹی سی ملاقات میں رہینا شاہنواز کو اپنا دل دے بیٹھی تھی۔ وہ اُسے پیار کرنے لگی تھی۔ وہ اُس سے شادی کی خواہش مند تھی۔ مگر جب اُس کو انکل مدثر کے ذریعے یہ پتا چلا کہ رابعہ شاہنواز کو دیوالوں کی طرح چاہتی ہے تو رہینا پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے رابعہ کے لئے اپنی محبت کی قربانی دے دی۔ اب رہینا بالکل مطمئن اور شانت تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ مجھے کسی قسم کی محرومی کا احساس نہیں ہے۔ مگر یہ میں جانتا تھا کہ وہ اب بھی شاہنواز کے لیے تڑپتی ہے۔ چاہتے ہوئے بھی میں رہینا کو شاہنواز کے کردار کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ شاید میں مزید اُس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے شاہنواز کی زبانی ہی پتا چلا تھا کہ وہ رہینا کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور رہینا کو حاصل کرنے کے پیچھے اُس کا پیار نہیں بلکہ دینے کی تلاش کا فرما تھی۔ وہ منافق ترین اور دو چہرے رکھنے والا انسان تھا۔ وہ ایک طرف رہینا سے پیار ڈال کے دینے تک پہنچنا چاہتا تھا تو دوسری طرف رابعہ کو جم کٹی کے ہاتھوں سچ کر خزانے کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔

جم کٹی اور سارا گروپ اس وقت کہاں تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر میں نے دل میں پکا عہدہ کر لیا تھا کہ واپس جاتے ہی مجھے رابعہ کو ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرنا تھا اور واپس لوٹ جانا تھا اور اگر کوئی میرے رستے کی دیوار بننا تو میں بڑے سے بڑا قدم اٹھانے کے لئے تیار تھا۔

وہ بڑی خوشگوار اور نرم آلودرات تھی۔ شام سے ہی بوند باندی شروع ہو گئی تھی جواب رات کے وقت تھم گئی تھی۔ بیگی بیگی ٹھنڈی ہوا شرقاً غرباً چل رہی تھی۔ غلام گردش اور راہداریوں میں دیواروں سے اوپر اس مشعلوں کی لوہا سے تھرا رہی تھی۔ میں چہل قدمی کرتا ہوا کھلے آسمان تلے جا پہنچا۔ دن کے وقت یہ جگہ آباد ہوتی تھی۔ ہر طرف چہل پہل اور خادین کام کرتے نظر آتے تھے مگر شام پڑتے ہی یہ جگہ ویران جنگل کا نمونہ پیش کرتی کر رہی تھی۔

یہ رواؤ کا خاص محل تھا۔ یہاں زندگی ایک معمول کے تحت چلتی تھی۔ جنگلی دنیا کی حسین ترین لڑکیاں اس محل کی کینیز تھیں۔ جن میں ساسا بھی شامل تھی۔ ساسا مجھے سرے راہ دو تین دفعہ ملی تھی مگر میری اُس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ میں اُس سے ملنا چاہتا تھا اُس سے نا کو کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا کہ واقعی وہ اُس کا باپ تھا یا اُس سے اُس کا کوئی اور رشتہ تھا۔ آخری وقت اُس کے لبوں سے ساسا کا نام ہی نکلا تھا۔

اس محل کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ یہاں کی کینیزوں اور خادموں کی آنکھیں بہت لمبی اور موٹی موٹی تھیں۔ یہ سب لوگ سارا دن کام میں بٹے رہتے تھے۔ ان کے چہرے ہر وقت ہشاش بشاش اور تروتازہ رہتے تھے۔ یہ محل بڑے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا میں نے ابھی اس کا ایک چوتھائی حصہ بھی گھوم پھر کے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ مجھے یہاں ہر جگہ گھومنے پھرنے کی آزادی تھی میں جہاں چاہتا جا سکتا تھا۔

آج یوں ہی دل چاہا تو میں اس کھلے احاطے کی طرف چلا آیا۔ مجھے ابھی تک محل میں کوئی پہرہ دار نظر نہیں آیا تھا۔ بس صرف داخلی دروازے پر جو غار کے دہانے پر واقع تھا دو پہرے دار کھڑے رہتے تھے۔ ڈیڑھ ہفتہ پہلے مجھ پر جو قحطانہ حملہ ہوا تھا وہ حملہ آور یقیناً محل کے اندر ہی موجود تھا کیونکہ

کوئی بندہ رات کے وقت محل میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں حملہ آور کی طرف سے قطعی بے خبر نہیں تھا۔ حملہ آور میرے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور موقع تازہ کر وہ مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اب نیا م کس لی تھی۔ دو دھاری تلوار ہر وقت میری نیا م میں رہتی تھی۔ یہاں میں کس حیثیت سے مقیم تھا اس کا ٹھیک تعین بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ سردار رواڈو اور بوگا لے مغرب کی سمت کھڑے بلند پہاڑ کے دوسری طرف گئے ہوئے تھے۔ اُن کی واپسی چند روز میں متوقع تھی۔ اُن کے یہاں پہنچتے ہی مجھے اپنے مقام کا ادراک ہونا تھا۔ میں کھلے احاطے میں گھوم رہا تھا کہ مجھے ایک طرف اچھری سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نظر آئیں۔ میں سیڑھیوں کی سمت ہولیا۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں گھومتی ہوئی بہت دور تک جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کا اختتام ایک کھلی راہداری میں ہوا۔ راہداری بہت دور تک چلی گئی تھی۔ راہداری کے داہنے طرف دو درجن کے قریب جھروکے کھلے احاطے کی طرف کھلتے تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ راہداری کے وسط میں اچانک ایک طرف سے ایک پہریدار نکلا اور میرے سامنے آگیا۔ پھر اچانک مجھے دیکھتے ہی اُس کا رویہ مودبانہ ہو گیا۔ سر جھکاتے ہوئے اُس نے میرا رستہ چھوڑ دیا۔ میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ راہداری کے اختتام پر کھڑے پہرے دار نے بھی تعظیم سے سر جھکا دیا اور مجھے رستہ دے دیا۔ مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ پہرے دار مجھے پہچانتے نہیں پھر کس وجہ سے میری اتنی تعظیم کر رہے ہیں پھر کیا ایک میزادھیان سرپے پہنے اُس مخصوص خود کی طرف چلا گیا جو سردار رواڈو نے میرے سر پر رکھا تھا۔ تو کیا یہ خود تعظیم کی وجہ تھا۔ ایک دم میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ میں تمکنت سے چلتا ہوا سیڑھیاں نیچے کی طرف اترنے لگا۔ راہداری کے اختتام پر یہ سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک اور لمبی راہداری میرے سامنے تھی۔ راہداری کے دونوں اطراف وقفے وقفے سے خوبصورت جنگلی خادما میں کھڑی تھیں ان کے دونوں ہاتھ تعظیم کے انداز میں بندھے ہوئے تھے اور سر جھکے ہوئے تھے۔ میں نے قدم بڑھایا تو بڑھاتا ہی چلا گیا۔ راہداری ختم ہونے کے قریب تھی اور سیڑھیاں پھر اوپر کو چڑھ رہی تھیں کہ ایک خادمہ لڑکی جلدی سے آگے بڑھی اور اُس نے اپنا سر میرے پاؤں میں دھر دیا۔ میں جلدی سے اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو.....؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

اُس نے سر اٹھایا تو میں حیران رہ گیا وہ ساسا تھی وہی دلربا جنگلی ساسا جس سے میری پہلی ملاقات بٹ میں ہوئی تھی۔ اس وقت اُس کی غزالی آنکھوں میں آنسوؤں کے جگنو ٹمٹما رہے تھے۔

اب اٹھ کے میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

”ساسا! تم کیسی ہو.....؟“ میں مروت بھرے لہجے میں بولا۔ وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔

”اچھی ہوں.....“

”ساسا..... میں بہت دنوں سے تمہیں ملنا چاہ رہا تھا۔“

میرے سوال پر ساسا خاموش رہی پھر دھکی لہجے میں بولی۔ ”کیا کرو گے مجھ سے مل کر.....؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا.....؟“ میں سوالیہ لہجے میں بولا۔

”علی نواز! میری دنیا اندھیر ہو چکی ہے۔ میرا آخری سہارا بھی ٹوٹ چکا ہے۔ میرا باپ مجھ سے جدا ہو چکا ہے۔“

ساسا کی بات سن کر وہ تمام مناظر میری نگاہوں میں تازہ ہو گئے اور ناکو کے کیے ہوئے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

”ساسا! تم ناکو کی بیٹی ہو.....؟“

”ہاں..... میں اُسی کی بد نصیب بیٹی ہوں.....“

میرا دل ہولنے لگا۔ ناکو نے میری رہائی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی وہ میری زندگی کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ اگر ناکو کی قربانی بیچ میں نہ ہوتی تو میں کب کا دیوتاؤں کے چرنوں میں قربان ہو گیا ہوتا۔ اب اُسی محسن کی بیٹی میرے سامنے ایک کینز کی صورت کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ میں اُس کے احسان کے بوجھ تلے دبا پڑا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے پھر۔

میں اس سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا کہ اچانک ایک طرف سے سردار روبان بڑا آمد ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی تمام خادما میں سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ سردار روبان بدستور چپتے کی کھال اوڑھے ہوئے تھا۔ سردار روبان مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ اُس کے ساتھ پوباشے بھی تھی۔ میں پوباشے کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ وہ اکثر میرے کمرے کے ساتھ والے حجرے میں مقیم رہتی تھی۔

سردار روبان میری خیریت دریافت کرنے لگا۔ پھر وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سیڑھیاں اوپر چڑھنے لگا۔ پوباشے ہمارے ساتھ تھی۔ سردار روبان مجھے سردار رواڈو کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ اس وقت پر بت کے اُس پار نہایت ضروری کام سے گیا ہوا ہے۔ اُس کی واپسی بس اب ہونے کی دالی ہے۔ اُس کے یہاں پہنچتے ہی بہت اہم فیصلے ہوں گے۔

مجھے معلوم پڑا کہ مٹی کے برتن میں نیلا محلول ”دوف“ ہے جو زہریلی جنگلی بیل ”بلبل کی جڑ“ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس محلول سے انسانی گوشت گل کر ہڈی سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس تڑپتے پھلتے قیدی کو زمین پر پٹخ دیا گیا۔ اُس کے دونوں پاؤں ٹخنوں تک گوشت سے عاری تھے۔ گوشت کی جگہ ہڈیوں کا پتھر نظر آ رہا تھا۔ وہ قیدی بے ہوشی کی حالت میں بھی کراہ رہا تھا۔ اُس سے اگلے زندان میں ایک قیدی برہنہ حالت میں زمین پر بیٹھا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر واہیل کر رہا تھا۔ اُس کو اس کے رخساروں پر پھیل چلے آ رہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اُس کو کیا تکلیف ہے پھر اچانک ہی ایک منظر نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا۔ دو کارندوں نے آگے بڑھ کر اُس کے جسم پر کچھ سفوف چھڑکا۔ سفوف اُس برہنہ مادر زاد پر پڑنے کی دیر تھی۔ وہ عجیب بے ڈھنگے انداز میں اچھل کود کرنے لگا۔ اُس کے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں اپنا ہی جسم کھرچنے اور نوچنے لگے۔ اس سفوف نے اس کے جسم میں خارش جگا دی تھی۔ وہ قیدی بے دریغ خارش کئے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے ناخنوں سے اپنے جسم پر خون کی لائیں کھینچ دی پھر تھوڑی دیر میں اُس کا جسم جگہ جگہ سے خون اُگلنے لگا۔ مگر وہ برابر زخموں پر بھی خارش کئے چلے جا رہا تھا۔ وہ اپنے زخموں کو کھرچ رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ مگر ہاتھوں کی حرکت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا۔ میں آگے بڑھا تو ایک قیدی کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اُس کی آنکھوں پر کوئی سفوف چھڑکا گیا تھا۔ وہ باؤلے جانور کی طرح پورے زندان میں چکرار پھر رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں پتا نہیں کتنی شدید تکلیف تھی وہ زندان کی سلاخوں سے اپنا چہرہ اور آنکھیں رگڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر نہ بندھے ہوئے تو وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ پتا نہیں کیا کرتا۔

”یہ بوکاشی دیوتا کی نگری کا ایک چھوٹا سامنہ ہے۔“ سردار روبان نے کہنا شروع کیا۔ ”ان سب لوگوں کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے بوکاشی دیوتا کے فرمان کی خلاف ورزی کی تھی۔ ان کی سزا ہمیں ختم نہیں ہوگی بلکہ روزانہ ان کو اس عذاب سے گزرتا پڑے گا ان کی خلاصی ان کی موت ہے۔ موت ہی ان کو اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہے۔“ سردار روبان مجھے لیتا ہوا ایک طویل ہال کمرے میں آگیا۔ یہاں جا بجا حنوط شدہ سانپ دیواروں کے ساتھ لٹک رہے تھے۔ ایک بڑے زندان کے سامنے پہنچ کر سردار بولا۔ ”ان لوگوں کو دیکھو۔“ وہ دو درجن کے قریب مرد و زن قیدیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں بوکاشی دیوتا کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ میں نے تمہیں شاید پہلے ہی بتایا ہے کہ بوکاشی دیوتا زندگی اور موت

سردار روبان مجھے لیتا ہوا ایک گہری سرنگ نما راہداری میں گھس گیا۔ یہ محل ایک گورکھ دھنر تھا۔ باہر سے نظر آنے والا خشک پہاڑ حقیقت میں کئی دفن پیمیاں لیے ہوئے تھا۔ یہ مجھے اب معلوم ہو رہا تھا۔ سردار روبان مجھے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں لے گیا۔ یہاں کنیزوں کی فوج مسہری اطراف میں کھڑی تھی۔ میں سردار روبان کے ساتھ مسہری پر بیٹھا تو کنیزیں پچکھا جھٹکنے لگیں۔ سردار نے مولے کا لے کر بھرے انگوروں کا ایک خوشہ اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

”علی نواز! تم بڑے خوش قسمت ہو جو تمہیں بوکاشی دیوتا کی طرف سے سلامتی نصیب ہو رہی ہے۔ بہت کم لوگ یہ مقام پاتے ہیں۔“

”یہ بوکاشی دیوتا کون ہیں؟“ میں انگور کا دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”بہت جلد تمہاری ملاقات اُن سے کروادی جائے گی۔ وہ بہت مہمان دیوتا ہیں۔ اُن کی مرمر کے بغیر یہاں ایک پتا بھی نہیں ہوتا۔ وہ زندگی دیتے ہیں وہی موت دیتے ہیں۔“ آگ کی ایک لہر سی میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ میرا دل چاہا کہ میں منہ کھولوں اور سردار روبان کی تمام غلط فہمیاں دور کر دوں مگر یہ کوئی مناسب موقع نہیں تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

سردار اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! سردار روڈو کے یہاں آئے ہیں تمہیں سب کچھ سمجھا دیا جائے گا۔ تمہارے کاندھوں پر بھاری ذمہ داری پڑنے والی ہے۔ اگر تم لوگ اس امتحان میں سرخرو نہ ہوئے تو تم لوگوں سے خوش قسمت انسان اس دھرتی پر کوئی نہیں ہوگا۔“

”سردار! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... آپ کی تم لوگوں سے کیا مراد ہے؟“

”علی نواز! حوصلہ رکھو بہت جلد ہر چیز سے آگاہ کر دیا جائے گا.....“ سردار نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آؤ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں.....“ سردار مجھے مختلف گلیوں راہدار یوں اور احاطوں سے گزرتا ہوا ایک جگہ لے گیا۔ یہ ایک کھلی احاطہ نما جگہ تھی۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے کمرے تھے جن کے آگے سلاخیں لگی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے کمرے زندان کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ یہاں کے مناظر دل دہلا دینے والے تھے۔ ایک زندان میں ایک قیدی کے پاؤں مٹی کے ایک برتن میں رکھے ہوئے تھے۔ قیدی کو محافظوں نے دونوں طرف سے چکر رکھا تھا قیدی کے حلقے کیچر لڑا دینے والی چنگھاڑیں نکل رہی تھیں۔ انسانی گوشت جلنے کی بو نا قابل برداشت تھی۔ میں نے چہرہ پھیر لیا۔ سردار روبان نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ قیدی بوکاشی دیوتا بنائی ہوئی حدود سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے یہ سزا دی جا رہی ہے۔“ سردار روبان



کے مالک ہیں۔ ان میں سے کئی کو موت ملے گی کئی کو زندگی.....“

میں ان مفلوک الحال اور خزاں رسیدہ چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ہر چہرے پر بے آس خوف کے طے جلے تاثرات تھے۔ دفعتاً ان چہروں میں سے ایک چہرہ دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ بووی تھا وہی کالج گروپ کا البیلا لڑکا بووی جس کی محبوبہ میکی کیمبرو کے جنگل میں پراسرار طور پر قتل ہوئی تھی اور جس نے عہد کیا تھا کہ وہ میکی کے قاتل کو ضرور انجام تک پہنچائے گا۔

یہ یہاں تک کیسے پہنچا تھا؟ کئی طرح کے سوال ذہن میں کلبلانے لگے۔ اُس کا دھیان کئی طرف تھا وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں فوراً زندان کے آگے سے ہٹ گیا۔

واپسی پر سردار روبان نے ایک خوب دلڑی میرے ساتھ بھیجنا چاہی جو میں نے وہیں شکر کے ساتھ لوٹا دی۔ خوابگاہ میں جانے سے پہلے میں ساسا سے ملنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوالات تھے مجھے اُس سے پوچھنا تھے مگر واپسی پر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

رینا شاید سوچتی تھی میں نے اس کی خوابگاہ میں جانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی خوابگاہ میں آیا۔ میں مسہری پر بیٹھ گیا اور میکسوئی سے سوچنے لگا۔ میں نے ابھی چند منٹ پہلے بووی کو اپنی آنکھوں سے یہاں دیکھا تھا۔ آخری دفعہ بووی مجھے زخموں کے کیمپ میں نظر آیا تھا اور اُس کی اطلاع پڑی یہاں رینا کے پیچھے چلا آیا تھا۔

مجھے فوری طور پر ساسا سے ملنا تھا۔ ساسا ہی وہ واحد ہستی تھی جو مجھے اس گورہ دھندے بارے میں بتا سکتی تھی۔ کئی دنوں سے میرے ذہن میں گردش کرنے والے تمام سوالوں کے جواب دے سکتی تھی۔ میں بے چینی کے عالم میں کمرے میں گشت کرنے لگا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ پوباشے اندر داخل ہو گئی۔

”آقا! آپ کے جسم پر کوئی زخم ہے.....؟“ اُس نے فوراً سوال داغ دیا۔

”نہیں تو..... تم کیوں پوچھ رہی ہو.....؟“ میں سنہلے ہوئے بولا۔

”آپ نے کل جو کپڑے اتارے تھے اُن پر خون کا چھوٹا سا دھبہ تھا۔“

”ہاں مجھے یاد آیا ایک پرانا زخم ہے۔ اُس سے کبھی کبھار خون رستا رہتا ہے۔“ مجھے یاد آیا

محل میں ہی مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس کا زخم دو ہفتے گزر جانے کے باوجود بھی کبھی کبھار رستا رہتا تھا۔

”زخم پر مرہم رکھ دوں.....؟“ پوباشے سوالیہ لہجے میں بولی۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اب جاسکتی ہو.....“ میں اُس کے تیور دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ جب چلی گئی تو میں مسہری پر ڈھیر ہو گیا۔ میرا ذہن گزرے ہوئے لمحات کے خاکے پیش کرنے لگا۔ وہ رہ کے بووی کا خیال میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ اُس خیال میں ایک عجیب طرح کی جھین ایک عجیب طرح کا اضطراب تھا۔ بووی جس ”ہستی“ سے یہاں پہنچا تھا وہ میرے محبوب کی ہستی تھی میری رابعہ کی ہستی تھی۔ ”بووی یقیناً رابعہ کے بارے میں جانتا ہوگا۔“ میرے دل نے کہا..... رابعہ اس وقت کہاں تھی؟ اسی ہستی میں تھی؟ جہاں میں اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کے آیا تھا اُس پر اُو میں تھی یا..... یا پھر وہ کیمبرو کا جنگل چھوڑ کر زمبابوے سدھار گئی تھی؟ اس بارے میں مجھے بووی بتا سکتا تھا۔ میرے سینے میں ایک کاٹ دار کک جاگ اُٹھی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں کسی طرح ابھی بووی کے پاس پہنچ جاؤں اور اُس سے رابعہ کے بارے میں پوچھوں..... مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس کے لئے صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

میں سونے کے لئے مسہری پر لیٹ گیا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی مجھے نیند نہیں آ سکی۔ رابعہ سے جدا ہوئے ایک ماہ سے کچھ دن اوپر ہو چکے تھے ان دنوں میں ایک رات بھی ایسی نہیں گزری تھی جب میں نے آنسو نہ بہائے ہوں۔ رابعہ کو یاد نہ کیا ہو۔ میں نیند سے لائق انہی آنسوؤں کی لڑیاں پور ہا تھا جب اچانک مسہری کے پیچھے کھڑا ہوا مجھے یوں لگا جیسے بڑی تیزی سے کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ خدا کی پناہ..... وہ ایک چمک سی تھی ایک بدن کی تھی جو میری نگاہوں میں چمکی تھی۔ وہ آبدار تلوار تھی جو میری گردن کی طرف بڑھی تھی۔ ایک لمحہ صرف ایک لمحہ زندگی اور موت کے درمیان حائل ہو گیا۔ میں تیزی سے نیچے جھکا میری گردن پر چلنے والی تلوار میرے سر پر پہنچے ہوئے خود کے دو کٹڑے کرتی ہوئی گذر گئی۔ میں تیزی سے گھومتے ہوئے کمرے سے نیچے لڑھک گیا۔ تلوار کا دوسرا وار چوٹی مسہری پر پڑا۔ اتنی دیر میں، میں مسہری کے نیچے سے کھم کھم کر دوسری طرف کھڑا ہو چکا تھا۔ میرا سیاہ پوش دشمن ایک ڈیڑھ ہفتے کے وقفے کے بعد میرے مقابل آچکا تھا۔ میں نے بخوبی اسے پہچان لیا تھا۔ حملہ آور وہی تھا جو اس سے پہلے بھی مجھ پر ناکام ناکام حملہ کر کے فرار ہو چکا تھا۔ یکا یک میرے سینے میں حدت بھری لہریں اٹھنے لگیں۔ میں اپنی بہادری کی زندگی جی رہا تھا۔ اس بہادری کی ہی بدولت میں ان جنگیوں کی نظر میں معتبر تھا۔ پچھلی دفعہ میں نے زخم کھایا تھا اور کسی کو جھنک نہیں پڑنے دی تھی اُس کی بھی یہی وجہ تھی میں اپنی بہادری پر داغ لٹے نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں شدت سے اس دن کا منتظر تھا جب میرا دشمن مجھ پر دوبارہ حملہ کرتا آج وہ ان آن پہنچا تھا۔

جملہ آور مسہری سے اچھلتا ہوا تیزی سے میری طرف بڑھا وہ چھری سے بدن کا بہت بڑا شخص تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوار سے تلوار اٹار کر ساتھ ڈھال بھی موجود تھی۔ میں چاہتا تو ڈھال اپنے دوسرے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ مگر مد مقابل سے سراسر نا انصافی ہوتی۔ میں ابھی تلوار اٹار کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ مد مقابل مجھ پر ٹوٹ پڑا وہ کوئی ماہر تلوار زن معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی تلوار ایک مخصوص انداز میں چل رہی تھی۔ رات کے سارے میں تلواروں کی چھنکار بلند ہو رہی تھی میں مسلسل مد مقابل کے وار روک رہا تھا اور میری عقابانی نگاہیں اُس کا کمزور پہلو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہونے لگا جیسے مسلسل تلوار چلانے سے مد مقابل کے بازو شل ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت جان کر دفاع کی حکمت عملی بدلتے ہوئے جارحانہ انداز اپنایا اور مد مقابل پر حملوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میری تلوار برق کی طرح چمک رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد مد مقابل کے جسم کا احوال پوچھ سکتی تھی مگر مد مقابل میری توقع سے زیادہ مضبوط ارادے کا شکار ثابت ہوا تھا۔ میں تلوار چلاتے ہی مارشل آرٹ کا داؤ کھیل گیا۔ میری فرنٹ کک مد مقابل کے بازو میں لگی وہ اچھلتا ہوا پتھر کی دیوار سے ٹکرایا پھر حیرت انگیز پھرتی سے وہ اٹھا اس نے پلک جھپکے دیوار سے ڈھال اٹار لی میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ڈھال ہاتھ میں آتے ہی اُس کا انداز بھر جارحانہ ہو گیا۔ اُس کی تلوار کی نوک میری پوشاک ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ سینے سے ناف تک میرے جسم پر ایک لمبی لائین کھینچ گئی۔ یہ کوئی گہرا زخم نہیں تھا۔ بس تلوار کی نوک اپنا نشان چھوڑ گئی تھی۔ لپکا میرے عصاب تن گئے۔ میرے دل و دماغ پر وہی بے خودی چھانے لگی جو اکثر مجھے ہوش و خرد بے گانہ کر دیا کرتی تھی۔ میں ناقابل یقین پھرتی سے آگے بڑھا اور اپنے دشمن پر پل پڑا۔ مد مقابل میری طرف سے ایسی حرکت کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ میری تلوار کی دو چار کاری ضربوں نے اُس کی ڈھال پھاڑ ڈالی۔ وہ ڈھال کو پھٹکتا ہوا باہر کی طرف دوڑا۔ میں بھی تیزی سے اُس کے پیچھے بھاگتا ہوا دیوار کی طرف بھاگتا تھا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے تھا ایک دم ہی راہداری کے دونوں طرف سے خاد میں کے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس محل کے بہت سے کارندے مسلح میری مدد کو پہنچ چکے تھے۔

”کون ہو تم.....؟ اپنے چہرے سے کپڑا ہٹاؤ۔“ میں تحکم آمیز لہجے میں بولا۔ مد مقابل ٹس سے کانٹا نہیں ہوا۔

میں ایک بار پھر زور سے چلایا تو مد مقابل سے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھکاؤ دیتے ہوئے مجھ پر جست کی اور مجھے لیتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اُس کا ایک ہاتھ میری تلوار والی کلائی پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ مگر اس ہاتھ کی پکڑ میں دم ختم نہیں تھا۔ میں نے دونوں پیروں کی ٹھوک سے اپنے دشمن کو خود سے اچھال دیا اس کوشش میں مد مقابل کے چہرے سے سیاہ پردہ ہٹ گیا۔ لمبی زلفوں کی پٹلیاں مجھے ہوا میں بکھرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے سیاہ پوش حملہ آور کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی پانچا گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

حملہ آور نے جب دونوں طرف سے گھیرا پڑتے دیکھا تو وہ داہنے طرف کو اوپر چھٹی۔ سبز بیوں کی طرف ہوا۔ میں تیزی سے سبز بیوں کی طرف لپکا مجھ سے پہلے دو کارندے سبز بیوں چڑھنے لگے تو میں نے اُن دونوں کو نیچے اتر جانے کا حکم دیا۔ جس کی انہوں نے فوراً تعمیل کی۔

حملہ آور دشمن کوئی اور نہیں ساسا تھی..... وہی جنگلی البیلی ساسا..... جس سے میری پہلی ملاقات بٹ میں ہوئی تھی اور جس نے اس وادی میں میری پہلی مدد کی۔ اور وہی ساسا جس کا باپ میری چار بچاتے ہوئے قربان ہو گیا تھا۔ محافظوں نے آگے بڑھ کے ساسا کو جکڑ لیا تھا۔ نیزوں کی اینٹ چاروں طرف سے اُس کے جسم کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بالاب بھر گئی تھیں۔ میں کیسا بد نصیب تھا جس محسن کی بیٹی کی بھلائی کے لئے میں کچھ کرنا چاہتا تھا وہ بیٹی بھی تھی تو اس حال میں۔

اچانک ایک طرف سے رعب دار آواز بلند ہوئی۔ ”چلو لے چلو اس ڈائن کو..... دیوتا اس ناس کریں..... اسے معلوم نہیں اس نے کس پر اپنا ہتھیار اٹھایا ہے، بوکاشی دیوتا اس کی زندگی کو ضرر جہنم بنا دیں گے۔ یہ موت کے لئے ترسے گی مگر اسے موت نہیں ملے گی۔“ میں نے نگاہ اٹھا کے دیکھا یہ الفاظ ادا کرنے والا سردار روبان تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا میری آنکھوں میں جیسے ریت کے ذرے چھبنے لگے تھے۔ میں لرزتا ہاتھ ساسا کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ”ساسا! تم نے اب کیوں کیا.....؟“ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی اور زخمی شیرانی کی طرح دھاڑتے ہوئے بولی۔ ”اے عالم انسان! میں جب تک تجھے ذلیل موت نہ مار لوں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔“ ایک دفعہ بچا ہے دو دفعہ بچا ہے..... تو کتنی دفعہ مجھ سے بچے گا..... میں تمہاری سانسیں نکال کے دی لوں گی.....۔“

”ساسا! لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ میں آنسوؤں کے ساتھ دھکی لہجے میں بولا۔ ساسا نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر اس قہقہے کا اختتام ایک قہرناک نگاہ سے ہوا۔ ساسا خونی نظروں سے گھورتے ہوئے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”علی نیوز! تم مجھ سے بچ نہیں پاؤ گے۔“ محافظ اسے گھٹیا ہوئے واپس لے گئے۔

میرا دماغ گھن چکن بنا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری دشمن کیوں بن بیٹھی ہے؟ میں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے؟ پھر ایک دم مجھے اُس کا جواب مل گیا۔ سیڑھیوں کی طرف اترتے ہوئے ساسا تیز آواز میں بولی۔ ”میرے باپ کے قاتل میں تجھے نہ چھوڑوں گی۔ دیوتا بھی تجھے مجھ سے نہیں بچا سکتے۔“

محافظ ساسا کو نیچے کی طرف لے جا چکے تھے۔ میں غم سے نڈھال اُسے جاتی کودیکھتا رہ گیا۔ طرح کے خیال میرے ذہن پر یلغار کرنے لگے۔ میں خیالات سے تب چونکا جب پیچھے سے آکر

نے ہاتھ میرے کندھے پر دھریا۔ میں نے دیکھا وہ سردار روبان تھا اُس کی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی تھی۔ میں نے بارہا غور کیا تھا سردار روبان کے دل میں میرے لئے ہمدردی اور نرمی کا گوشہ موجود تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے شفقت سے پیش آیا تھا۔ اب بھی وہ نہایت دھمے لہجے میں بولا۔

”علی نواز! یہ ذلیل لڑکی تم سے اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ مگر تم فکر مند نہ ہونا میں اس تہ خانے میں پھینکواؤں گا جہاں سے اس کی لاش ہی باہر نکلے گی۔“

”مگر یہ مجھ سے اپنے باپ کا انتقام کیوں لینا چاہتی ہے؟“ میں تیزی سے بولا۔ ”بھوری چٹانوں سے پہلے جو محافظ تمہارے ہاتھوں سے مرے تھے اُن میں اس کا باپ ناکو بھی تھا۔“ سردار روبان بولا۔

میرا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ تو کیا یہ سب لوگ اور ساسا میرے اور ناکو کے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ مجھے ناکو کا قاتل ٹھہرا رہے تھے حالانکہ وہ میرا سب سے بڑا محسن تھا اُس نے میری جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں کسی سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا ساسا کو تو سب کچھ سچ بتا سکتا تھا اُس کی اتنی بڑی غلطی فہمی تو دور کر سکتا تھا ناں۔ میں تیزی سے نیچے جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ سردار روبان بولا۔ ”علی نواز! کدھر جا رہے ہو؟“

”سردار! میں اس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”مگر کیوں.....؟“

”میں اُسے خود سزا دینا چاہتا ہوں.....“ میں فوراً بات بدلتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب..... تمہاری تمام عادتیں سرداروں والی ہیں۔“ سردار بولا۔

سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک میری نظر ایک طرف کواٹھ گئی۔ محل کی فصیل سے باہر اور ایک منظر نے میری بصارت جکڑ لی۔ وہ تقریباً ساٹھ ستر ہاتھ اونچا بن مانس کا مجسمہ تھا اُس کی داؤں آنکھوں میں دو مشعلیں روشن تھیں۔ میں حیرانگی کے عالم میں اُس عظیم مجسمے کو دیکھتا چلا گیا۔ اُس کے قریب بہت سے مردوزن بیٹھے رات کے اس آخری پہر میں عبادت میں مصروف تھے۔ میں نے ایک دفعہ نظر بھر کے یہ منظر دیکھا اور پھر سیڑھیاں اترنا چلا گیا۔ میں جب راہداری میں پہنچا تو رینا نواس باختر راہداری میں بھاگی چلی آ رہی تھی اُس کے پیچھے پوہاشے بھی تھی۔ رینا مجھے دیکھتے ہی مجھ سے جھٹ گئی۔ ”علی نواز! ات..... تم ٹھیک تو ہونا..... ات..... تم.....“ اور ساتھ ہی رینا کی ہچکی بندھ گئی وہ میرے کندھے پر سر دھر کے زور و قطار رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا

..... اور تمام صورتحال اُسے سمجھائی، میری ساری بات سن کر رینا بولی۔ ”علی نواز! اگر تمہیں کچھ ہو، تو شاید میں بھی زندہ نہ رہتی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“

”ہاں علی نواز! میں شاید خودکشی کر لیتی۔“

میں نے اپنا ہاتھ اُس کے منہ پہ دھر دیا۔ ”بڑی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔“

”ہاں علی نواز! تم نہیں سمجھو گے..... میں دن رات یہی دعائیں کرتی ہوں کہ تمہاری طر بڑھنے والی مصیبت مجھے مل جائے تمہارے مقدر میں لکھی ہوئی تکلیف میرے حصے میں آجائے۔ نواز! موت تو ہر کسی کو آتی ہے میں دعا کرتی ہوں میں اپنی آنکھوں سے تمہارا کوئی غم نہ دیکھوں۔ بلکہ تم اپنے ہاتھوں سے میری لاش کو قبر میں اتارو۔ میری قبر پہ ایک خوبصورت گلدستہ رکھو۔“

”بس رینا..... بس..... اب ایک لفظ بھی نہیں بولنا.....“ میں جذباتی لہجے میں بولا۔

رینا میرا بازو تھام کر کمرے میں لے گئی۔ مجھے مسہری پر بٹھا کر خود وہ پوباشے کے ساتھ چلی گئی اُس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی اس کے ہاتھوں میں ایک طشت تھا جس میں لوہان سلگ تھا۔ رینا وہ طشت اٹھا کر میرے چہرے کے سامنے لے آئی پھر مجھ سے بولی۔ ”علی نواز! آنکھیں کرلو.....“ میں نے اُس کا کہنا ماننے میں ہی عافیت جانی وہ طشت میں پھونکیں مارنے لگی اور نامہ زبان میں کچھ پڑھنے لگی۔ دھواں میرے چہرے سے نکل رہا تھا۔ لوہان کی تیز بو میرے نشتوں میں جا رہی تھی۔ میں بولا۔ ”رینا! یہ تم کیا کر رہی ہو.....؟“

وہ کچھ نہیں بولی میں بھی خاموش ہو رہا جب وہ اپنا کام مکمل کر چکی تو طشت اُس نے پوباشے پکڑ کر چلے جانے کا حکم کیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! اب تم محفوظ ہو.....“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا.....؟“ میں بولا۔

”علی نواز! میری ماں بچپن میں ہمارے ساتھ ایسا کیا کرتی تھی۔ اُس کا کہنا تھا ایسا کرنے بلائیں دور ہو جاتی ہیں..... اب تمہاری طرف بھی کوئی بلا نہیں بڑھے گی۔“

”تمہارے ہوتے ہوئے کسی بلا کی ضرورت باقی ہے کیا؟.....“ میں دھیرے سے بولا۔ مسکرا اٹھی اُس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے اُس نے پرسوج لہجے میں چہرہ تھوڑا سا اوپر اُڑا دیا اور نثرے لہجے میں بولی۔ ”علی نواز! بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں۔ ہمیں یہاں سے چھٹکارہ مل جائے گا۔ پھر ہم جلد از جلد زمبابوے پہنچیں گے پھر وہاں سے“

منزل پاکستان ہوگی۔“

اُس کی بات سن کر میرا دل ایکدم میں غم سے غڈ حال ہو گیا۔ میں نے چہرہ نیچے جھکا لیا اور رینا سے نظریں چرانے لگا۔

”علی نواز! تم کچھ بولے نہیں.....؟“ وہ الجھن سے میری طرف دیکھنے لگی پھر کچھ سوچ کر سکرانے لگی ”میں اب سمجھی..... تمہیں ابھی تک یقین نہیں ہو پا رہا کہ ہمیں یہاں سے رہائی نصیب ہوگی..... علی نواز! میری بات پر یقین رکھو..... تمہاری بہن نے آج تک کبھی غلط پیش گوئی نہیں کی۔“

”رینا! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے.....“ میں نے رینا سے کہا اور وہاں سے اُٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے ہماری خلاصی ہونے والی نہیں۔ سردار روبان کی گفتگو نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ بس رینا کو کچھ بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لئے وہاں سے اُٹھ گیا تھا۔

دن کا اجالا پھیلا تو میں سردار روبان کی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔ سردار روبان موجود نہیں تھا۔ سردار کے نائب نے میرا استقبال کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں رات کو پکڑی ہانے والی کنیر سے ملنا چاہتا ہوں۔

”وہ اس قابل نہیں..... کہ آپ جیسا سردار اس سے ملاقات کرے۔“ نائب بولا۔ مجھے اُس نکتہ معلوم پڑا کہ میں اس وقت یہاں ایک سردار کی حیثیت سے مقیم ہوں۔ ”مگر میں اس سے ملنا چاہتا ہوں.....“ میں متانت سے بولا۔

”جیسا آپ حکم کریں..... کیونکہ یہاں بوکاشی دیوتا کا قانون چلتا ہے۔ بوکاشی دیوتا جس پر ایمان ہو جاتے ہیں۔ اسے نوازتے چلے جاتے ہیں۔ بوکاشی دیوتا کا حکم آخری حکم ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جب تک بوکاشی دیوتا چاہیں گے آپ اس محل میں مقیم رہیں گے۔ اُن کا حکم ہے کہ آپ کی ہر خواہش کا احترام کیا جائے۔“

سردار روبان کے نائب کی باتیں میرے لئے چشم کشا تھیں۔ میں اُس کی معیت میں اُس مین دوز تہہ خانے کی طرف گیا جہاں ساسا کو قید کیا گیا تھا۔ کئی راہدار یاں چلنے اور کئی سیزھیاں اُڑنے اترنے کے بعد ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ ایک تاریک تہہ خانہ تھا۔ تہہ خانے کی سیزھیاں اُڑنے کے لئے ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ تہہ خانے میں دو مشعلیں روشن تھیں اُن کی روشنی اس طویل تہہ خانے کے لئے کافی تھی۔ ایک طرف سینکڑوں کی تعداد میں اذیت رسا اوزار پڑے تھے۔ مشعلوں کی ملجلی روشنی نامی ان اوزاروں پہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ ساسا کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

”لڑکی کہاں ہے.....؟“ میں سردار کے نائب سے بولا۔

”وہ اس طرف ہے.....“ اُس نے ایک نیم روشن جگہ کی طرف اشارہ کیا میں نے غور آنکھیں پھیلا کے دیکھا تو ساسا مجھے نظر آگئی۔ اُس کے خونچکاں چہرے پے برسوں کی نا آسودگی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ وزنی آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت تھیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا میں ابھی ساسا کو اُس کے نام سے پکارنے ہی لگا تھا کہ مجھے یاد آ اور ساسا کا نام میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔ سب لوگوں کی نظر میں ساسا میرے لئے انجی تھی جس نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

”لڑکی آنکھیں کھولو..... دیکھو ہم آئیں ہیں.....“ میری بھاری آواز تہہ خانے میں اچانک جیسے تہہ خانے میں بھونچال آگیا، آہنی زنجیریں کھڑکے لگیں۔ ساسا جال میں پھنس جا والے پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔ اُس نے ایک دو دفعہ جھولتے ہوئے مجھ پر حملہ بھی کرنا چاہا چونکہ وہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اس لئے اُس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

سردار روپان کے نائب نے آگے بڑھ کر ساسا کے چہرے پے تھپڑوں کی بارش کر دی۔ جب بے دم ہو گئی تو وہ اُس کے بال کھینچنے ہوئے بولا۔ ”دیوتا! تیرا ناس کریں..... تو جانتی ہے یہ کون ہیں ان کو بوکاشی دیوتا نے امن دیا ہے..... یہ بوکاشی دیوتا کے بہت جلد درشن کرنے والے ہیں۔“

اُس کی آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے وہ بھیکے لہجے میں بولی۔ ”تیرا دیوتا بوکاشی دیکھنا ضرور کی موت مرے گا..... اور..... اور اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے سب چاہنے والے بھی..... تم سب بھی.....“ سردار کے نائب کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کے ما کی گردن تھام لی۔ وہ جیسے ساسا کی سانس پی جانا چاہتا تھا میں نے آگے بڑھ کے اُسے ساسا علیحدہ کیا۔

”تم اب جا سکتے ہو.....“ میں درشتی سے بولا۔

”مگر.....؟“

”مگر..... مگر کچھ نہیں تم تہہ خانے سے باہر نکل جاؤ اور ساتھ ساتھ دروازے پے کھڑے ہو کو بھی لیتے جاؤ..... میں تنہائی میں اس سے کچھ پوچھ کرنا چاہتا ہوں.....“ میری بات سن کر اُس کی آنکھیں میں جیسے شیطانی چمک ابھر آئی وہ معنی خیز انداز میں مسکرا

پہرے دار کے ساتھ تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔ میں اُس کی اس حرکت کھول کے رہ گیا۔ ساسا کی دونوں کلائیاں بُری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ آہنی کڑے اُس کے گوشت کے اندر تک گھس گئے تھے۔ اُس کا لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اُس کی ایسی حالت دیکھ کر میرا دل غم سے لالاب بھر گیا۔

”ساسا!..... تم تمہیں یہ کیا ہوا ہے..... تم.....“

ساسا چیخ کر میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”میرے باپ کے قاتل میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی..... تم نے..... تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔ میرے باپ کو.....“ وہ مسلسل چلائے جا رہی تھی اور اس بات کی گردان کئے چلی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ آہنی زنجیروں کو بھی جھٹکے دے رہی تھی۔

میں پھنکار تے لہجے میں بولا۔ ”ساسا، میری بات سنو..... میری بات سنو.....“ میں نے اُسے دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ ”بات سنو میری! ساسا.....“ میں بلند آواز سے بولا پھر اپنا چہرہ اُس کے کان کے قریب لے جاتے ہوئے دھیمے مگر سخت لہجے میں بولا۔ ”میں تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہوں۔ میں نے تمہارے باپ کو نہیں مارا ہے..... وہ..... وہ تو..... میرا سب سے بڑا احسن تھا..... اُس نے..... اُس نے میری زندگی بچانے کے لئے اپنی جان گنوا دی..... وہ تو..... میرا اہم در تھا..... مجھے اس جنگی دنیا سے نکالنا چاہتا تھا اس گورکھ دھند سے چھٹکارہ دلانا چاہتا تھا۔“

”ساسا کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں اور اُن میں بے بسی کے آنسو ٹھمارہے تھے۔“ یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....“

”ہاں ساسا! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے پہلے معلوم نہیں تھا کہ نا کو تمہارا باپ ہے۔ مگر جب اُسے تلوار کا زخم لگا اور اُس کی سانسیں اکھڑیں تو اُس کے لبوں پے تمہارا ہی نام تھا۔ وہ..... تمہیں شاید بہت جانتا ہے۔“ ساسا میری بات سن کر دھاڑیں مارنے لگی۔ یوں لگا جیسے وہ اپنی جان دے دے گی میں نے اُسے بمشکل دلاسا دیا اور تمام کہانی اُسے اول تا آخر سنا دی کہ کیسے نا کو نے پہلی دفعہ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ عہد کیا کہ مجھے یہاں سے نکال دے گا۔ ساسا تمام کہانی سن کر کئی دفعہ روئی کئی دفعہ اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکے میں کہانی سننے کے ساتھ ساتھ برابر سے دلاسا بھی دیتا رہا۔ جب میری بات مکمل ہو چکی تو ساسا کافی مطمئن نظر آنے لگی۔ وہ کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر اُس نے بولنا شروع کیا اُس نے جو کہانی سنا کی اس کا لب لالاب کچھ یوں ہے۔

وہ اپنے باپ کے ساتھ ہی خوشی اس جنگی دنیا میں رہ رہی تھی اُس نے ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا

اس دوران ناکو نے اپنی بیٹی کو سہارا دیا۔ ناکو کو معلوم تھا کہ ساسا بالی کے بغیر زندگی نہیں رہے گی اس نے اپنی بیٹی سے وعدہ کیا کہ وہ اُسے لے کر برب جائے گا اور سردار رواڈو سے التجا کرے گا کہ بالی کو واپس بلایا جائے یا ساسا کو بربت کے پار بھیجا جائے۔ ایک دن اسی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ناکو ساسا کو لے کر برب پہنچ گیا۔ ساسا کا ڈیڑھ سالہ بچہ بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اب ناکو اور ساسا اپنی بستی چھوڑ کر برب میں آباد ہو گئے۔ ساسا محل میں کنیر بن گئی اور ناکو کو بوکاشی دیوتا کی فوج کا سپاہی بنایا۔ وہ دونوں باپ بیٹی پچھلے ایک سال سے یہاں آباد تھے۔ وہ بہت سے مصاحبوں اور چھوٹے سرداروں سے ملے تھے انہوں نے رواڈو تک رسائی بھی حاصل کی تھی اور اُسے اپنا مدعا بیان کیا تھا مگر کہیں شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ مسلسل ایک سال سے انہیں وعدوں پے ٹر خایا جا رہا تھا۔

ناکو کو سپاہی ہونے کے ناطے مہموں پر بھی بھیجا گیا اور وہ بوکاشی کی خدائی فوجداروں کے ساتھ ٹھانا بٹانہ لڑا۔ اُس نے تلواروں کے زخم کھائے۔ خونی درندوں کا مقابلہ کیا۔ یہ سب اُس نے اپنی پیاری بیٹی کے لئے کیا۔ وہ اپنی بیٹی کی مسکراہٹ واپس لانا چاہتا تھا۔ مگر سب کچھ کرنے کے باوجود بھی گوہر مقصود ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مگر وہ ہر لمحہ ہر وقت ساسا سے کہتا رہتا تھا کہ بیٹی تم میرے ہوتے ہوئے نگرمت کرنا۔ میں اتنی جلدی نہیں مروں گا بلکہ تمہارا بانی تمہیں لوٹا کر ہی دیوتاؤں کے پاس جاؤں گا مگر وہ ساسا کو سوچ منہ ہار کے چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا تھا۔

ساسا کی کہانی سننے کے بعد احساس ندامت کے بوجھ نے مجھے جکڑ لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے مگر میں رو رہا تھا۔ میں ایک طرح سے ساسا کا مجرم تھا۔ اُس کا واحد سہارا اُس کا باپ میری وجہ سے مارا گیا تھا۔ اب وہ اپنی کشتی ساحل پہ لگانے کے لئے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مگر نہیں وہ اکیلے نہیں تھی مجھے اُس کا سہارا بننا تھا۔ اُس کے باپ کے ادھورے مشن کو میں نے پورا کرنا تھا۔

”ساسا! تم دل چھوٹا مت کرو..... میں تمہارے باپ کے ادھورے مشن کو میں نے پورا کروں گا..... تمہارا بالی تمہیں واپس لا کر دوں گا۔“ میں اُسے دلا سہ دیتے ہوئے بولا۔

”علی نواز! کیا کروں گے تم؟..... یہاں ہماری بات کوئی سننے والا نہیں ہے۔“ ساسا سسکتے ہوئے بولی۔

”ساسا! مجھ پے بھروسہ رکھو..... بالی کو واپس لانے کے لئے مجھ کو کچھ کرنا پڑا میں کروں گا۔“

”علی نواز! تم غلط سمت جا رہے ہو۔ آدمی کا بہادر ہونا یہاں سب سے بڑا گناہ ہے۔ بہادر

وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ ماں کا پیار کیسا ہوتا ہے۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کی ماں چل بسی تھی۔ باپ نے اُسے بہت پیار دیا تھا۔ وہ باپ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی تھی پھر یوں ہوا کہ اُسے بستی کے ایک لڑکے کے ساتھ پیار ہو گیا۔ وہ بالی نامی لڑکے کو لٹو کر چاہنے لگی ان دونوں کا پیار جنگلی پھولوں کی ڈالی ڈالی سفر کرتا رہا۔ بالی ساسا کے باپ ناکو کو پسند نہیں تھا۔ جب ساسا نے باپ سے بالی کے متعلق بات کی تھی ناکو کو بہت رنج ہوا مگر وہ منہ سے کچھ بولا نہیں۔ اس دن کے بعد وہ چپ چپ رہنے لگا۔ ساسا کو یہ خاموشی کھٹکی تو اُس نے باپ سے بات کی ناکو نے صاف کہہ دیا کہ بالی اُسے پسند نہیں ہے۔ اُس نے بیٹی کے لئے اور کوئی لڑکا ڈھونڈ رکھا ہے۔ ساسا ایک طرف بالی کو لٹو کر چاہتی تھی دوسری طرف باپ سے بے انتہا محبت کرتی تھی آخر اُس نے باپ کے حکم پر سر تسلیم خم کر لیا۔ اُس نے باپ سے کہا کہ وہ بالی کو ہمیشہ کے لئے بھول جائے گی۔ باپ بیٹی کی فرمانبرداری پر خوشی کے آنسو رو دیا۔ مگر باپ کی خوشی تادیر برقرار نہ رہی۔ ساسا نے کہنے کو تو باپ کی بات مان لی تھی مگر وہ بالی کو اپنے دل سے نہ نکال سکی۔ وہ بالی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کے روئی۔ اُس نے پہروں بالی کا انتظار کیا۔ وہ دنوں میں سوکھ کر کاٹنا بن گئی۔ باپ کو بیٹی کے دل کی حالت کا بہت ذہر بعد علم ہوا۔ اُسے جب یقین ہو گیا کہ ساسا بالی کے بغیر نہیں رہ سکتی تو اُس نے بیٹی کی بات مان لی۔ اُس نے ساسا کی شادی بالی کے ساتھ کر دی۔

شادی کے بعد دونوں میاں بیوی کی محبت مثالی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اُن کی محبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اُن کی راتیں رنگین اور دن محبت کی چاشنی سے بھرپور گزرنے لگے۔ دو سال بعد قدرت نے اُن کے آنگن میں ایک خوبصورت پھول کھلایا۔ اُن کی خوشیاں میں اور اضافہ ہو گیا۔ ساسا اکثر دعا کیا کرتی تھی کہ اُس کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے شاید اُس کی دعاؤں میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا قسمت کا کھیل ہی ایسا تھا۔ بالی اپنے قبیلے میں بہت بہادر مشہور تھا۔ ایک دن برب کے میلے میں اُس نے اپنی بہادری کا یادگار مظاہرہ کیا۔ وہ مظاہرہ اُس کی جان کا روگ بن گیا۔ اُس کی بہادری اُسے لے ڈوبی۔ وہ سردار رواڈو کی نگاہ کا مرکز بن گیا۔ سردار رواڈو نے اُسے چند دن بعد ہی بربت کے پرلی طرف بھیج دیا۔ وہ وقت سفر بہت روایا بہت چلایا اس نے اپنی بات منوانے کے لئے بہت سے جتن کئے مگر سب بے کار گیا کیونکہ بوکاشی دیوتا کی طرف سے اس کی رواگنی کا حکم ہو چکا تھا۔ بوکاشی دیوتا جو حکم دے دیتا تھا اُس کو بدلنا کسی کے بھی اختیار میں نہیں رہتا تھا۔

بالی کی جدائی سے ساسا جیسے دیوانی ہو گئی۔ اُس نے کتنے دن دیواروں سے لگ کر گزاردئے

میں جب تہہ خانے سے باہر نکلا اس وقت سردار روبان کا نائب محافظ سے اپنا جسم دیوار ہاتھا مجھ دیکھتے ہی وہ جھٹ سے کھڑا ہو گیا۔ ”آپ آگئے.....؟“ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ”مجھے بتاؤ سردار روبان اس وقت کہاں ہیں؟“

”وہ اس وقت..... بھیڑا میں ہوں گے۔“

”بھیڑا..... میں؟“ میں سوالیہ لہجے میں بولا۔ ”ہاں..... آپ جانا چاہیں تو میں آپ کو لے جاسکتا ہوں۔“

”ہاں چلو..... مجھے اُن سے ضروری بات کرنی ہے۔“ میں تحکم سے بولا۔

ہم دونوں تقریباً پندرہ منٹ چلتے رہے۔ آخر ہم ایک کھلے احاطے میں پہنچ گیا۔ احاطے کے دائیں جانب ایک بہت پتی سی گلی تھی وہ مجھے لیتا ہوا اُس گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کے آخر میں ایک دروازہ بائیں طرف کو مڑتا تھا جب ہم اس دروازے سے اندر داخل ہوئے تو عجیب مہک نے ہمارا استقبال کیا۔ جونہی میری نگاہ سامنے اٹھی میں حیرت کا مجسمہ بن گیا۔ وہ ایک لمبا مستطیل کمرہ تھا۔ وہاں سو کے قریب لکڑی کے کٹے تیز یوں پڑھے تھے جیسے درخت کھڑا ہوتا ہے۔ ان چارٹ اوپنچے

کئے ہوئے سارے تنوں کے اوپر مٹی کا بنا انسانی چہرہ پڑا تھا۔ ہر چہرہ بڑی خوبصورتی اور نفاست سے تیار کیا گیا تھا اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی چہرے پر آنکھیں نہیں بنی تھیں بلکہ آنکھوں کی جگہ جیسے دو گڑھے بنے ہوئے تھے۔ ان چہروں میں کوئی عورت کا تھا تو کوئی آدمی کا۔ سرسری دیکھنے سے بالکل ایسے لگتا تھا جیسے اصل انسان کا چہرہ ہو اور صاف ظاہر ہو رہا تھا یہ چہرے سامنے دیکھ کر ہائے گئے ہیں کیونکہ کسی کا ناک چھوٹا کسی کا بڑا، کسی کا سر لمبوتر، کسی کا چوڑا کسی کا پچکا تو کسی کا بھاری

کرنا ہوا۔ بنانے والے نے کمال کر رکھا تھا۔ اُن کو بنانے میں جیسے وہ اپنی تمام خوبیاں بروئے کار لایا تھا۔ میں ابھی ایک ایک چہرے کا معائنہ کر رہا تھا کہ ایک طرف سے سردار روبان برآمد ہوا۔ وہ بتور چیتے کی کھال اوڑھنے ہوئے تھا۔ وہ مجھ سے خندہ پیشانی سے ملا۔ پتا نہیں کیوں مجھے کمرے کا منظر اتنا خوبصورت لگا۔ کمرے کے تین طرف درجنوں کی تعداد میں کھڑکیاں اور درجے ہوئے تھے جہاں سے سورج کی تیز روشنی ان مجسموں پر پڑ رہی تھی۔ زرد دھوپ میں بھورا بھورا منظر میرے دل کو بہت بھایا یہ جگہ شاید کافی بلندی پر واقع تھی۔ ایک روزن سے دھوپ کی ایک موٹی پٹی اتر رہی تھی۔ دھوپ کی پٹی میں کہیں کہیں مٹی کے ذرات اڑتے نظر آرہے تھے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب انسان کوئی مخصوص منظر دیکھتا ہے تو اُسے فوراً کچھ یاد آ جاتا ہے۔ دس بیس سال پرانی بات کو بھی

آدمی کو پر بت کے بار پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں سے اس کی واپسی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اُن چھوٹی چھوٹی جنگلی بستیوں اور قبیلوں میں کوئی بہادر جوان نہیں رہا۔ جو بہادر ہے وہ کھلے عام اپنی بہادری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔ بوکاشی دیوتا کے ہر کارے ہر جگہ بہادر آدمی کو بوسو گئے پھرے ہیں۔“

ایک ایک جھماکا سا ہوا اور بہت سی گھٹیاں سلجھتی چلی گئیں۔ مجھے سردار روبان کی وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو اُس نے اپنی قیام گاہ میں مجھ سے کی تھیں۔ اُس نے کہا تھا کہ علی نواز! تمہارے کا مذہور بے بہت بھاری ذمہ داری پڑنے والی ہے تم لوگ اگر اُس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو تم لوگوں سے زیادہ خوش قسمت انسان اس دھرتی پر کوئی نہیں ہوگا۔

وہ کسی ذمہ داری تھی.....؟ وہ کیسا امتحان تھا؟..... جس کیلئے جن جن کر بہادر انسانوں کو پرہز کے پار اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ بالی اپنی بہادری کی بدولت پرہز کے پار چاکا تھا اور اب شاید مجھے گم وہیں جانا تھا۔ سردار روبان نے کہا تھا کہ سردار رواڈو کے آتے ہی بہت اہم فیصلے ہوں گے۔ تو کیا اُن غیر محسوس انداز میں ایک شکنجے میں جکڑا چلا جا رہا تھا۔ میں تو رابعہ کی محبت میں یہاں چلا آیا تھا۔ حالات کا دھارا مجھے کہاں موڑے چلا جا رہا تھا۔ گیمبرو کا جنگل مجھے کن پر اسرار راستوں پر بھٹکا تھا۔ وقت کی گردش مجھے کن انجانے رستوں کی طرف بھیج کر لے جا رہی تھی۔

”علی نواز! میں نے تمہارے ساتھ بہت بُرا کیا۔ میں اندھیرے میں تھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں تمہیں اپنے باپ کا قاتل سمجھتی رہی..... مجھے معاف کر دینا.....“ اچانک ساسا بولی تو نہ خیالات سے لوٹ آیا۔

”نہیں ساسا..... اس میں بھلا تمہارا کیا قصور تھا تم جو کر رہی تھی ٹھیک کر رہی تھی۔“ میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور پھر سے گویا ہوا۔ ”ساسا! میری بات غور سے سنو۔ میں یہاں سے نکلوں تو تم نے خود کو اُن لوگوں کی نظر میں بے ہوش ظاہر کرنا ہے اور جب تک تمہاری رہائی کا پروانہ جارہا نہیں ہو جاتا اسی حالت میں رہنا ہے۔“ میری بات سن کر ساسا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تشدد کی بے سے اُس کا بالائی ہونٹ پھٹ گیا تھا جہاں سے خون رس رہا تھا میں نے کپڑے کے ساتھ خون صاف کیا۔ دلاسہ دینے والے انداز میں اُس کے کندھے پر ہاتھ دھرا تو اتنی ہمدردی سے ہی اُس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ میرا دل بھی بھرا آیا۔ اُس کے سر سے باپ کی شفقت کی چھاؤں اٹھ گئی تھی اب وہ چھپائی دھوپ میں کھڑی تھی ہلکا سا سایہ نظر آیا تھا تو وہ رو دی تھی۔

نامول سکتا ہے۔ یہ یوکاشی دیوتا کا حکم ہے.....“ سردار یہ کہتا ہو باہر نکل گیا۔ میں سگی بیچ پے بیٹھا دھوپ کی پٹی کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ محض دھوپ کی پٹی نہیں تھی رابعہ کی سوچ کا بھنور تھا میں اس بھنور میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا میں دھوپ کی پٹی کو اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھتا، نیچے کی طرف نگاہ آتے ہوئے اچانک میں چونک گیا۔ جس مٹی کے چہرے پے دھوپ کی پٹی پڑ رہی تھی وہ میرا جانا پہچانا سا تھا۔ میں انظراری کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوا میں اس چہرے کے قریب پہنچ کر غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ یہ چہرہ میرا شاسا تھا اس چہرے کو میں نے پہلے کہیں دیکھا تھا؟ کہاں دیکھا تھا یہ یاد نہیں آ رہا تھا پھر اچانک میرے ذہن میں ایک سوچ ابھری میرے دماغ میں زلزلے کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میں نے باہر سردار رو بان کی طرف دوڑ لگائی۔ میں راہدار یوں اور لگیوں میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ ”علی نواز! تم یہاں آزاد ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو۔ جو چاہو تمہیں مل سکتا ہے۔ یہ یوکاشی دیوتا کا حکم ہے۔“ میں سردار رو بان سے کہہ کر بووی کو قیدیوں میں سے چھڑا سکتا تھا۔



میں سیدھا سردار روبان کی قیام گاہ میں پہنچا سردار روہاں موجود نہیں تھا۔ میں اسے کافی دیر ڈھونڈتا مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔

اس دوران میری ملاقات پوباشے سے ہوگئی۔ وہ میری طرف ہی چلی آ رہی تھی۔

”آقا..... رینا بی بی نے آپ کو بلایا ہے.....“ وہ چھوٹے ہی بولی۔

”رینا اس وقت کہاں ہے.....؟“

”قیام گاہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں.....“

میں پوباشے کے ساتھ وہاں پہنچا تو رینا میری منتظر بیٹھی تھی۔ اس نے بہت خوبصورت کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے۔ سر پہ مقامی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی جس پر جا بجا شیشے لگے ہوئے تھے۔ بڑے اچھے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔

”علی نواز! ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“

”رینا! میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”باتیں وائیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے تم آنکھیں بند کرو۔“

”آنکھیں بند کرو..... کیا مطلب؟“

”میں نے کہا نا..... اس تم جلدی سے آنکھیں بند کرو.....“ رینا اپنا ہاتھ میری آنکھوں

طرف لاتے ہوئے بولی۔

”اچھا بابا..... اچھا کرتا ہوں بند آنکھیں.....“ میں نے آنکھیں میچ لیں۔ رینا میرے گلے میں ہ

پہنانے لگی وہ مالا ٹائپ کی کوئی چیز تھی۔ جب وہ پہنا چکی تو بولی۔ ”اب آنکھیں کھولو!“ میں۔

آنکھیں کھول دیں۔ وہ ایک خوبصورت سالا لاکٹ تھا جس میں ایک خوبصورت موٹا سا پتھر جڑا تھا

”رینا! یہ کیا ہے.....؟“ میں نے کہا۔

”یہ یہاں کا رواج ہے۔ ہمیں اپنے بھائیوں کو آج کے دن یہ پتھر کا بنا ہوا لاکٹ پہنانا پڑ

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بھائی اپنی بہنوں کو یاد رکھیں اور ان کی محبت میں تھوڑی سی بھی کمی نہ ہونے

دیں۔“

”اس کا مطلب ہے میری طرف سے محبت کی کمی ہوگئی ہے.....“ میں لاکٹ ہاتھ میں لے کر

بولی۔

”نہیں تم غلط سمجھو..... جب تک یہ لاکٹ تمہارے گلے میں جھولتا رہے گا میں تمہیں یاد رکھوں

گی تم جہاں بھی ہو..... کہیں بھی جاؤ یہ لاکٹ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔“

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ اس نے ساتھ پڑی سنگی تپائی پے پڑا ہوا ایک طشت اٹھایا جس

پر کپڑا دھرا ہوا تھا جب رینا نے کپڑا اٹھایا تو کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے میری بھوک جگادی۔

”یہ کیا ہے.....؟“ میں کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا تو رینا نے کھانے کا طشت

پچھ کر لیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر میرے منہ میں ڈالنے لگی۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔

رینا بولی۔ ”یہ میں نے خود اپنے ہاتھ سے تمہارے لئے تیار کیا ہے.....“

میں حیرت سے رینا کی طرف دیکھنے لگا۔ رینا تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی

تھی۔ پھر سے رینا نے لقمہ میرے منہ میں رکھا تو میں نے اس کے لقمے والا ہاتھ تھام لیا، میری آنکھیں

بھرائی تھیں۔ میرا دل چاہا کہ میں رینا کی غلط فہمی دور کر دوں اسے بتا دوں کہ ہم لوگ اب یہاں سے

واپس نہیں جاسکتے۔ یہ بوکاشی دیوتا کی سلطنت تھی اس کا حکم ہر پرندے ہر پتے پر چلتا تھا۔ ہم غیر محسوس

انداز میں ایک شگجے میں آگئے تھے جہاں سے نکلتا محال نظر آ رہا تھا۔

وہ بے چاری بہت بھولی تھی اس لگائے بیٹھی تھی کہ سردار رواڈو کے آتے ہی ہمیں یہاں سے

پھنکار دیا جائے گا۔

”ہاں اب آپ بتائیں آپ مجھ سے کیا بات کرنے والے تھے۔“ رینا بولی۔

”کون سی بات.....؟“ میں اچانک اپنے خیال سے چونکا۔

”وہی ضروری والی بات۔“

اچانک مجھے یاد آ گیا کہ میں یہاں رینا سے کیا بات کرنے آیا تھا میں نے چند لمحے ذہن میں

الفاظ ترتیب دیئے پھر بولا۔ ”رینا! میں نے یہاں بووی کو دیکھا ہے۔“

”بووی..... بووی کون.....؟“

”وہی بووی جس کی محبوبہ میکسی کیسبرو کے جنگل میں قتل ہوگئی تھی۔“

”رینا یکدم چونکی اٹھی..... کہاں ہے وہ.....؟“

”یہاں ایک قید خانے میں.....“ میں بولا۔

”مگر..... وہ..... یہاں.....“

”رینا! بووی سے ہمیں باہر کے حالات کا علم ہو سکتا ہے۔“

رینا کے چہرے میں پرا نجانے سے سائے لہرا گئے۔ میں جان گیا شاہنواز کے خیال نے اُسے

”تم اُس سے ملے ہو.....؟“

”نہیں اسے ہی ملنے جا رہا تھا۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی.....“

”نہیں تم یہیں رکو..... میں کوشش کروں گا اُسے ساتھ لے کر ہی واپس لوٹوں.....“

”مگر تم کہہ رہے تھے..... وہ قید میں ہے۔“

”ہاں..... میں اُس کی رہائی کے لئے ہی جا رہا ہوں۔“

میں واپس مڑا تو رینا نے گھوم کر میرا راستہ کاٹا اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”یہ تو کھاتے جاؤ.....“ وہ کھانا میرے سامنے کر کے بولی۔

”نہیں..... ابھی جلدی ہے آکر کھالوں گا.....“

”نہیں..... یہ تمہیں ابھی کھانا ہے۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔“ وہ سینہ ٹھونک کر بولی۔

”رینا! راستہ چھوڑو میرا..... مجھے بہت جلدی ہے۔“ میں نے رینا کو کندھے سے پکڑ کر پرے

کیا اور باہر نکل گیا۔ میرا رخ اس زندان کی طرف تھا جہاں میں نے بووی کو دیکھا تھا۔ جلد ہی میں

وہاں پہنچ گیا۔ بووی مجھے قیدیوں میں کہیں نظر نہیں آیا۔ میں فردا فردا ہر قیدی کا چہرہ دیکھنے لگا۔ مگر بووی

مجھے کہیں نہیں ملا۔

اچانک ایک طرف سے بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں

سردار روبان اپنے مصاحبین کے ساتھ چلا آ رہا تھا، دفعتاً ایک چہرہ دیکھ کر میں ٹھٹھکا کہ وہ بوگا لے تھا جو تیر

تیر قدموں سے سردار روبان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اُس کا اتنی اعصائیک کی آواز سے پتھر کی

زمین سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ سردار روبان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ سردار روبان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ

رک گیا۔ بوگا لے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”تم یہاں.....؟“ سردار روبان سوالیہ لہجے میں بولا۔

”م..... میں یہاں آپ کو ڈھونڈنے آیا تھا.....“ میں نے بہانہ تراشا۔

”اچھا ہوا تم یہیں مل گئے..... آؤ ہمارے ساتھ.....“ سردار روبان بولا۔

میں ابھی اُن کے ساتھ چلنے کے لئے مڑ ہی رہا تھا کہ ایک آواز نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔

وہ بووی کی آواز تھی..... اُس نے میرا نام پکارا تھا۔

سردار روبان بوگا لے اور تمام مصاحبین حیرت سے قیدیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ بوگا لے دو

قدم آگے بڑھنا اور گھور کر قیدیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم میں سے ابھی کون بولا.....؟“ بوگا لے نے کہا۔ قیدی سہمے سہمے سے پیچھے ہٹنے لگے۔

بووی بھی پُپ گم سم کھڑا رہ گیا۔ بوگا لے کی دھاڑتی ہوئی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ ”میں نے پوچھا

ابھی تم لوگوں میں سے کون بولا؟“

اتنی دیر میں سردار روبان آگے بڑھا اور وہ بھی تیز آواز میں بولا۔ ”ابھی علی نواز کو اُس کے نام

سے کس نے پکارا ہے؟“ میں حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔ میں نے سردار

روبان کے کان کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”سردار، میں آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

میری بات سن کر سردار روبان میری طرف پلٹا۔ ”بولو علی نواز.....!“ سردار کی آواز میں رعب

تھا۔ ”سردار یہاں نہیں..... نشست گاہ کی طرف چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”سردار روبان نے بوگا لے کو آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ زندان کے آگے سے ہٹ گیا۔ نشست

گاہ میں پہنچے ہی میں نے اُس کے سامنے اپنا سوال رکھ دیا۔

”علی نواز! کیا وہ تمہارے بھروسے کا آدمی ہے؟“ سردار روبان بولا۔

”اُس کی پوری ذمہ داری میں خود پے لیتا ہوں۔ میں جیسا کہوں گا وہ ویسا ہی کرے گا۔“

”اگر تم آگ میں کودو تو وہ بھی تمہارے ساتھ کودے گا؟“ بوگا لے منحوس شکل کے ساتھ بولا۔

”ہاں..... بالکل ایسا ہی ہے۔“ میں پر یقین لہجے میں بولا۔

”تو ٹھیک ہے۔ اُسے آزاد کر کے تم تک پہنچا دیا جائے گا۔“ بوگا لے کچھ دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا

گاہ نشست گاہ سے باہر نکلا تو سردار روبان بولا۔

”علی نواز! اب تم جاؤ..... رات آرام کرو تمہاری مطلوبہ چیز تمہارے کمرے میں پہنچ چکی

ہے۔ جتنی تمہیں سردار روڈو کے حضور پیش ہونا ہے۔“

”مگر سردار! وہ میرا ساتھی..... بووی.....“

”اُس سے بھی تمہاری ملاقات جلد کرا دی جائے گی۔“

میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔ میں وہاں سے نکل کر سیدھا رینا کی قیام

اویس پہنچا۔ رینا مسہری پر اوندھی پڑی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں گلا کھٹکھارتے ہوئے

”رینا.....! بووی قید سے چھوٹ جائے گا۔“ میری بات کا رینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں

دوبارہ اور سہ بارہ بولا مگر جواب نہ دیا۔ اتنے میں ایک طرف سے پوباشے برآمد ہوئی بولی۔ ”سرا رینا بی بی آپ سے ناراض ہیں۔“

”اپنی بی بی سے پوچھ کر بتاؤ کیوں ناراض ہیں۔“ میں کن آنکھوں سے رینا کو دیکھ کر بولا۔

”سردار! آپ نے ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا جو نہیں کھایا اس لئے۔“

اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے رینا کی طرف بڑھا۔ ”سوری رہنا۔“

مجھے بہت جلدی تھی۔۔۔۔۔ اگر میں تمہارا کھانا کھانے رک جاتا تو بووی والا کام بیچ میں ہی رہ جاتا۔

بہر حال بہت جلد میں نے اُسے چکنی چیزیں باتوں سے راضی کر لیا۔ رینا غمناک آنکھوں سے مجھے کم

کھلاتی رہی اور مسکراتی رہی۔ مجھے اس کی یہ ادا بڑی بھائی۔۔۔۔۔ کھانے کے دوران ہی رینا خوش ہو

بولی۔ ”مجھے ابھی پوباشے نے بتایا ہے کہ سردار روڈ پر بت کے پار سے آچکے ہیں اب۔۔۔۔۔ اب

ہمیں بڑی جلدی آزادی مل جائے گی۔“

میں رینا کی بات سن کر چپ ہو رہا۔ مجھے رینا کے پاس بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی میں نے نہ

جب ادھر سے اٹھنا چاہا اس نے اصرار کر کے مجھے تھوڑی دیر کے لئے اور بٹھالیا۔ آخر جب میں وہا

سے اٹھا تو رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ میں جونہی اپنی خواگاہ میں داخل ہوا ایک دلنواز خوشبو نے

استقبال کیا۔ جب میری نظر مسہری پر پڑی تو وہاں ساسا لیٹی ہوئی تھی اور صرف لیٹی ہوئی نہیں تھی با

اس کے ہاتھ اپنی زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دروازہ اندر سے

کر لیا۔ ساسا کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں اس

کلا بیاں خون آلود ہو رہی تھیں۔ میں نے اُسے مسہری سے اٹھا کر سیدھا کیا اور درد بھرے لہجے

بولاً۔ ”ساسا! مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میری وجہ سے تمہیں آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔“ ساسا کچھ نہ

بولی غنودگی کی حالت میں یک تک مجھے دیکھتی رہی یوں لگتا تھا جیسے یہاں لانے سے پہلے اسے کوئی

آور مشروب پلایا گیا تھا۔

”ساسا! تم میری بات سن رہی ہونا۔۔۔۔۔ میں نے ساسا کے سامنے انگلیاں نہ چائیں۔ سا

غور سے مجھے دیکھتے دیکھتے مسکرانے لگی پھر وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگی اور مدھوشی کے عالم میں آنکھوں

آنسو بھر کے بولی۔ ”وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔ یہاں بہادر

گناہ ہے۔۔۔۔۔ بُردل ہونا خوش قسمتی ہے۔ علی نواز۔۔۔۔۔ علی نواز۔۔۔۔۔ تو کیا سمجھتا ہے تو بہادر بن کر

نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ تو بچا نہیں۔۔۔۔۔ تو بچا نہیں۔۔۔۔۔ وہ تیری ہڈیوں کے گودے میں سے بھی

نیت وصول کرے گا۔“

”ساسا! تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کس کی بات کر رہی ہو تم۔۔۔۔۔؟“ میں تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

ساسا باتیں کرتے کرتے گہری غنودگی میں چلی گئی پھر وہ مدھوش و حواس سے بیگانگی ہوگئی۔ میں اس کے

پاس ہی مسہری پر بیٹھ گیا۔ اسے ہوش رات کے آخری پہر آئی۔ اس دوران میں مسلسل جاگتا رہا اور اس

کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ دوبارہ ہوش میں آئی تو قدرے بہتر تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر

ایک دم چونک گئی۔ ”تت۔۔۔۔۔ تم یہاں۔۔۔۔۔“

”ہاں ساسا!۔۔۔۔۔ میرے کہنے پر ہی وہ لوگ تمہیں یہاں چھوڑ گئے ہیں۔“ ساسا چند لمحے

شرمندہ شرمندہ سی مجھے کن آنکھوں سے دیکھتی رہی وہ چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اصل

موضوع کی طرف آگئی بولی۔ ”علی نواز! تم بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہو۔۔۔۔۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔۔۔۔۔؟“ میں سیدھا ہو کر بولا۔

”علی نواز! تمہاری جان اب کبھی بھی یہاں سے نہیں چھوٹے گی کیونکہ بوکاشی کا حکم پتھر پر لکیر

ہوتا ہے۔ وہ جو کہتا ہے وہ آخری ہوتا ہے۔ بوکاشی کی حکومت بہت بڑی ہے اس کی حدیں بہت لمبی

ہیں۔ انسان اگر یہاں سے بھاگنا چاہے تو کبھی بھی بوکاشی دیوتا کی مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں نکل

سکتا۔ یہ سلطنت ایک پنجرہ ہے۔ یہاں آنا آسان اور بوکاشی دیوتا کی مرضی کے بغیر نکلنا ناممکن ہے۔

”علی نواز! مجھے کل ہی پتا چل گیا تھا کہ سردار روڈ پر بت کے پار سے واپس آگئے ہیں علی

نواز مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک سال ہو چلا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے تمہارے

بچنے پنے بہادری کا تم نے سچا کہہ نہیں سکتے۔ اس پار بھیجا جا رہا ہے جہاں بوکاشی دیوتا کی سلطنت

ہے۔ جہاں دن بوکاشی دیوتا کے حکم سے نکلتا ہے۔ رات بوکاشی دیوتا کے حکم سے چڑھتی ہے۔ میں

تمہیں پھر بتاتی ہوں بوکاشی دیوتا کا حکم اٹل اور آخری ہوتا ہے۔ تم اگر لاکھ کوشش بھی کر لو اُس کے حکم

سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ تمہیں ہر صورت پر بت کے اس پار بھیج دیا جائے گا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی

ہوں کہ تم اپنی محبوبہ کی جان بچا سکتے ہو۔۔۔۔۔“

”محبوبہ۔۔۔۔۔؟“ میں حیرت سے بولا پھر ایک دم مجھے یاد آ گیا۔ وہ شاید رینا کی بات کر رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے یاد آیا بولو تم کیا کہہ رہی تھی۔“ میں الجھن بھرے لہجے میں بولا۔

”علی نواز! جب کل تم سردار روڈ کی خدمت میں حاضر ہو گے تو اُس سے رینا کی رہائی مانگ

لینا۔ تم ابھی اپنی بات منوانے کی بات نہ کر سکتے ہو۔“

یکدم جھماکا سا ہوا اور کوئی روشنی دماغ میں روشن تر ہوتی چلی گئی۔ ساسا نے مجھے بہت بڑی بات بتلا دی تھی۔ آدھے سے زیادہ بوجھ جیسے میرے سر سے اتر گیا تھا۔ رینا کی زندگی بچ رہی تھی اس سے زیادہ اور مجھے کیا چاہیے تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایسا ہی کروں گا صبح سردار روڈاؤ سے اپنی پہلی اور آخری بڑی خواہش کا اظہار کروں گا اس کے بعد وہ لوگ جہاں چاہتے مجھے پھینک دیے جو چاہتے مجھ سے کام لیتے۔ اچانک اس وقت پہلے دل کے آس پاس کہیں سے میٹھا سا چشمہ پھوٹا اور میں نہال ہو گیا۔ میں رابعہ کے لئے اپنا آخری پیغام رینا کے ہاتھ بھیجوں گا۔ میں اس کا غد میں اپنا سارا حال لکھ کر بھیج دوں گا اور یہ بھی لکھوں گا کہ اگر میں بچ گیا تو لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی جیسے میرے وجود میں جیتی آگئی میں خود کو چاک و چوبند محسوس کرنے لگا۔

اگلی صبح میرے لئے بڑی اہم تھی۔ میں تڑکے ہی اٹھ کر اس قید خانے کے پاس پہنچ گیا جہاں بووی کو قید کیا گیا تھا۔ وہاں کے محافظ سے پتا چلا کہ بووی کو کل رات ہی سردار روڈاؤ چھڑا کر لے گئے تھے۔ میں سردار روڈاؤ کی قیام گاہ میں پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کا نائب ایک بار پھر میرے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ اسی سے معلوم پڑا کہ سردار کو کسی قیدی کو لے کر بوگا لے کر لے کر لے گئے ہیں۔ میں نے نائب کو ساتھ لیا اور بوگا لے کر قیام گاہ کی طرف چل دیا مگر راستے میں ہی سردار روڈاؤ ہمیں مل گیا۔

رسی علیک سلیک کے بعد میں نے بووی کے بارے میں اس سے پوچھا تو وہ مجھے لیتا ہوا ایک چٹلی راہداری میں آگیا وہاں ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا جس کے اندر تین خوبصورت کنیریں بووی کی خدمت پر مامور تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بووی کے چہرے پر مسکان کھیلنے لگی اس کے خزاں رسیدہ چہرے کی بہار جیسے لوٹ آئی تھی وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

سردار روڈاؤ جلدی میں دکھتا تھا وہ مجھے وہاں چھوڑ کر اپنے نائب کے ساتھ واپس چلا گیا۔ بووی میرے سامنے بیٹھا تھا گزرے لمحوں کی فلم میری آنکھوں میں چل رہی تھی۔ میں نے آخری دن بووی کو زندان میں دیکھا تھا اور اس سے پہلے بووی سے میری ملاقات ایک مہینہ پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ زخموں میں لیٹا ہوا تھا اسی کے کہنے پر میں یہاں رینا کو ڈھونڈنے نکلا تھا جب میں پڑاؤ سے رخصت ہوا تھا اس وقت رابعہ بے ہوش تھی۔ اس کے بعد رابعہ ہوش میں آئی تھی اس نے کیا کہانی سنائی تھی میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ رابعہ اس وقت کہاں تھی میں یہ بھی نہیں جانتا تھا جو شخص اس وقت میرے

سامنے بیٹھا تھا وہ مجھے سب کچھ بتا سکتا تھا۔ ایک میٹھی میٹھی چہن سی دل میں ہونے لگی تھی۔

”بووی! کچھ بھی بتانے سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ رابعہ اس وقت کہاں ہے؟“ میرے دل کی دھڑکن انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ میری نظریں بووی کے چہرے پر گڑھی تھیں اور کان ہمہ تن گوش تھے۔ بووی مام سے لہجے میں بولا۔ ”علی نواز! وہ لوگ تو واپس زمبابوے چلے گئے ہیں۔“

”کون..... لوگ..... کن لوگوں کی بات کر رہے ہو تم؟“ میں تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

”پڑاؤ میں موجود سب لوگ..... موسم کافی دن سے خراب چلا آرہا تھا جس کی وجہ سے واپسی کا پروگرام بٹے پایا۔ جم کیٹی کے کہنے پر سب لوگوں نے واپسی کا رخت سفر باندھا اور چل دیئے۔ میری قسمت خراب کہ میں پیچھے رہ گیا۔“

میرا دل غم کے کسی بہت گہرے تالاب میں ڈوب گیا۔ تو کیا جس کی خاطر میں یہ سارے پاؤں تل رہا تھا وہ اس جنگل میں ہی نہ رہی تھی۔

”علی بھائی!“ بووی نے پھر غناک آنکھوں سے کہنا شروع کیا۔ ”سب لوگوں نے مجھے بہت منع کیا، سمجھایا کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں مگر مجھ پر تو ایک بھوت سوار تھا۔ میں اپنی میکی کی ہڈیاں اٹھی کر کے پہنچ گیا۔ میں وہیں پہنچ گیا جہاں آخری بار میں نے میکی کی کٹی پھٹی لاش دیکھی تھی۔“

”پھر کیا ہوا..... بووی؟“ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

بووی کہنے لگا۔ ”میں جب مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو طوفان کی تیزی بڑھ گئی۔ مجھے ایک پہاڑی کھوہ مل پناہ لینا پڑی۔ میں پورے تیس گھنٹے بھوکا پیاسا اس کھوہ میں چھپا رہا۔ جب موسم کے تیور کچھ ٹھیک ہوئے تو میں کھوہ سے باہر نکل آیا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ایک درخت سے پھل توڑ رہا تھا کہ ٹنگیوں کے تھپتھپانے سے چڑھ گیا اور پھر جنگلی مجھ باندھ کر اس وادی میں لے آئے۔“

”بووی! رابعہ کیسی تھی؟“ میں غناک آنکھوں سے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا ایکدم ہی منظر سونا اور ہر چیز اداس نظر آنے لگی تھی۔

”اچھی تھی..... اور تمہاری طرف سے بے حد فکر مند تھی۔“ بووی بولا۔

یکدم جیسے کسی نے میٹھی سوئی میرے دل میں چھو دی میں بے اختیار ہو کر بولا۔ ”رابعہ! میرے متعلق فکر مند تھی.....؟“

”ہاں..... وہ تمہاری طرف سے خاصی دل گرفتہ نظر آتی تھی.....“ کتنے آرام سے بووی نے لفظ ادا کئے تھے۔ خوشی سے دھیرے دھیرے میرا وجود لرز نے لگا تھا۔ میں خوشی کے آنسو چھلکا رہا ہوں۔ ”رابعہ نے میرے متعلق اور کچھ بھی کہا تھا؟ مہمیرا مطلب ہے۔ ہوش آنے کے بعد وہ میرے وہاں نہ ہونے کی وجہ سے فکر مند تو ہوئی ہوگی۔“

”علی بھائی! کیا ہو گیا ہے آپ کو..... میں بتا تو چکا ہوں کہ وہ آپ کی غیر موجودگی سے بہرہ ڈنٹ رہی تھی.....“

میں بووی سے کرید کرید کر سوال پوچھتا رہا۔ اس لئے کہ کہیں رابعہ کا ذکر آئے اس کے احساسات کے بارے مجھے پتا چلے..... ہماری یہ ملاقات تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی۔ اتنے وقت میں کئی دفعہ میری آنکھیں بھیگیں کئی دفعہ میں نے آنسوؤں کو پونچھا۔

بووی بہت پریشان لگتا تھا وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کی پریشانی سچی تھی اس کے سامنے اس وقت زمبابوے پہنچ گئے ہوئے تھے اور وہ یہاں پھنس کے رہ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا اس کی کشدگی سے کالج کے تمام لوگ بے حد پریشان ہوں گے۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور وہاں سے اٹھ آیا۔

میرے ذہن میں ایک نئی سوچ پروان چڑھ رہی تھی اور مجھے اس پر ہی عمل پیرا ہونا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ خواہ گاہ کی طرف تھا۔ میں وہاں پہنچا تو رینا میری ہی منتظر بیٹھی تھی وہ بہت غمگین لگتی تھی۔ میں نے جب پوچھی تو دل گرفتہ سی بولی۔ ”علی نواز! میرے بھائی..... مجھے لگتا ہے..... بہت گڑبڑ ہے..... کوئی بہت بڑا طوفان اٹھنے والا ہے۔ ایک خونی آندھی چلنے والی ہے..... پھر..... پھر ہر ایک چیز خونی سرنخی میں ڈوب جائے گی۔“ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا وہ پھر سے گواہوئی..... ”علی نواز! میں نے بہت بھیا نک خواب دیکھا ہے۔“

”رینا! اکثر خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے چھوڑو ان باتوں کو..... میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں.....“ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں..... وہ جیسے ٹرانس میں بولی۔ ”علی نواز! میں دیکھ رہی ہوں۔ سب کچھ پر بت کے اس پار ختم ہو رہا ہے۔ تلاش وہاں مکمل ہو رہی ہے..... میں تمہیں بہت پریشان دیکھ رہی ہوں.....“

میں نے رینا کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور چیخنے ہوئے بولا۔ ”رینا! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسی باتیں کر رہی ہو.....“ اچانک رینا آگے بڑھی اور میرے کندھے کے ساتھ لگ کر نہایت نجف اور کمزور آواز میں بولی۔ ”علی نواز! رابعہ تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔ اس کے پیچھے بھاگنے سے تمہیں

کچھ نہیں ملے گا..... سوائے غم اور تکلیف کے..... وہ..... وہ کسی کے بھی مقدر میں نہیں ہے..... کسی کے بھی..... تمہارے لئے اسے بھلانا ہی بہتر ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں رینا سے کچھ کہتا باہر کھٹ پٹ سنائی دی اور تیزی سے خواہ گاہ کا دروازہ کھل گیا۔ پوٹاشے گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے وہی دیو پھل آدمی تھا جس کی میں ناک کی ہڈی توڑ چکا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل مزید ڈراؤنی ہو گئی ہوئی تھی۔ اس کا نام ”بوگے“ تھا۔ وہ نیری سے آگے بڑھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”چلو..... تمہیں سردار روڈو بلا رہے ہیں.....“ مجھے اس کے لہجے پر طیش تو بہت آیا مگر میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لیتا ہوا محل سے باہر نکل گیا آج میں پہلی بار محل سے باہر نکلا تھا۔ بن مانس کے بہت بڑے بت کے نیچے چبوتروں پر ہر طرف جنگلی سردار بیٹھے تھے۔ یہ وہی بن مانس کا بت تھا جو میں نے چند دن پہلے پہاڑ کی چوٹی سے ت کے وقت دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں دو مشعلیں جل رہی تھیں۔ تیز چمکی دھوپ دل و عرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ دن کے اُجالے میں بن مانس کا یہ قوی پیکل مجسمہ عجیب ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

سردار روڈو نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک چبوترے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔ سردار روڈو مجھ سے پوچھنے لگا کہ ان دنوں میں کہیں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تم چین و دن سے رہ رہے ہو۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو سردار دوبارہ گویا ہوا۔ ”علی نواز! دیوتاؤں کا اپنا خاص کرم ہے۔ بوکاشی دیوتا نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔ کل ہی تمہیں اس سفر پر روانہ کر دیا جائے گا۔ دیکھو۔“ سردار روڈو ایک بلند پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس پہاڑ کے پار خوش قسمتی تمہارے لئے بائیں پھیلائے کھڑی ہے۔ وہ مہمان وادی یہاں سے تین دن کی دوری پر ہے۔ یہ سفر گھوڑوں پر طے ہوگا۔“

”مگر سردار! میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں.....“ میں لجاجت سے بولا۔

”ہاں بولو کہنا چاہتے ہو.....؟“

”سردار! میری ساسھی لڑکی کو یہاں سے آزاد کر دیا جائے۔“

”اس کی آزادی کا پروانہ بوکاشی دیوتا جاری کر چکے ہیں اور کوئی تمنا کرو۔“

ایک دم جیسے میرا خون ڈھیروں بڑھ گیا۔ مجھے لگا جیسے میرا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔

میرا ناک کو جنگلیوں کی قید سے چھڑانے آیا تھا اور ایک مہینے سے یہاں محصور ہو کر رہ گیا تھا اب میری قید

ہوئے تھی۔ مقامی رواج کے مطابق اُس کے چہرے پر عازہ لگایا گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں نہایت خوبصورت ہفت رنگ جوتی تھی۔ اس کے ساتھ دونوں جانب دو کینریں کھڑی تھیں۔ وہ کینریں رینا کے بازو کو نرمی سے تھامے ہوئیں آگے بڑھنے لگیں۔ رینا ایک ایک قدم سردار رواج کی طرف بڑھنے لگی۔ میں جب رینا کو محل میں چھوڑ کر آیا تھا اس وقت وہ کافی پریشان اور طول تھی مگر اب اس وقت کی نسبت وہ کافی خوش و خرم تھی۔ وہ بار بار مسکرا کر میری طرف دیکھ رہی تھی یوں لگتا تھا اس کے دل میں میرے لئے بہت خوشی کی بات چھپی ہوئی ہے جو وہ مجھے بتانا چاہتی ہے۔ مگر اتنے لوگوں کے بیچ نہیں بتا رہی ہے۔

”علی نواز! بوکاشی دیوتا کے کہنے کے مطابق تمہاری ساتھی اس لڑکی کو ابھی آزاد کیا جا رہا ہے۔“

سردار رواج ڈکھڑاہو کر بولا۔

میرے دل میں خوشی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا راجہ کا خط میں نے اور مضبوطی سے بھینچ لیا۔ ”رینا! میری بہن میری جان تمہیں آزادی مبارک ہو.....“ میرے اندر جیسے یہ آواز گونجی۔ ڈھول مسلسل بج رہا تھا اور رقص جاری تھا اسی دوران اچانک ایک طرف سے بوگالے ظاہر ہوا اس کی وحشی صورت دیکھ کر دل گھبرانے لگتا تھا۔ اتنی عصا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ تیزی سے رینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بن مانس کے جیسے کے پاس پہنچ کر کینریوں نے رینا کے بازو چھوڑے اور واپس ہٹ گئیں۔ رینا کا منہ جسے کی طرف تھا۔ پھر ایک ادا سے رینا گھومی اس کی نگاہ جو منی مجھ پر پڑی اس کا داہنا ہاتھ اٹھا اور ہلنے لگا وہ بھرپور انداز میں مسکرا رہی تھی اور ہاتھ ہلا رہی تھی اس کے جواب میں، میں نے بھی ہاتھ ہلایا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر رینا کو وہ خط بھی دکھایا جو میں نے راجہ کے لئے لکھا تھا۔ رینا سے میرا فاصلہ پچاس ساٹھ گز کے قریب تھا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے پوچھنے لگی کہ یہ کیا ہے؟.....

میں ہونٹ ہلا کر اسے سمجھانے لگا کہ یہ خط ہے..... میں ابھی اسے سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک دم بوگالے آگے بڑھا پہلے اس کا اتنی عصا فضا میں بلند ہوا اور پھر بڑی قوت سے نیچے کی طرف آیا۔ بوگالے اس وقت رینا کے پاس کھڑا تھا۔ عصا کی تیز دھار نوک رینا کی خوبصورت جوتی کو کاٹتی ہوئی رینا کے پاؤں کا پنجہ چیرتی ہوئی زمین میں دھنس گئی۔ ایک کر بناک چیخنے قرب و جوار لرز اڑیے۔ رینا کمر کے بل جھکی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پاؤں تھام لیا۔ رینا اس وقت رکوع کی صورت جھکی ہوئی تھی۔ ایک قوی ہیکل گنجا جنگلی اس وقت بڑی تلوار لیے بوگالے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ گنجا جنگلی نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تلوار کا بھرپور وار رینا کی گردن پر کیا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ رینا کا کٹا ہوا سر

کے بدلے رینا کو رہائی مل رہی تھی مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ میں نے ایک چیز پہلے سے سوچ کر رکھی تھی۔ اسی سوچ کے تحت میں نے ایک خط تحریر کیا تھا جس میں اپنا دل کا حال کھول کے بیان کیا تھا۔ راجہ کے لئے میں نے وہ سب کچھ لکھا تھا جو آج تک میں اس سے نہ کہہ پایا تھا جو میری زبان پر آتے آتے دم توڑ جایا کرتا تھا۔ یہ خط میں نے وقت رخصت رینا کو تھماتا تھا کہ وہ میرے دل کا حال لے کر راجہ تک پہنچ جائے گی مجھے تو پتا نہیں یہاں سے زندہ واپس لوٹنا بھی تھا یا نہیں میری بے چین دھڑکنوں کی ترجمانی تو راجہ تک پہنچ جاتی۔ میں نے دل میں ٹھان لی تھی میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا جو بھی ہوگا میں کروں گا لیکن ساسا کو اس کا شوہر بالی ضرور لوٹا کر جاؤں گا۔ اپنے اس وعدے کو ضرور وفا کرنے کی کوشش کروں گا جو میں ساسا سے کر چکا تھا۔

ساسا جب مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس چاہوں۔ میری یہاں سے رہائی کسی طور بھی ممکن نہیں ہوگی۔ تو اس وقت میں نے دل میں ایک عہد کر لیا تھا۔ پر بت کے اُس پار تو مجھے جانا ہی تھا اور اس کے لئے میں خود کو ذہنی طور پر تیار بھی کر چکا تھا۔ پر بت کے پار جا کر میں ساسا کی ناتمام آس کے لئے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ میں اپنی تمام خدمتیں بوکاشی کو پیش کر کے اس کے بدلے ہائی کی رہائی مانگ سکتا تھا۔ ساسا اس وقت بھی ایک چبوترے کے ساتھ ٹنگن کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت پناہ کرب تیرتا رہتا تھا۔ وہ کرب اپنے محبوب کی جدائی کا تھا۔ اس کے انتظار کا تھا۔ میرے سینے سے ایک آواز بلند ہوئی۔ ”ساسا! تم فکر مند نہ ہونا۔ کیا ہوا جو تمہارا باپ ناکو نہیں رہا۔ میں تمہارے باپ مشن پورا کروں گا۔ میں بالی کو واپس لے کر آؤں گا۔“

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ایک طرف سے شور سا بلند ہوا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر چھوٹا سا ایک جلوس چلا آرہا تھا۔ وہ بہت سے مرد و زن تھے جو ڈھول کی تھاپ پے رقص کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے کسی چیز کو گھیر رکھا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ چیز بھی نظر آگئی جسے الہ جگیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ ایک ڈولی کی طرح کا کھٹولا تھا جو رنگارنگ پھولوں سے سجا ہوا تھا اور کھٹولے میں رینا سوار تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ رینا دلہن کی طرح بھی ہوئی تھی اس نے خوبصورت کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے جن پر موتی اور نایاب پتھر جڑے ہوئے تھے۔ مقامی طرز کے بہت سے زیورات سے وہ لدی ہوئی تھی۔ وہ جب چبوترے کے قریب آ کر کھٹولے سے اتری تو میں انگشت بدندان رہ گیا۔ رینا آج سے پہلے اتنی خوبصورت نہ لگی تھی وہ ایک گڑیا کا روپ دھار۔

لڑھکتا ہوا دور جاگرا۔ چند ثنائے جیسے مکمل خاموشی کے گزر گئے۔ ڈھول بج رہا تھا جنگلی ناچ گارسے تھے۔ سب کچھ نظر آ رہا تھا مگر آواز ناپید تھی۔ ایک سرخ آندھی اٹھی تھی جس نے ہر چیز کو خونی سرخی میں ڈبو دیا تھا۔ جنگل کے تمام وحشی درندے جیسے ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک ساتھ چلانے لگ گئے تھے۔

”رینا!“ میری کر بناک چیخ جیسے آسمانوں کے پردے چیرتی ہوئی چلی گئی۔ مجھے یاد ہے چ سات کے قریب جنگلیوں نے مجھے فوراً دبوچا تھا۔ مگر وہ اس چیز سے لاعلم تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جو آگ اس وقت میرے سینے میں یکدم بھڑک کر الاؤ کی شکل اختیار کر گئی تھی وہ اس جنگل اور یہاں کی ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ میرے چہرے اور سینے سے جیسے آگ کی پلشیں نکل رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر گھوما تھا۔ اسی جھٹکے سے چار جنگلی الٹ کر گرے تھے باقی بچ جانے والے ایک جنگلی کے پیٹ میں، میں نے کہنی رسید کی ایک کو خود کے اوپر سے گھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ایک میرے راستے کو دوبارہ تو میرے ایک ہی بیچ نے اسے زمین بوس کر دیا۔ میں دوڑتا ہوا اس سمت بڑھا جہاں بھی میری نظروں کے سامنے رینا کی لاش گری تھی۔ ایک جنگلی بھاگتا ہوا سامنے سے آیا۔ اس نے مجھے دبوچنا چاہا میں نے بھاگ کر بیٹھتے ہوئے اسے جھکائی دی۔ وہ اپنی رو میں آگے نکلتا چلا گیا اسی دوران ایک جنگلی کی نیام میں لگی ہوئی تلوار میں نے کھینچ کر نکال لی۔ تلوار کے دھتے میں میری انگلیاں جوست ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں تھہرناک سرخی در آئی تھی۔ دو مسلح جنگلی آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے روکنا چاہا مگر ایک مختصر وقفے میں میری تلوار دونوں کا لبو چاٹ گئی ایک کے کندھے پر تلوار پڑی تھی اور سینے تک اتر گئی تھی۔ جب کہ دوسرے کے سینے سے آ رہا ہو گئی تھی میں نے پلک جھپکتے سے تلوار کھینچ کر نکالی اور آگے بڑھا۔ میری نگاہیں بوگالے کا تعاقب کر رہی تھیں اور کسی وقت کے کہے ہوئے رہا کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”علی نواز! بوگالے درندوں سے بھی زیادہ خطرناک آدمی ہے۔“ وہ بوگالے کے خوف سے ہر لمحہ سہمی ہوئی رہتی تھی اور اسی درندے کے سامنے آج رہا اپنی جان ہار گئی تھی۔ مگر وہ درندہ نہیں جانتا تھا کہ اس دفعہ اس کا ناکرا کس کے ساتھ پڑا ہے۔ میں نے چار جنگلیوں کا گھیرا توڑتے ہوئے بوگالے پر جست کی اور اسے جالیا۔ اس سے پہلے کہ میری تلوار کا وار اس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیتا۔ میری تلوار والا بازو جکڑ لیا گیا۔ سردار روڈو اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ بلند تھا اور وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ تمام مصاحبین کھڑے ہو چکے تھے اور حیرت سے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ شاید آج سے پہلے انہیں یہاں ایسی دیدہ دلیری دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ میرا ایک ہاتھ بوگالے کے گریبان پے تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار بلند تھی۔ تین جنگلی میرے ہاتھ سے

لہوار چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک بوگالے نے بھڑے ہوئے انداز میں پاؤں کی زوردار ٹوکر میرے پیٹ میں رسید کی۔ جن جنگلیوں نے مجھے پیچھے سے جکڑ رکھا تھا میں ان تینوں کو لیتا ہوا بٹ کے بل پتھر ملی زمین پر گرا۔ گرتے وقت میرا داؤ چل گیا۔ میری کہنی کی خونی ضرب نے ایک جنگلی کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی جبکہ دوسرے کا ناک کچل ڈالا۔ میں جست لیتا ہوا کھڑا ہوا اور بوگالے کی سمت بڑھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ بوگالے کی مدد کے لئے اس کے خدمتگار بھی ابھی تک اس کے قریب نہیں پہنچے تھے۔ بوگالے اس وقت تن تہا کھڑا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ میری تلوار کا بھر پور وار اس کے کندھے پر پڑا۔ مگر کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بوگالے نے اپنا ہنی عصا گھمایا اور میرا یہ وار اپنے اعصابے روکا۔ پھر دوسرا تیسرا اور چوتھا وار بھی بوگالے روکتا چلا گیا۔ اسی دوران ایک سمت سے وہی گنجا جنگلی نمودار ہوا جس ذلیل انسان نے رینا کی گردن پے تلوار چلائی تھی۔ وہ اس وقت وہی بھاری تلوار تھامے ہوئے تھا۔ میری تلوار کے طوفانی وار روکتا ہوا بوگالے کا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں نے تیزی سے پیٹیر بدلا اور گھوم کر اپنا رخ اس منحوس گنجنے کی طرف کر لیا جو میری پیاری گڑیا جیسی بہن کو قتل کر چکا تھا۔

گنجا گرائڈیل ساڈل کی مانند تھا کوئی موقع ضائع کئے اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ کو زخم لگانے کی بجائے میری تلوار گرانا چاہتا تھا۔ شاید اس کے لئے یہی حکم تھا۔ وہ اپنے کام میں کافی پراعتماد نظر آتا تھا۔ اس کی سوچ کے مطابق مجھے زیر کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کی یہی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اسے لے ڈوبی۔ میں نے اس کے چار پانچ وار روک کر جب حملہ کیا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ میری تلوار آسمانی صاعقہ کی طرح چمک رہی تھی۔ ہر وار میں زہر کی سی کاٹ تھی۔ ایک وار ایسا بھر پور اور طوفانی پڑا کہ اس گنجنے گرائڈیل کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ نہتا ہو جانے کے باوجود اس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری تلوار کے دو وار اس نے جھکائی دے کر بچائے اور پھر کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کے میرے جسم کو جکڑ لیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی میری تلوار سے قطعی لاعلم نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا میں نے ہاتھ میں اس کی موت تھام رکھی ہے۔ مگر اسے اپنے اوپر دو سو فیصد یقین تھا کہ وہ جو نبی میرے جسم کو اپنے مخصوص انداز میں جکڑے گا ایک دم سے میری تمام طاقت سلب ہو جائے گی۔ بازو شل ہوگا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ وہ اپنی جگہ بالکل درست تھا اس کی فوری پکڑ میں واقعی اتنی قوت تھی کہ قابو آنے والے کی نائیں توڑ کے رکھ دیتی تھی اور مد مقابل کے جسم سے جیسے ایک دم ساری جان نکال لیتی تھی۔ مگر یہاں

وہ اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے آخری بھول کر گیا تھا۔ اس وقت واسطہ کسی اور سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس جنگجو سے تھا جس نے بلند ترین مقام اسکردو کے سخت بریلے موسم سے بچنے کے لیے گرم طوفان کی طغیانیاں سہی تھیں۔ اپنے جاپانی ٹیچرلی چوکی سخت سے سخت سزائیں بھی تھیں اور گھبراہٹ نہیں تھا۔ ڈرگیا نہیں تھا۔

اس منحوس کنبے کی پکڑ میں فولاد کی سی سختی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ پسیلوں کا سرمہ بنا کے رکھ دے گا۔ مگر میں اس کا داؤ چلنے سے پہلے ہی اپنا داؤ چل گیا ہوا تھا۔ میں اُس کے خود کو دبوچنے سے پہلے ہی اپنا جسم بریتھ کنٹرول میں لے آیا تھا۔ میں نے اپنا سانس سینے کے اندر قید کر لیا تھا۔ میرا تمام جسم جیسے فولاد میں ڈھل گیا تھا۔ فولاد سے ٹکرا کر سر پھوڑا جاسکتا ہے اسے توڑا نہیں جاسکتا۔ گنجا جنگلی اپنے دم میں مجھے ”بری“ طرح قابو کر چکا تھا اور وہ میرے ہاتھ سے تلوار چھوڑنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر وہ اس سے بے خبر تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہونے لگا ہے۔ میری آنکھوں میں سرخی ہی سرخی تھی اور کہیں چھوڑا مارا آنسوؤں کا چشمہ بھی نمودار ہو چکا تھا۔ میرے حلق سے ایک چٹکھاڑ بلند ہوئی اور میری تلوار گنبے جنگلی کے دائیں پہلو میں داخل ہوئی اور بائیں طرف سے نکل گئی۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک دم ہی اُس کی گرفت میرے بدن سے ختم ہو گئی۔ پاؤں زمین پر ٹپکتے ہی میں نے تلوار کھینچ کر نکال لی اور پھر..... دو قدم پیچھے ہٹے ہوئے میرے بازو نے ایک بار پھر حرکت کی اور گنبے جنگلی کی گردن صاف اڑ گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے میری بازو میری رینا کو قتل کیا تھا۔

میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں میں ابھوسوار تھا میرے بس میں ہوتا تو میرا یہاں موجود تمام جنگلیوں کی گردنیں اڑا تا چلا جاتا مگر ایسا ممکن نہیں تھا مگر یہ تو ممکن تھا میں بوگا لے کوئی اصل کر دیتا۔ میں نے گنبے جنگلی کے ہاتھ سے چھوڑ جانے والی بڑی تلوار اٹھالی تھی۔ اب میرے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ میں بوگا لے کو قتل کئے بنا رینا کی لاش کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میری تیزی سے اس سمت لپکا جدھر اس وقت بوگا لے تھا۔

”رک جاؤ..... اعلیٰ نواز.....“ رواؤ کی پاٹ دار آواز گونجی۔ اس کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا۔

”سردار! تم سب لوگ جھوٹے ہو۔ جھوٹ..... بہت بڑا جھوٹ بولا ہے تم نے مجھ سے۔“

”کیسا جھوٹ! اعلیٰ نواز..... تم کس جھوٹ کی بات کر رہے ہو.....“ سردار رواؤ بولا۔

”سردار! اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوگا کہ تم نے کہا رینا کی آزادی کا پروانہ بوکاشی!

جاری کر چکے ہیں مگر اسے یہاں میری نظروں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔“ میں آنسوؤں سے بھیکے لہجے میں بولا۔

”نو جوان! تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا..... اس لڑکی کی آزادی یہی تھی۔ اگر یہ زندہ رہتی تو موت سے بھی بدتر زندگی ہوتی اس کی.....“ سردار رواؤ چلاتے ہوئے بولا۔

”اس کا قصور کیا تھا؟“ میں دھاڑتے ہوئے بولا۔

”اس کا قصور یہ تھا کہ یہ میری دلہن بننے والی تھی۔ شادی ہوتے ہی یہ دیوتاؤں کی داسی بن جاتی۔ اس کو بہت اونچا مقام ملتا مگر اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ اس نے بوکاشی دیوتا کا قانون توڑا۔ ایک باہر کے آدمی کے ساتھ بھاگنے کی مرتکب ہوئی یہ..... یہی اس کا جرم ہے۔“

”مگر وہ باہر کا آدمی میں ہوں۔ مجھے کیوں سزا نہیں دی گئی.....“ میں چلاتے ہوئے بولا۔

”کیونکہ تم ایک بہادر آدمی ہو..... اور بہادروں کی بوکاشی دیوتا کو بہت ضرورت ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ..... اور آگے کی فکر کرو..... اس لڑکی کی سزا میں اس لئے تاخیر کی گئی تھی کہ ابھی بوکاشی دیوتا کا حکم نہیں پہنچا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا اتنے دن ملنے والی مہلت سے تم نے فائدہ اٹھا لیا۔ اپنی محبوبہ سے دل بہلا لیا۔ اب پچھلا صوب بھول جاؤ آگے کی سوچو..... آگے آگے دیکھو..... تمہیں کیا کچھ ملتا ہے۔ بوکاشی دیوتا کے حکم پر چلتے جاؤ گے تو ایک سے بڑھ کر ایک داسی تمہیں پیش کی جاتی رہے گی۔ تم مرنے والی اس لڑکی کو بھول جاؤ گے۔ چلو شاباش تلوار پھینکو اور میرے پاس آؤ۔“ سردار رواؤ بلند لہجے میں بولا۔

غم و غصے کی شدت سے میرا پورا وجود کاپنے جا رہا تھا میں بلند آواز میں چیخا۔ ”سردار رواؤ! میں تم سب پر اور تمہارے بوکاشی دیوتا پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں۔“

”جوان! اپنی زبان کو لگام دو.....“ سردار رواؤ چٹکھاڑتے ہوئے بولا۔

”سردار! میں تیری اس ساری سلطنت کو آگ لگا دوں گا۔“ میں رینا کے سر کئے وجود کو خود سے لگاتے ہوئے بولا۔ آنسو قطار اندر قطار میری آنکھوں سے بہتے چلے آ رہے تھے۔

”لڑکے! تم حد سے تجاوز کر رہے ہو.....“ سردار لال بھٹکا بولا۔

”سردار! میں اپنے سچے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے ابھی اسی جگہ مار ڈالو نہیں تو میں بوکاشی دیوتا کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ بوکاشی دیوتا کی سلطنت کی حدوں میں اتنی آگ بھر دوں گا کہ نسلوں سے بھی نہیں بجھے گی۔“



ہوتا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ایک اور بھر پور ظالمانہ ضرب میری سماعت میں گونجی اور میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گیا۔ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تب میں گہری غنودگی میں تھا۔ غنودگی میں بھی میری آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں اور میں رینا کو پکار رہا تھا۔ میں رورہا تھا اور مسلسل رینا کو پکارے چلا جا رہا تھا۔ رینا کی آخری ملاقات کے مدہم نکس میری آنکھوں میں رقص کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ایک خونی آندھی چلنے والی ہے پھر..... ہر چیز خونی سرخی میں ڈوب جائے گی۔ علی نواز! میں نے بہت بھیا نک ڈوب دیکھا ہے۔

میرے دماغ میں جیسے کوئی ہتھوڑے برسائے لگا۔ رینا پیش بین تھی۔ آنے والے حالات کے بارے میں اسے پہلے سے خبر ہو جاتی تھی۔ وہ سوتے میں بہت کچھ دیکھ لیتی تھی۔ اُس کا آخری وقت میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانا۔ اس کا میرے گلے میں لاکٹ پہنانا۔ اس کا یہ کہنا کہ علی نواز! میں دن رات یہی دعائیں کرتی ہوں کہ تمہاری طرف بڑھنے والی مصیبت مجھے مل جائے، تمہارے مقدر میں لکھی ہوئی تکلیف میرے حصے میں آجائے، تو رینا کی دعا جیسے پروردگار نے سن لی تھی۔ اس نے کہا تھا علی نواز! میرا دل چاہتا ہے تم مجھے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارو۔ میری قبر پر ایک خوبصورت سا گلدستہ رکھو۔

میں غنودگی میں بڑبڑانے لگا۔ ”رینا! میری بہن مجھے معاف کر دینا..... میں ایسا نہیں کر سکا۔ ایسا کرنا میرے اختیار میں ہی نہیں تھا مگر جو میرے اختیار میں ہے وہ میں کروں گا..... تیری موت کے زندہ رہ..... ہر جنگی کو اذیت ناک موت سے دوچار کروں گا..... مجھ سے روٹھ کر رخصت ہو جانے والی بہن یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تم یہ مت سمجھنا تمہارے غم میں گھلنے والا اب دنیا میں کوئی نہیں..... نہیں..... میری بہن تمہارا بھائی ہے جو تمہیں کبھی بھلا نہ پائے گا..... تمہاری محبت، تمہاری لڑائیں مجھے بھولی نہیں ہیں۔ دھندلی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب رینا نے گھوڑے کی لگام تھام کر کہا تھا۔

”علی نواز! میرے بھائی اپنا خیال رکھنا.....“ وہ چند الفاظ ہی تو تھے مگر ان الفاظ میں ایک قدرتی رشتے کی ڈور پنہاں تھی۔ ایک ڈری بہن کی اپنے بھائی کی سلامتی کی پریشانی پوشیدہ تھی اور پھر اظہار مجھے خون کے آنسو رلانے لگا جب رینا نے لوبان سگلا کر میری نظر اتار دی تھی اور کہا تھا کہ علی نواز! اب تم محفوظ ہو۔“

وہ عجیب لڑکی تھی..... اس نے بے شمار پیش گوئیاں کی تھیں اور سچ ثابت ہوئی تھیں۔ مگر اُس

سردار رواؤ نے ایک طرف اشارہ کیا تو دس کے قریب جنگی کیل و کانٹے سے لیس پہاڑی چٹان سے اچھلتے کودتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ میں نے رینا نے کئے پھٹے وجود کو الوداعی بوسہ دیا۔ جھک کر دونوں تلواریں اٹھائیں اور کسی تندہ گولے کی طرح دشمن سے بھڑ گیا۔ میرے دونوں بازو دیوانہ وار چل رہے تھے تلواروں سے تلواریں ٹکرا رہی تھیں۔ موت کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ میری تلوار کے پہلے ہی وار نے دو جنگیوں کو زمین چٹادی۔ میں نے اپنی پشت پتھریلی چٹان کی طرف کر لی تھی اس طرح میری پیٹھ محفوظ ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں جو آگ جل رہی تھی وہ لوہے کو پگھلانے کی طاقت رکھتی تھی۔ میں دو اور جنگیوں کو زخم لگاتا ہوا پچھلے قدموں اوپر چڑھنے لگا۔ میں جونہی حملہ آوروں سے دو قدم بلندی پر ہوا میرے ہاتھ اور زیادہ آسانی سے چلنے لگے۔ میں کسی حملہ آور کو اوپر چڑھنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ مجھ تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے مگر ناکام ہو رہے تھے۔ اُس دوران میری تلواروں نے تین کے قریب جنگیوں کو سنگین زخم لگا دیے۔ اچانک میری نگاہ پیچھے کو اٹھی تو وہاں دو درجن کے قریب جنگی بھاگے چلے آ رہے تھے۔ میری نگاہ سامنے والے جنگیوں سے ایک لمحے کے لئے ہٹی تھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو جنگی اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں پیچھے ہٹا اور میں نے وہی طرف دوڑ لگا دی۔ اس دوران کوئی اتنی چیز میری ٹانگ کے ساتھ ٹکرائی کھٹاک کی آواز آئی اور میں ہوا میں تلا بازی کھاتا ہوا اوپر سے نیچے آ رہا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کی کوشش کرتا درجنوں تلوار کی نوکیں میرے وجود سے آگئیں۔ جنگیوں کے بے رحم پاؤں میرے بازوؤں پر آئے اور دونوں تلواریں میرے ہاتھوں سے چھین لی گئیں۔ وہ بہت سے ہاتھ اور پاؤں تھے جو مجھے پیٹ رہے تھے۔ میرے سر پاؤں ٹانگوں اور سینے پر ہتھوڑے کی طرح ضربیں پڑ رہی تھیں۔ جنگی چلا رہے تھے اور بڑا رہے تھے۔ آخری آواز جو میری سماعت سے ٹکرائی وہ سردار رواؤ کی تھی وہ چیختے ہوئے بوگالے یا شاہد کسی اور سے کہہ رہا تھا۔

”اسے جان سے نہیں مارنا..... اسے زندہ رکھنا ہے۔ بوکاشی دیوتا کے حکم کا انتظار کرنا ہے۔ یہ مر گیا تو بوکاشی دیوتا کو ہم کیا جواب دیں گے۔ پیچھے ہٹ جاؤ..... پیچھے ہٹو..... کہیں یہ مرنے جائے۔“ اُس کی ہدایات کے باوجود مارنے والے ہاتھ مجھے پیٹے جا رہے تھے۔ اُن کی ضربوں میں اور زیادہ شدت آگئی تھی۔ مجھے سینے والوں کے انداز سے صاف اندازہ ہو رہا تھا وہ اپنا بے پناہ غصہ مجھ پر نکال رہے ہیں۔ مجھے مارنا مقصود ہوتا تو وہ تلوار کے واروں سے کب کا میرا کام تمام کر چکے ہوتے۔ آخر ایک بھاری اتنی چیز میرے سر سے ٹکرائی اور خون کے فوارے اُبل پڑے۔ میرا پورا چہرہ خون سے تر

ہاں! وہ سیمیں بدن رابجہ تھی..... وہ خواب نہیں تھا..... افسانہ نہیں تھا وہ حقیقت تھی..... جیتی جاگتی حقیقت میری رابجہ..... جیتے جاگتے وجود کے ساتھ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے اور وہ میرے چہرے پر جم جانے والے لہو کو آہستہ آہستہ اپنے نرم و ملائم ہاتھ سے صاف کر رہی تھی۔

ہاں..... یہ سب خواب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اپنا شبہ رفع کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُسی اس کے نرم و نازک گال پے رکھی تھی اور وہ آنسوؤں سے تر گال پر پھسلتی چلی گئی تھی۔ وہ زندگی کی دھارت سے جیتا جاگتا وجود تھا۔

میرے دل میں برسوں کی تڑپ تھی میری نگاہوں میں قرونوں کی پیاس تھی۔ یہ وہ چہرہ تھا جیسے میں نے دنیا میں سب سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اس چہرے کی دید تڑپ مجھے ان ویرانوں میں بھٹکا رہی تھی۔ یہ وہ چہرہ تھا جسے دیکھے مجھے ڈیڑھ مہینہ گذر چکا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے کئی برسوں کا فراق میرے دل پر نقش ہو گیا تھا۔

ایک زوردار سہکاری میرے منہ سے نکلی تھی یا وہ میرے دل میں قید رہنے والی برسوں کی آس تھی جو جیج کی صورت میرے منہ سے نکلی تھی۔ میں تڑپ کر مڑا تھا اور میں نے اپنا سر رابجہ کے زانو پر رکھ دیا تھا۔ میرے آنسوؤں میں تند پہاڑی نالوں کی سی شورش تھی۔ میں رابجہ..... رابجہ پکارتا جا رہا تھا اور روتا چلا جا رہا تھا۔ وہ لمحے جیسے میری آنکھوں میں مجسم ہو گئے تھے۔ وہ سہانا وقت جیسے میری آنکھوں سے ثبت ہو گیا تھا۔ رابجہ کا لرزتا ہوا ہاتھ میرے سر پے آیا اور اسے سہلانے لگا۔ آنسوؤں کی ریلوں میں اور طغیانی آگئی۔ میں ایسا رویا جیسا کبھی نہ رویا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ کہ یہ لمحے منجمد ہو جائیں۔ کائنات کی گردش تھم جائے۔ وقت کی رفتار رک جائے۔ میں رابجہ کے زانو پے سر رکھ کر سب کچھ بھول جاؤں۔ صدیاں بیت جائیں۔ زمانے گزر جائیں مگر یہ وصال کی گھڑیاں کبھی ختم نہ ہوں۔ یہ سیلن زدہ قید خانہ مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ لگنے لگا تھا۔ اس جگہ کی شان بڑھانے والی میرے سامنے بیٹھی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا وہ یہاں کیسے پہنچی تھی؟ اور مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو بس اُس کے قرب سے نہال ہوا جاتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے چہرے پے جم جانے والے لہو کا صاف کرنے لگی۔

وہ خاموش تھی اس کی آنکھوں میں سرخ زورے تیر رہے تھے۔ میں یک تک اسے دیکھے جا رہا

نے یہ بھی کہا تھا ”علی نواز! میری پیشین گوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی اور میں کہتی ہوں کہ ہمیں یہاں سے چھٹکارہ مل جائے گا..... ہم آزاد ہو جائیں گے۔ یہ اس کی غلط پیشین گوئی تھی یا سب کچھ جائزہ بوجھتے وہ مجھے دلا سہ دیتی رہتی تھی۔ ہاں شاید ایسا ہی تھا۔ انجانے میں، میں اسے دلا سہ دیتا رہا تھا اور مجھے۔ وہ جیت گئی تھی اور میں ہار گیا تھا۔

میرے وہ کرناک دن شاید چار تھے یا پانچ، میں آدھا سو یا آدھا جاگا رہتا۔ وہ ایک سیلن زدہ ساتھ خانہ تھا۔ یہ تہہ خانہ شاید میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ شاید ساسا یہاں قید تھی۔ میں غنودگی کے عالم میں رینارینا پکارا کرتا تھا۔ سوتے اور جاگتے میں رینا کی باتیں ہی ذہن پے یلغار کئے رہتی تھیں۔ اس کے کہے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ وہ شاید چھٹے دن کی بات تھی۔ میرا سارا بدن زخموں سے چور تھا۔ چہرے پر گرنے والا لہو جم کر سوکھ گیا تھا جس کی وجہ سے چہرے کی جلد اکڑ کر خن ہو گئی تھی اور یہ سختی مجھے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ یہاں کوئی دوست نہیں تھا، سب دشمن ہی دشمن تھے۔ دشمن جو مرہم نہیں رکھتے بلکہ زخم لگاتے ہیں۔

اُس دن میں بہت دل گرفتہ تھا۔ تمام گھروالوں کی شکلیں بار بار نظروں کے سامنے سے گزریں تھیں چھوٹے بچے تھے ہاتھوں کے چہرے کھلکھلاتے نظر آ رہے تھے اور دل میں ایک عجیب کی بات چینی بھر رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھولی تھیں اور پھر بیچ لی تھیں۔ میرے دونوں پاؤں ابھی کڑوں میں قید تھے۔ اوپر دروازہ کھلا تھا اور کوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے معلوم تھا پہریدار میرے لئے کھانا رکھنے آیا ہے۔ یہ کھانا اور یہ زندگی تب تک برقرار تھی جب تک پربت کے پار سے بوکاشی دیوتا کا حکم نہیں پہنچ جاتا تھا۔

پہرے دار شاید کھانا رکھ کر کب کا جاچکا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے ہی پڑا رہا۔ پھر اسی حالت میں..... مجھے نیند آگئی..... میری دوبارہ آنکھ اس طرح کھلی کہ کوئی نرم، ملائم سا جانور میرے چہرے پے حرکت کر رہا تھا۔ میں تیزی سے اپنا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف لے کر گیا۔ میرے ہاتھ نے کئی دوسرے ہاتھ کالس محسوس کیا اور کوئی برق سی جیسے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ میں نے چہرہ گھما کر دیکھا دل جیسے ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا۔ روشنی کے کروڑوں اربوں ققمے جیسے میری نگاہوں میں جگمگا اٹھے۔ میرا دل، میرا وجود زمیں، آسمان اور شاید پورا جہاں جیسے روشنی میں نہا گیا۔ میرا دل انا انداز میں پہلے کبھی نہ دھڑکا تھا۔ میری آنکھوں نے ایسا سہانا اور دل ربا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ایک کھیل، کھیل رہا ہے..... وہ..... اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے تمہیں استعمال کر رہا ہے۔ بس..... وہ اچھا انسان نہیں ہے۔“

”کیسا کھیل..... علی نواز.....؟“ رابعہ زہریلی مسکراہٹ سے بولی تو میں اس کے لہجے سے حیران رہ گیا۔

”رابعہ! تم میری بات کو جھوٹ سمجھ رہی ہو.....؟“ میں بولا۔

”علی نواز! بولو تم شاہنواز کے بارے میں اور کیا، کیا جانتے ہو..... یہی کہ وہ مجھ سے جھوٹی بات کرتا ہے۔ خزانہ پانے کے لیے مجھے جم کٹی کے ہاتھ بیچنا چاہتا ہے۔ علی نواز یہ باتیں میں دو سال سے سن کر تنگ آ چکی ہوں۔ کوئی اور نئی بات کرو..... اپنے بارے میں بتاؤ.....“

”اپنے بارے میں کیا بتاؤں! رابعہ..... میری زندگی تو ڈوبتی ناؤ ہے کسی وقت بھی ڈوب سکتی ہے.....“ میں اپنے بے تحاشانہ کو چھپاتے ہوئے بولا۔

”اور..... اوروں کو ڈوب بھی سکتی ہے.....“ رابعہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

”رابعہ! تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ کھل کر بتاؤ یوں پہیلیاں مت بھجھاؤ..... پہلے ہی دل کے پھول پھوٹ پھوٹ کر تھک چکا ہوں۔“ میں ہنسنے لہجے میں بولا۔

”علی نواز خان! میں تمہیں اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتی تھی۔“ رابعہ نے نمناک آنکھوں سے لہنا شروع کیا..... ”مگر تم نے وہ قدم اٹھایا جس کا میں تمہارے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”رابعہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... کیا، کیا ہے میں نے.....؟“ میں حیران لہجے میں بولا۔

”علی نواز! میں بچپن سے لے کر آج تک تم کو اپنا ہمدرد سمجھتی آئی ہوں، تمہی شاہنواز سے میرا لہا لیا کرتے تھے۔ میری گڑیا اس سے جھین کے مجھے واپس لا کر دیا کرتے تھے..... میں تمہیں کیا سمجھتی لی..... اور تم کیا نکلے.....؟“

”رابعہ! درد سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا.....“

”نہیں علی نواز! تمہارے جیسوں کا کلیجہ نہیں پھٹتا..... مجھے تم سے گھن آرہی ہے۔“

”رابعہ! الزام لگانے سے پہلے جرم بھی بتا دو۔“ میں چیخا۔

”علی نواز! رینا نے تمہارے کتنے ترلے ڈالے تھے، کتنے واسطے دیئے تھے..... مگر..... مگر تم نے اس کی ایک نہ سنی..... جب اس سے دل بھر گیا تو تم نے اسے بے دردی سے قتل کر دیا..... شک تو مجھے تم پے پہلے سے ہی تھا، میں نے کئی دفعہ پڑاؤ کے آس پاس تمہیں اکیلے رینا کے

تھا۔ دل میں بہت زبردست آہل پتھل ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اچانک اپنے تمام بھول گیا ہوں۔ میں کتنی ہی دیر رابعہ کے قرب کے سحر میں گرفتار رہا پھر رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگا۔

پھر مجھے انکل مدثر سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی اور وہ تمام باتیں آپوں آپ ہی ذہن میں گردش کرنے لگیں جو انہوں نے مجھ سے کی تھیں۔ میں ایک دم اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کوشش میں پیروں میں پڑے ہوئے کڑے جھنجھناٹھے۔ اس کے ساتھ ہی درد کی طویل لہر پاؤں سے سر تک دو گئی۔ میرا ذیت ناک چہرہ دیکھ کر رابعہ کے حسین چہرے پے درد کی پرچھائیں لہرا گئی۔ اس نے آگے بڑھ کے میرا ہاتھ تھام لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ سپاٹ نظر آنے لگا جیسے وہ اپنے درد کو چھپا چاہتی تھی۔

”رابعہ! انکل کہاں ہیں؟“ میں خاموشی توڑتے ہوئے بولا۔

”ادھر..... اسی محل میں ہیں.....“ رابعہ نے مختصر جواب دیا اور اٹھ پڑی جیسے وہ میرے پیدا ہونے سے پریشان ہو گئی تھی اور یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نے اس سے پہلے بھی بار بار کوشش کی تھی کہ اٹھ جائے مگر میں نے اس کے زانو سے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اب جبکہ وہ بس سے آزاد تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور میز پیروں کی طرف قدم بڑھانے لگی تھی۔ میرے سینے سے ایک کر بناک سانس خارج ہوئی اور میں ہولے سے بولا۔ ”رابعہ! یوں تو نہ جاؤ.....“

میرے الفاظ نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف دکا رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پس منظر میں آنسوؤں کا کتنا پانی جمع ہے مگر پھر بھی کمال مہارت سے آنسو ضبط کیے ہوئے تھی۔

”رابعہ! شاہنواز کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ وہ بھی ہمیں ہمارے ساتھ ہے.....“ رابعہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔

”پھر تو یقیناً جم کیٹی بھی یہیں موجود ہوگا.....؟“ میں بولا۔

رابعہ نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”ہاں! مگر تم ایسے کیوں پوچھ رہے ہو.....“

”رابعہ! جم کیٹی اچھا آدمی نہیں ہے..... اور..... اور.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کیا..... تم چپ کیوں ہو گئے.....؟“ رابعہ مضحکہ خیز لہجے میں بولی۔

”رابعہ! شاید تمہیں یہ سن کر دکھ ہو کہ شاہنواز اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ..... وہ تمہارے ساتھ

والی ٹکائی میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگی۔ میں نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے روکنا چاہا۔  
میں نے کچھ بولنا چاہا مگر حلق کے اندر آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔ میں نے سر جھکایا کہنیاں زمین پر  
ٹکیں اور دھاڑیں مارتا چلا گیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک بہت سہانا خواب دیکھا تھا مگر سہانا  
خواب اچانک ڈراؤنا اور نہایت اذیت ناک بن گیا تھا۔ خواب کتنا ہی ڈراؤنا اور کرناک ہو بیدار ہو  
جانے پر انسان پر خوشی اور مسرت چھا جاتی ہے کہ شکر ہے یہ سب خواب ہی تھا۔۔۔۔۔ مگر جو اذیت ناک  
منظر میں نے ابھی دیکھا تھا وہ خواب ہرگز نہیں تھا۔ میرا دل چاہا کاش جب میں جنگلیوں کے ہاتھوں  
بڑا گیا تھا اور جب ایک جنگلی نے تلوار میرے سینے میں اتارنا چاہی تھی تو اس وقت سردار روبان نے  
اسے نہ روکا ہوتا۔ اس نے تلوار میرے سینے میں اتر جانے دی ہوتی۔ ایسا منظر تو دیکھنے کو نہ ملتا۔

میں نے پتھریلی زمین پر لیٹ کر سر نیچے ٹکایا تو پورے جسم میں اذیت کی لہریں پھیل گئیں۔ اس  
لحے میں مجھے بہت شدت سے یاد آئی۔ ماں کی گود میں سر رکھنے سے میں بہل جایا کرتا تھا آج پتھریلی  
زمین پر زخموں سے چور سر رکھنا پڑ رہا تھا۔ تین چار گھنٹے میں نے روتے اور سوچتے ہوئے گزار دیئے۔

میرے من میں غم کا ایک کوہ گراں ٹوٹا تھا اور رگوں میں جیسے لاوا بہنے لگا تھا۔ بوگا لے، سردار  
رواؤ اور دیوتا بوکاشی کے نام میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ میرے دماغ میں انگارے ہی  
انگارے بھر گئے۔ میرے ساتھ ایک عجیب اتفاق ہوا تھا۔ میں آنکھیں موند نہیں سکتا تھا۔ جونہی آنکھیں  
بند کرتا تھا وہی کرناک منظر ذہن میں دوڑنے لگتا تھا۔ تلوار کی وہ چمک، ہنستی مسکراتی ہاتھ ہلاتی رینا کی  
آخری جھلک۔۔۔۔۔ وہ گڑیا سی میری بہن کا سرتن سے جدا ہونا۔ یہ ایک ایسا وحشت ناک منظر تھا جس  
نے میری سوچوں کا محور تک بدل کے رکھ دیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کچھ عرصے میں یہ منظر میرے ذہن میں  
اند پڑ جائے گا مگر سب اندازے غلط ثابت ہوئے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ایک ناقابل  
تغین کیفیت کا شکار ہوتا چلا گیا۔ رینا کی موت کا غم ہلکا ہونے کی بجائے دن بدن بڑھتا ہوا ایک ناسور  
کی شکل اختیار کر گیا۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے میں رینا کی موت کا بدلہ نہ لوں گا تو میرا دم گھٹ جائے  
گا۔۔۔۔۔ دھڑکنوں کی روانی رک جائے گی۔

یہ میری اسیری کا چھٹا یا ساتواں دن تھا۔ میں سویا پڑا تھا کہ ایک چھپا کے سے میری آنکھ کھل  
گئی۔ میں نے نظریں سیڑ کے دیکھا تو میرے بالکل سامنے بوگا لے کھڑا تھا۔ یکا یک پتہ نہیں مجھے کیا  
لامیں نے تیزی سے بوگا لے پر جھپٹنا چاہا مگر میں جھول کے رہ گیا۔ میرے ہاتھ آہنی کڑوں میں جکڑ

ساتھ دیکھا تھا مگر۔۔۔۔۔ مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم اس سے برابر تاؤ کرتے کرتے ایک دن  
آخر کار اس کی جان لے لو گے۔۔۔۔۔“

میرا ذہن چکر کے رہ گیا۔ مجھے یاد آنے لگا رابعہ واقعی مجھے اور رینا کو ایک دو دفعہ تنہائی میں  
دیکھ چکی تھی۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ مگر وہ اس بات کا اتنا اٹنا اور سنگین مطلب لے لے گی میں نے کبھی تصور میں مح  
نہیں سوچا تھا۔

”رابعہ! تمہیں بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ رینا۔۔۔۔۔ رینا تو میرے لئے۔۔۔۔۔“  
”بس علی نواز بس کرو۔۔۔۔۔ اور جھوٹ بول کر اپنی عاقبت اور مت خراب کرو۔ تم مجھے جھٹلا  
گے۔ جم کیٹی، ابو اور شاہنواز کو جھٹلاؤ گے۔ مگر تم سردار رواؤ، بوگا لے اور ساسا کو کیسے جھٹلاؤ گے۔  
بولو جواب دو۔۔۔۔۔ ساسا۔۔۔۔۔ بھی تو تمہاری منظور نظر ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی تو تمہاری راتیں مہکاتی ہے۔۔۔۔۔ وہ  
جھوٹ نہیں بولے گی ناں۔۔۔۔۔ اس نے بھی گواہی دی ہے کہ رینا کو تم نے سرعام قتل کیا ہے۔ بوکا  
دیوتا کے دیئے ہوئے اختیار کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تم نے کلیوں کی زندگی مسل دی۔ وہ بھرا  
بھالی سی لڑکی جو یتیم تھی جس کا نہ باپ رہا تھا نہ ماں۔ علی نواز! اس پر تو کوئی رونے والا بھی نہیں تھا۔  
تم نے ایسا ظلم کیوں کیا۔۔۔۔۔ کیوں؟“

میں خاموش تھا بالکل خاموش۔ اس سمندر کی طرح جس کی تہ میں سیٹھروں خوفناک طوفا  
پلتے ہیں۔ میرا سر جھکا ہوا تھا اور آنسو قطار اندر قطار میرے حلق میں گر رہے تھے۔ میں خاموش تھا  
میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔

رابعہ اتنی معلومات کیسے رکھتی تھی۔۔۔۔۔ وہ اتنا کچھ کیسے جانتی تھی۔۔۔۔۔ سردار رواؤ، بوگا لے،  
ساسا کے بارے میں کیسے جانتی تھی۔۔۔۔۔؟ اس نے بوکاشی دیوتا کا نام بھی لیا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا  
وہ جم کیٹی کی یہاں موجودگی کی طرف اشارہ کر رہی تھی؟ بار بار میرا دھیان اس مستطیل کمرے کی طرز  
جار ہا تھا جسے روبان کے نائب نے ”بھیرا“ کہا تھا اور اس مٹی کے ترشے ہوئے چہرے کی طرف جا  
تھا جس پر میری نظر ٹھہر گئی تھی۔

”رابعہ! میں رینا کا قاتل نہیں۔۔۔۔۔ میں نہ ناک جھکی نگاہوں سے بولا۔  
رابعہ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اس کی جھیل کی سی خوبصورت آنکھوں  
شفاف آنسو تیر رہے تھے۔ وہ ٹوٹے لہجے میں بولی۔ ”علی نواز! کاش ایسا ہوتا۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔“  
اس نے کہا اور میز ہیوں کی طرف بڑھی اور میز ہیاں چڑھتی چلی گئی۔ اس کی ایڑیوں سے اٹنے

دینے گئے تھے۔ بوگالے نے اپنے ساتھ کھڑے تلوار بردار کو حکم دیا تو اس نے آگے بڑھ کے لکڑی کے ایک ڈنڈے کو نیچے کر دیا۔ ڈنڈا نیچے کرنے سے میں ایک جھٹکے سے اوپر کواٹھ گیا۔ اپنی کڑوں میں جکڑے ہوئے میرے ہاتھ سیدھے اوپر اٹھ گئے۔ میں اب اپنی کڑوں کے ذریعے یوں سیدھا کھڑا ہوا کہ میرے اپنی کڑوں میں جکڑے پاؤں زمین سے ڈیڑھ فٹ اوپر تھے۔ اپنی کڑے میرے کلائیوں میں دھنسنے جا رہے تھے۔ بوگالے نہایت آرام سے آگے بڑھا اور اس نے جہاں اذیت رسانی کے تمام خونی اوزار پڑے تھے وہاں سے ایک بھاری ہتھوڑا اٹھا لیا۔ بوگالے کے کہنے پر تلوار بردار نے ایک مونٹا چوبی لکڑا میرے پاؤں تلے دھر دیا جو نبی میرے پاؤں اس چوبی لکڑے پر پڑے میری کلائیوں کو ایک دم سے قرار آ گیا۔ میں ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ گیا۔

میں ابھی اپنے حواس بحال کر رہا تھا کہ بوگالے میرے سر پر آن سوار ہوا۔ میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بوگالے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ذوزنی ہتھوڑا زور سے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر دے مارا پھر اس نے ہتھوڑا پرے رکھ کر پلاس نما اپنی اوزار اٹھا لیا۔ اس نے مضروب انگوٹھے کا ناخن اس اوزار سے کھینچ کر نکال دیا۔ ایک جان لیوا درد رگ و پے میں دوڑ گیا مگر میں نے منہ سے آواز نکلنے نہیں دی۔ بوگالے کے کہنے پر تلوار بردار نے میرے پیروں کے نیچے سے چوبی نکال نکال دیا۔ میں ایک بار پھر فضا میں معلق ہو گیا۔ اب تکلیف کی شدت دو گنی ہو گئی تھی۔ ایک طرف کلائی پر چبھنے والے اپنی کڑے تھے تو دوسری طرف پاؤں سے رسنے والے خون کی ناقابل بیان تکلیف تھی۔ پاؤں کے ساتھ ساتھ میری پوری ٹانگ کپکپا رہی تھی مگر..... میں نے بوگالے کے سامنے کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھائی تھی۔ میری گردن اب بھی فتح مندوں کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو بوگالے کو تاؤ دلانے کیلئے کافی تھی اور آنکھوں کی یہ سرخی یہ چمک مصنوعی نہیں تھی۔ یہ سرخی یہ چمک میرے دل کی ترجمان تھی۔

میں بالکل خاموش تھا اور آنکھوں کی یہ سرخی بہ زبان خاموش کہہ رہی تھی..... ”بوگالے! جس دن ان ہاتھوں کی زنجیریں ٹوٹیں وہ دن تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

میرے پیروں سے لہو بہے جا رہا تھا اور بوگالے اوزاروں میں سے کچھ اور ڈھونڈ رہا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے وہ گونگا ہے۔ بولتا ہے تو صرف اذیت کی زبان بولتا ہے۔ سنتا ہے تو صرف درد بھرے چیخوں کے ”نغنے“ سنتا ہے۔

اب کے بوگالے پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چمٹی تھی۔ وہ میرے پاؤں کے قریب

پہنچ گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا وہ میرے ساتھ کیا کرنے لگا ہے جس انگوٹھے کا ناخن اتر چکا تھا وہاں سے خون قطروں کی صورت نیچے گر رہا تھا۔ بوگالے چمٹی کے ذریعے ناخن اترے زخم کو نوچنے لگا۔ وہ چوبی چمٹی میں میرا خون آلود ماس بھرتا درد کی ایک بے رحم لہرائی اور میرا پورا جسم اکڑ جاتا۔ وہ بار بار چمٹی میں ماس بھرتا اور پھر چمٹی پیچھے لے جاتا۔ یہ تکلیف وہ عمل تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہا، ضبط کر کے جب تکلیف برداشت سے باہر ہو گئی تو میرے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی..... بوگالے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میرا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ بوگالے چمٹی پرے رکھتے ہوئے بولا۔ ”جوان! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ابھی تو آغاز ہے۔ ابھی تو دن چڑھا ہے، رات ہونے میں ابھی بہت وقت باقی ہے، ہمت سے کام لو..... تم تو بہت بہادر..... جوان ہو..... تم نے اس جنگی دھرتی کے درجوں سپوتوں کو مارا ہے اور..... ہتھوڑے دن پہلے برب دیوتا کے جلا کو بھی تم قتل کر چکے ہو..... ایسا کارنامہ کوئی کمزور آدمی تو سرانجام نہیں دے سکتا نا..... شاباش ذرا حوصلے سے کام لو.....“

بوگالے یہ کہتا ہوا وہاں سے اٹھا اور اوزاروں میں سے ایک اور چیز اٹھا لیا۔ یہ ایک چمٹا چمٹا نما اوزار تھا۔ لکڑی کے ڈنڈے کو اب اوپر کر دیا گیا تھا۔ میں بے سدھ سا پتھریلی زمین پر لیٹا تھا۔ بوگالے نے چمٹا نما اوزار میں میرے سر کے کچھ بال لیے اور ایک جھٹکا دے کر انہیں کھینچ لیا۔ میرے وہ بال جڑوں سے اکھڑ کر اس چمٹے میں آ گئے۔ یوں لگا جیسے سر کے اس مخصوص حصے میں کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو۔ میں ہوش اور بے ہوشی کی حالت میں لٹک کر رہ گیا۔ میری آنکھیں کبھی کھل رہی تھیں، کبھی بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جو آخری منظر دیکھا اور آخری الفاظ سنے وہ بوگالے کے ہی تھے۔ وہ کسی اپنی دھات سے میری بازو کے پاس سے کٹ لگا کے لہو نکال رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”جوان! تمہارا یہ لہو لینا بہت ضروری ہے۔“ اس نے لہو شیشے کی ایک بوتل میں بھرا اور میرے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ”آج کیلئے اتنا کافی ہے۔ باقی کا کام کل کریں گے۔“

وہ جانے کے لیے اٹھا اور پھر مڑ کے بولا۔ ”ویسے ایک بات ہے..... تم ہو بہت سخت جان..... پہلی دفعہ مجھے مزا آ رہا ہے..... ورنہ یہاں آنے والے تو ہر وقت ہلچل مچھتے چلاتے ہی رہتے ہیں۔“ اس نے کہا اور سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ میری آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا وہ شیشے کی بوتل تھی جس میں میرا لہو تھا اور بوگالے سیڑھیاں چڑھتا ہوا میرا وہ لہو نوش کر رہا تھا..... ہاں وہ میرا خون پی رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو دور سے بادلوں کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی وہ دن کا وقت تھا

دستی علی نواز خان بیدار ہوا چاہتا تھا۔ ایسا علی نواز جو ڈاکوؤں اور خطرناک قاتلوں کے پیچھے بھاگا تھا جس نے ظالم سفاک انسانوں کی گردنوں میں طوق ڈالے تھے۔

”کیا ہے تو..... بوگا لے؟“ میں نے بوگا لے کے سوال پے اچانک سر اٹھا کر پوچھا تو وہ جرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”خوب..... بہت خوب..... ابھی دم خم باقی ہے تمہارے اندر.....“ وہ میرے قریب ہو کر بولا۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا جب میری زوردار خونی نگر اس کے چہرے پے پڑی اور وہ الٹ کر گرا۔ نگر اتنی شدید اور فوری تھی کہ بوگا لے اپنا دفاع نہ کر سکا۔ اس کا ایک ہونٹ پھٹ گیا تھا، ناک پے بھی فوری نزل ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ کسی وحشی درندے کی طرح واپس پلٹا، میں اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔ اس نے اپنا اعصاب میرے سر پے دے مارا۔ میں نے اس کا دار ہاتھوں میں پھنی ہوئی زنجیر پے روکا اور ہاتھوں کو اس انداز میں حرکت دی کہ اعصاب ان زنجیروں میں جکڑا گیا۔ میں نے ایک مخصوص جھٹکا دیا اور اعصاب بوگا لے کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

وحشت نے بوگا لے کے نقوش بگاڑ دیئے تھے۔ وہ زخمی منہ سمیت ہڈیانی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے مجھے پلٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ پیرے داروں کو آوازیں دینے لگا۔ چند ہی لمحوں میں وہاں ایک درجن کے قریب کارندے آن کھڑے ہوئے۔ وہ سب مسلح تھے اور ہجبان سے ان کے چہرے متمار ہے تھے۔ وہ اپنے سردار کے ایک اشارے کے منتظر تھے۔ بوگا لے مجھے پیٹنا پیٹنا اچانک پیچھے ہٹا اور اس نے اپنا آہنی اعصاب تھام لیا۔ اعصاب کو فضاء میں بلند کر کے اس نے میرے پیر کے انگوٹھے میں کھبو دیا۔ ایک بے رحم ٹیس سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔

”تو نے مجھے زخم لگایا“ تو نے میرا ہونکا۔ میں تجھے نرک میں جھونک دوں گا..... آج..... آج دیوتا بھی تجھے میرے عتاب سے نہیں بچا سکیں گے۔“ اس نے کھینچ کر اپنا اعصاب میرے انگوٹھے سے اکھاڑا اور مجھے لٹکانے والی زنجیریں کھلوادیں۔ اب بس میرے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں تھیں۔ بوگا لے نے آگے بڑھ کر مجھے کندھے پے ڈال لیا۔ ایک ناقابل برداشت بومیرے تھنوں میں گھس گئی۔ میرا منہ اس کی کمر کو چھو رہا تھا اور بوگا لے سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ ایک درجن تلواروں کی لکیریں میرے جسم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

بوگا لے کے جسم سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے خونخوار بھیڑیے کے جسم سے آتی ہے۔ تہہ خانے سے نکل کر بوگا لے مختلف گلیوں اور راہدار یوں میں چلنے لگا۔ زنجیروں کی جھنکار اور بوگا لے کے اعصاب

یارات کا میں اس اندھیرے تہہ خانے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بس بادلوں کی گھن گرج سے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر موسم ٹھیک نہیں ہے۔ ردہ کے بادل گرج رہے تھے اور بجلی کے کڑاکے سنائی دے رہے تھے۔

میں نے سیدھا ہو کر بیٹھنا چاہا تو ایک ٹیس سی بائیں ٹانگ میں جاگ اٹھی۔ میرا دھیان فوراً پاؤں کی طرف چلا گیا جہاں انگوٹھے سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا مجھے سخت بھوک لگی ہوئی ہے شاید ایسا نقابہت کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہاتھ کھانے کی طرف بڑھا دیا۔ میں جلدی جلدی ایک لقمہ بنا کر ابھی منہ میں ہی رکھنے والا تھا کہ ایک ہاتھ زور سے میرے بازو پے لگا اور لقمہ دور جا گرا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا تو اندھیرے میں وہاں بوگا لے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرا کھانا پرے رکھا اور خود میرے قریب ہو گیا۔ اس کا آہنی اعصاب اس کے پاس ہی زمین پے دھرا تھا۔ اس نے اعصاب اٹھایا اور اس کی نوک میرے انگوٹھے کے زخم پر چبھونے لگا۔ پھر نہایت دھیرے اور سفاک لہجے میں بولا۔ ”تمہارا یہ زخم تو ٹھیک ہوتا جا رہا ہے.....“ وہ اعصاب کی نوک سے اسے کرید رہا تھا۔

نا قابل برداشت درد سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ منظر میری آنکھوں میں چلنے لگا جب بوگا لے نے اسی اعصاب سے رینا کے نرم و نازک پاؤں پر پہلا وار کیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں جھپٹ کر یہ اعصاب اس کے ہاتھ سے چھین لوں اور اس کے جسم پر اسے چھید کر دوں۔ جتنے کوئی گن بھی نہ سکے مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا، میرے ہاتھ اور پاؤں پابند سلاسل تھے۔

بوگا لے میرے چہرے کی کشمکش پڑھتے ہوئے بولا۔ ”بھوک لگی ہے یا مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو.....“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

وہ بولتا تھا تو اس کے لہجے سے سفاکی ٹپکتی تھی۔

”بھوک..... لگی ہے۔“ میں بمشکل بولا۔

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے یہ لو..... کھاؤ کھانا.....“ بوگا لے نے کھانا میرے سامنے کر دیا۔ میں نے بمشکل ہاتھ آگے بڑھا کر کھانا لینا چاہا تو بوگا لے نے وہ میرے منہ پے دے مارا اور پھنکار تے لہجے میں بولا۔ ”میں تیری زندگی اتنی مشکل بنا دوں گا کہ تو موت کی تمنا کرے گا مگر موت تجھے ملے گی نہیں..... تو نے کسی اور پر نہیں مجھ پر ہتھیار اٹھایا ہے اور تو نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں؟“

میں سر جھکائے بوگا لے کی تمام باتیں سنے جا رہا تھا۔ میرے وجود میں بڑی سخت توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ تیز آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے اور گزرے زمانوں کی گرداڑ رہی تھی۔ میرے اندر کا خونخوار

کی ٹک ٹک نے منٹوں میں وہاں جھمگھٹا لگا دیا تھا۔ ہر طرف چہرے ہی چہرے نظر آ رہے تھے۔ کچھ چہرے ان میں سے خوفزدہ تھے، کچھ خوشی سے کھلکھلا رہے تھے۔

کئی راہداریاں عبور کر کے بوگالے ان زندانوں کے سامنے پہنچ گیا جہاں قیدیوں کے ساتھ ناقابل برداشت بے رحمی والا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان زندانوں میں تڑپتے پھلتے قیدیوں کی سزائیں میں دیکھ چکا تھا۔

بادل گرج رہے تھے بارش برس رہی تھی اور وقفے وقفے سے بجلی تڑپتی تھی اور پتھر ملی راہداریوں کے در و دیوار دودھیا روشنی سے نہا جاتے تھے۔

ایک زندان کا دروازہ کھلا وہاں ایک قیدی کو سزا دی جا رہی تھی۔ بوگالے نے اپنا اعصاب سیدھا قیدی کے سینے سے آ رہا کر دیا۔ سزا دینے والا جلد جب بوگالے کے سامنے ہوا تو بوگالے نے اسے دونوں ہاتھوں میں دیوبج کر انتہائی بے رحمی سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ مر جانے والے قیدی اور بے ہوش ہو جانے والے جلا دو کو پہرے دار گھسیٹ کر زندان سے باہر لے گئے۔

مجھے قیدی والی جگہ پر بٹھا کر رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ درجن کے قریب پہرے دار ابھی تک تلواریں سونے میرے گرو کھڑے تھے۔ بوگالے کے اشارے سے ایک کارندہ مٹی کا بڑا برتن اٹھا کر میرے سامنے لے آیا۔ میں نے دیکھا میرے آس پاس کھڑے کارندوں کے چہرے بے خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں تھیں۔

وہ مٹی کا بڑا برتن میرے پیروں کے قریب رکھ دیا گیا۔ میں نے برتن میں دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرے قدموں میں پڑے برتن میں نیلا محلول ”زوف“ تھا۔ اس محلول کا کرشمہ میں پہلے دیکھ چکا تھا۔

جنگلی بیل لبلب کی جڑ سے حاصل کیا جانے والا یہ محلول انسانی گوشت کو ایک سیکنڈ میں ہلا کر ہڈی سے علیحدہ کر دیتا تھا۔ میں نے ایک قیدی کے پاؤں کا گوشت ہڈی سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب شاید میرے پاؤں کو بھی اس محلول میں ڈبوایا جانا تھا۔

بوگالے نے اپنا اعصاب ایک کارندے کو پکڑا لیا اور اپنا چہرے میرے بالکل قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”بہت جوش ہے نا تیرے لہو میں..... دیکھ میں..... اسے کیسے سرد کرتا ہوں..... دیکھ..... اور یاد رکھ میں اتنی جلدی تجھے مرنے بھی نہیں دوں گا.....“ اس نے جھپٹ کر میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے، نشست کو ٹھوکر مارتے ہوئے مجھے نیچے گرا لیا اور میرا چہرہ اس محلول والے برتن کی طرف لے گیا۔

”گھبرانا نہیں..... تم مرو گے نہیں..... بس تمہاری آنکھیں، تمہارا ناک، تمہارے ہونٹ یہ سب نہیں رہے گا۔“ بوگالے نے کہا اور میرے منہ کو اس محلول میں ڈوبنے کے لیے نیچے کو زور لگانے لگا۔ ذوق سے میری آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔ میرے کندھے اور گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے اور میں اپنا چہرہ اس زہرناک محلول سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے چہرے سے نصف فٹ دور رہ گیا تھا۔ محلول میں مجھے اپنا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرا چہرہ پسینے سے نہا گیا تھا۔ پیر کے انگوٹھے کی تکلیف کا احساس بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ بوگالے نے میری گردن کو زور دیا اور محلول چہرے کے مزید قریب آ گیا۔

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے، کانوں میں شاخیں شاخیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بوگالے نے اپنا پورا وزن میری گردن پر مرکوز کر دیا تھا مگر برسوں کی ریاضت یہاں کام آ رہی تھی، میں چھ من وزن لوہے کا کڑا گردن میں ڈال کر نصف میل چلا کرتا تھا۔ یہ ورزش میری ٹریننگ میں شامل تھی۔ بوگالے نے جتنا زور میری گردن پر صرف کر دیا تھا کوئی اور ہوتا تو کب کا اس کا چہرہ زوف میں ڈوب کر مرخ ہو چکا ہوتا مگر میں اپنی تمام تر طاقت صرف کر کے خود کو بچائے ہوئے تھا۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا جب زندان کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور سردار روبان میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کے اندر آیا تھا۔ وہ تقریباً چلا تے ہوئے بولا تھا۔ ”بوگالے یہ تم کیا کر رہے ہو.....؟“

”تمہیں نظر نہیں آ رہا.....“ بوگالے وحشت میں چلا کر بولا۔

”میں کہتا ہوں پیچھے ہٹو اور چھوڑ داس کو۔“ سردار روبان بوگالے کا بازو کھینچ کر بولا۔

بوگالے نے مجھے چھوڑا اور سردار روبان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”سردار! کیا چاہتے ہو تم..... تمہیں پتا ہے تم نے میرا ہاتھ روک کر دیوتا بوکاشی کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔“

”دیوتا بوکاشی کی طرف سے علی نواز کے لیے ابھی کوئی حکم نہیں آیا..... اس لئے تم ابھی کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔“

”تم مجھے سمجھانے والے کون ہوتے ہو.....“ بوگالے سردار روبان کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔

”بوگالے! تم ایک سردار کی تو بین کر رہے ہو.....“ سردار روبان دھاڑتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں کہتا ہوں یہاں سے دفع ہو جاؤ..... نہیں تو.....“

”نہیں تو کیا..... بوگالے!“ سردار روبان حیرانگی سے بولا۔ اس دوران سردار نے بوگالے

کے بازو کو اپنے مضبوط ہاتھ میں جھکڑ لیا تھا۔

اچانک بوگالے کا لہجہ انتہائی خوفناک ہو گیا۔ اس نے کوئی بات کی، ساتھ ہی سردار روبان کی دھاڑ بھی سنائی دی۔ پھر یکایک دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی کشش میں بوگالے کا داؤ چل گیا۔ سردار روبان نے اسے دھکا دیا تو وہ اس کا رندے کے ساتھ جا کے نکل آیا جس نے بوگالے کا اعصا تھام رکھا تھا۔ بوگالے نے دیوانوں کی طرح اسے دھکا دیا اور اعصا اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ سردار روبان ایک لمحے کے لیے ٹھکا مگر دوسرے ہی لمحے بوگالے نے اپنا تیز نوکیلا اعصا سردار روبان کے پیٹ میں جھونک دیا۔ ایک چیخ میرے منہ سے نکل کر رہ گئی۔ بوگالے نے سردار روبان کو ٹانگ مار کر پرے پھینکا اور پھنکارتے ہوئے میری طرف بڑھا۔ اس کی حرکتوں سے عجیب دیوانگی جھلکتی تھی۔

اس نے آتے ہی بہت زور سے اپنا گھٹنا میرے چہرے پر مارا۔ یہ اس کی نفرت کا اظہار تھا۔ زور میری ناک سے خون جاری ہو گیا۔ خون جو بنی زوف سے بھرے برتن میں گرا۔ ایک دم جل کر سیاہ ہو گیا۔ یہ منظر میرے لیے بزار اور فرسا تھا۔ بوگالے اپنے کارندوں کو گالیاں دیتا ہوا پرے ہٹانے لگا پھر اس نے میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔

میں دل ہی دل میں اپنے پروردگار کو یاد کرنے لگا۔ فرشتہ اہل کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ مجھے کہیں قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی اور بادل اپنی گونج دار آواز میں گرج رہے تھے۔ بوگالے میری گردن پر زور دے کر بڑی تیزی سے میرا سر نیچے کی طرف لے کر گیا۔ میں نے پہلے سے سوچ لیا تھا۔ میں نے اپنی گردن کو فواد کی طرح اکڑا لیا اور اپنے پیروں پر پورا زور دیتے ہوئے خود کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ بوگالے کو مجھ سے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑا کے رہ گیا تھا۔ اس کوشش میں، میں زمین پر پشت کے بل لڑھک گیا تھا اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے زوف سے دور ہو گیا تھا۔ بوگالے نے اپنے لمبے کھجڑی بالوں کو چہرے سے پرے ہٹایا اپنے اعصا کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔

اس کا نشانہ شاید میرا پیٹ تھا۔ میں نے زور سے آنکھیں میچ لیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بند آنکھوں میں بہت سے پیارے چہرے حرکت کرنے لگ گئے۔ ماں کی نمناک صورت بھی نگاہوں میں گھوم گئی۔ بچکی کی صورت میرے دل سے نکلا ”اللہ“ اب اس کے علاوہ مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا شاید سخت مصیبت اور پریشانی کے عالم میں نکلا ہوا لفظ ہی اسم اعظم ہوتا ہے۔ میں نے اپنے سچے رب کو پکارا تھا اور پھر جیسے خدا کی رحمت پہنچ گئی۔ جس لمحے بوگالے میری طرف

بڑھا تھا ٹھیک اسی لمحے باہر راہدار یوں سے ایک خوفناک دھماکا سنائی دیا تھا اور چیخنے چلانے اور واویلا کرنے کی آوازیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ بوگالے اپنی جگہ پے جم کے رہ گیا۔ اس کی شیطانیت سے چپکتی آنکھوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کارندے بھی خوفزدگی اور حیرت سے بوگالے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک لمحہ شاید وہ ایک لمحہ ہی تھا۔ ایک چیخ چلاتا کارندہ دھڑام سے آکر زندان کے دروازے کے سامنے گرا تھا۔ آگ اس کے سارے جسم کو پکڑ کر چکی تھی اور وہ درد کی شدت سے لوٹ پوٹ ہوا جاتا تھا۔ بوگالے اپنے پیروں پر گھوما اور تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اسی دوران دوسرا زوردار دھماکا سنائی دیا۔ تمام کارندے بھی باہر کی طرف دوڑے۔ میں زندان میں اکیلا رہ گیا تھا پھر باہر سے بہت شور اور لکارے سنائی دینے لگے۔ آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے کسی گروہ نے محل پر حملہ کر دیا ہے پھر پاک و قنفے وقفے وقفے سے دھماکے سنائی دینے لگے اور بھاگو دوڑو اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا سینکڑوں انسانوں نے محل پر دھاوا بول دیا ہے۔ میں جلدی سے اپنے جسم کے گرد لمبی رسی کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کامیاب ہو گیا۔ رسیاں تو کھل گئیں اب پیر اور ہاتھ اہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے، ان کو کھولنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں دونوں پیروں پر اچھلتا ہوا زندان کے دروازے کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ راہداریاں دھوئیں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے آس پاس نگاہ دوڑائی مگر زخمی سردار روبان مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔

شاید پہرے دار اسے اٹھا کر لے جا چکے تھے۔ اچانک ایک طرف سے جلتا ہوا جنگلی آیا اور برے سامنے گر گیا اس کا آدھا جسم جل چکا تھا اور وہ آخری جھٹکے لے رہا تھا۔ دست بدست لڑائی کمزوریں نکرانے کی آوازیں، پر جوش لکارے اور زنجیروں کی دلدوز کراہیں باہر والی راہداری کی طرف سے آرہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا لڑائی باہر ہو رہی تھی۔ ان پُر اذیت آوازوں میں بار بار بادلوں کی پُر بہت گرج مکس اپ ہو رہی تھی، راہدار یوں سے پرے کھلے آسمان کے نیچے بھی تیز بارش میں لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بجلی کڑکی تھی تو یہ منظر میری آنکھوں میں روشن ہو گیا تھا۔ اندھیرے اور دھوئیں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابھی میں چند قدم ہی اچھلتا تھا کہ ایک تلوار زن کا رندے نے مجھے آیا۔

اس نے مجھے دھکا دیا اور دوبارہ زندان میں پھینک دیا۔ اس نے دروازہ بند کیا ابھی وہ تالہ ڈالنا ٹکا ہوتا تھا کہ ایک سوچ بڑی تیزی سے میرے ذہن میں داخل ہوئی اور میں نے اس پر عمل کرتے ہوئے زوف سے بھرا برتن اٹھایا اور اس کا رندے پر پھینک دیا جو بنی ایک اذیت ناک چیخ بلند ہوئی



میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ کارندے کا دھڑکے جگہ سے گل کرنا قابل دید ہو چکا تھا۔ زوف کا کچھ حصہ اس کے چہرے پر بھی پڑا تھا اس کا چہرے پر سے تمام نظر نہیں آ رہا تھا شاید یہ میرے لیے اچھا ہی تھا مگر اس کی ٹھوڑی کی جگہ ایک سفید خون آلود ہڈی نظر رہی تھی۔

میں نے سلاخوں والے دروازے سے ہاتھ ڈال کر باہر سے کنڈی کھولنا چاہی تو میں دل موس کے رہ گیا۔ مرنے والا مرتے مرتے اپنا کام کر گیا تھا۔ زندان کے دروازے کے باہر تالا لگ چکا تھا۔ میں ایک بار پھر قید ہو چکا تھا۔ دکھ میرے دل کے بہت اندر تک گھر کر گیا۔ پیر کے انگوٹھے کا جو زخم میں بھولا بیٹھا تھا وہ پھر شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا۔

اچانک مجھے کسی کے بھاگتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے خود کو زمین پر گرایا اور آنکھیں میچ لیں مگر ان میں اتنی درز ضرور رہنے دی کہ میں آنے والے کو دیکھ سکوں۔ کوئی بھاگتا ہوا زندان کے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ ایک دم میرا دل دھڑا دھڑا دھڑکے لگا۔ سامنے سے گزرنے والا کوئی اور نہیں بودی تھا۔ میں تیزی سے کھڑا ہوا اور زندان کے دروازے سے جا لگا۔ میں حلق کی پوری طاقت صرف کر کے بودی کو آوازیں دینے لگا۔ ایک، دو، تین، چار۔ مگر سب بے سود سب بیکار بودی جھد بھاگتا تھا ادھر دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے چیخ کر بودی کو پھر آواز دی اور پھر دھڑام سے نیچے گر گیا۔ میری آنکھوں میں بے بسی کے آنسو اُٹھ آئے۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ بادل یوں گرج رہے تھے جیسے بارش آج کا دن ہی ہے۔ میں نمناک آنکھوں سے اپنے بارے میں سوچنے لگا تو آپوں آپ ہی رابعہ کی شبیہ نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اچانک ایک زوردار آواز سے میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ بودی میرے سامنے کھڑا کھباڑے سے زندان کے تالے کو ضربیں لگا رہا تھا۔ تیسری چوٹی ضرب پر ہی تالا ٹوٹ گیا۔ بودی نے جلدی سے کنڈی کھولی اور اندر آ گیا۔ ابھی وہ مجھ تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک حملہ آور نمودار ہوا اس نے تلوار فضاء میں بلند کی اور بودی کے سر پر مارنا چاہی، بودی کا دھیان میری طرف تھا وہ حملہ آور سے بے خبر تھا۔ میں نے عین وقت اپنے ہاتھ بلند کر دیئے تلوار کا جو دار بودی کے سر پر لگنا تھا وہ میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان جھونٹا ہوئی زنجیر پے آگیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو مخصوص حرکت دی اور تلوار زنجیر میں جکڑی گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے حملہ آور کی تلوار دور جا گری، اتنے وقت میں بودی اپنا رخ حملہ آور کی طرف پھیر چکا تھا۔ ان

نے جہان کن تیزی سے کھباڑے کا مہلک وارہ مقابل پر کیا جو اس کے کندھے سے لگا۔ حملہ آور اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔

بودی تیزی سے میری طرف بڑھا اور مجھے کچھ اشارہ کرنے لگا۔ میں اس کی بات فوراً سمجھ گیا۔ میں نے فوراً اپنی دونوں ٹانگیں جس حد تک پھیل سکتی تھیں پھیلا دیں۔ بودی کے کھباڑے کے دوسرے ہی وارے میرے پیروں کی زنجیر کٹ گئی۔ میرے پیروں کی بندش کھل گئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کی زنجیر کی طرف اشارہ کیا اس سے پہلے کہ بودی انہیں بھی کسی طرح سے توڑتا باہر راہداری سے بہت شور مانی دینے لگا۔ میں نے بودی کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے اشارے ہوئے اور ہم دونوں زندان سے باہر نکل کر بائیں طرف راہداری میں بھاگنے لگے۔ شور دائیں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ بودی نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور ہم بھگی راہداری میں بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ پیچھے سے اٹھتا ہوا شور ہمارے پیچھے ہی پیچھے لپکا آ رہا تھا۔

ہمیں ابھی بھاگتے ہوئے ٹھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سامنے راہداری سے بھی قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی اور پھر بجلی جھکی اور منظر آنکھوں میں روشن ہو گیا، سامنے راہداری میں بوگا لے اپنے کارندوں کے ساتھ بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس کی خونی نگاہیں مجھ پر آ کر ٹپک گئی تھیں۔ بھاگتے ہوئے میں نے ایک جھٹکے سے بودی کے ہاتھ سے وزنی کھباڑی چھین لیا۔ بودی میرا ارادہ بھانپ گیا وہ چلاتے ہوئے بولا۔

”علی نواز! یہ تم کیا کرنے لگے ہو..... ان لوگوں سے اس وقت مقابلہ بہادری نہیں بلکہ بے وزنی ہوگی۔ ہم بے مقصد مارے جائیں گے۔“ ایک مختصر لمحے میں بودی کی یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی اور میں بودی کی تقلید میں بائیں طرف راہداری میں مڑتا چلا گیا۔ ہم راہداری میں اندھا دھند ہمارے چلے جا رہے تھے اور پیچھے موت ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔ اچانک میری نگاہ اس لمبی گلی کی طرف پڑ گئی جس کے آخر میں وہی مستطیل کمر تھا جسے یہ جنگی بھیڑا کہتے تھے۔ مجھے بھاگنے میں بے حدقت پڑا آ رہی تھی مگر موت کے خوف نے تکلیف کا ہر احساس مٹا رکھا تھا۔ میں بودی کا ہاتھ پکڑ کر اس لمبی گلی میں بھاگتا چلا گیا جب ہم گلی کے آخری سرے پر پہنچے اس وقت بوگا لے ساتھیوں سمیت لمبی گلی کے آغاز میں پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں تیزی سے بھیڑا میں داخل ہوئے اور ہم نے وزنی دروازہ اندر سے نکل لیا، آہنی کواڑ چڑھایا اور مٹی کے بنے جسموں میں سے راستہ بناتے ہوئے کمرے کے آخری کونے کی طرف بڑھنے لگے۔ تین طرف بنی کھڑکیوں اور دروازوں سے آج زرد دھوپ کی بجائے تیز ہوا

بھیڑا کا دروازہ آخر کار ٹوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیڑھ درجن کے قریب جنگلی بھیڑیاں داخل ہوئیں اور کم و بیش اتنے ہی رسوں کے ذریعے دروں کو پھلانگتے ہوئے اندر گھس آئے۔ یہ تقریباً ان کے قریب سامان جنگ و جدل سے لیس جنگلی تھے۔ ان سے دو آدمی کب تک لڑ سکتے تھے۔ بے جسم میں اچانک پڑمردگی چھا گئی۔ کھانڈے کے دستے پر بھی میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی مگر پھر ہی ایک منظر نے میری خون کی گردش کو ہزار کلومیٹر تک بڑھا دیا۔

رسیوں کی مدد سے بھیڑا پر چڑھ آنے والے جنگلی بوگالے کے گردہ سے بھڑ گئے تھے شاید یہ وہ وہ تھا جس نے محل پر دھاوا بولا تھا۔ میں نے پلک جھپکنے میں بووی کا ہاتھ تھاما اور اندھیرے حصے ایک در کی طرف بڑھا دوسرے ہی لمحے ہم دونوں رسوں سے لٹکتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ بارش براہ راست ہمارے جسموں پر پڑ رہی تھی۔ ہم نیچے اترے تو وہاں بھی ہر طرف جنگ کا میدان گرم و خشک جنگلی ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے، مار رہے تھے۔ وحشی لکارے، خونی جھنکاریں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے اسی بے ہنگم شور میں بووی کو اشارہ کیا اور اس نے تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے مکی زنجیروں سے بھی نجات دلا دی۔ اب میں آزاد تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے ایک گھوڑے پر

مت کی۔ بووی کو بھی جلد ہی بغیر سوار کے ایک گھوڑا نظر آ گیا۔ ہم تلواروں، دھواں، دھواں، فضاء اور چمکتی بجلی، برستے بادل میں گھوڑا دوڑاتے چلے گئے۔ بووی

لے چل رہا تھا اور میں اس کی تقلید کر رہا تھا۔ وہ بڑا عجیب سفر تھا۔ ہم برستے آسمان کے نیچے پون نہ گھوڑے دوڑاتے رہے۔ جلد ہی ایک بستی کے آثار ہمیں نظر آنے لگے۔ ہم ایک ڈھلوان سے پناہ رہے تھے کہ فوجیوں کی ایک ٹکڑی نے ہمیں گھیر لیا۔ جنگلی فوجیوں کا سردار ایک پتکے ناک والا لی تھا وہ آگے بڑھا اور بووی سے بولا۔ ”تم کون ہو..... اپنی شناخت کرواؤ.....؟“

بووی کے جواب میں، میں بولا۔ ”سردار! ہم شکار کے لیے نکلے تھے بہت دور کا سفر کر کے مل لوٹ رہے ہیں.....“ میرا جواب تسلی بخش نہیں تھا۔ سردار مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھنے پھر وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب لے آیا۔ میری ناک سے بہنے والا خون ابھی تک جما تھا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر ان آنکھوں میں اچانک چمک نمودار ہوئی وہ چیختے لہجے میں بولا۔

”تم..... تو وہی ہو..... وہی..... جس کی تلاش میں ہم نے سردار روادو سے دشمنی مول لی تھی تمہاری وجہ سے اتنی بڑی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور تم یہاں مزے سے گھوم رہے ہو۔ تمہاری وجہ

کے جھگڑ اور بارش کی پھوار اندر داخل ہو رہی تھی۔ زوردار بجلی چمکی اور چمکتی چلی گئی۔ بھیڑا سارا کا سارا دودھیا روشنی میں نہا گیا۔

میں نے دیکھا بووی حیرت کا مجسمہ بنے ایک طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ مسلسل چمکتی بجلی میری اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھٹھاتے صاف نظر آرہے تھے۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو میری نظر اس مٹی کے بنے چہرے پر جا کر ٹھہر گئی جسے میں کچھ دن پہلے دیکھ چکا تھا اور جو چہرہ مجھے شہساز تھا۔ بووی کپکپاتے ہونٹوں سے کہہ رہا تھا۔

”علی بھائی! یہ..... یہ میگی کا چہرہ ہے..... ہو ہو میگی کی شکل..... میں اس شکل کو آنکھوں شکل میں پہچان سکتا ہوں۔“ بووی کے الفاظ میری سماعت پر بجلی بن کر گرے۔ جس کشمکش میں، میں کئی دن سے گرفتار تھا وہ بووی نے ایک منٹ میں حل کر دی تھی۔ میگی کے قتل کا معمہ حل ہو گیا تھا اور شاید..... پچھلے سال ہونے والے پراسرار قتلوں کا معمہ بھی حل ہو گیا تھا۔ سردار روبان کی زبانی مجھے بتا چل چکا تھا کہ بھیڑا میں موجود سب مٹی کے چہرے والے لوگ بوکاشی دیوتا پر قربان ہو چکے ہیں۔ میری آنکھوں میں چھائی سرخی مزید گہری ہو گئی، میں پھنکار تے لہجے میں بولا۔

”بووی! اگر یہ مٹی کا چہرہ واقعی میگی کا ہے تو مجھو تمہاری تلاش ختم ہو گئی، میگی کے قاتل کا پتا پا چکا ہے۔“

”کون ہے..... وہ شخص؟“ بووی ناقابل یقین زہریلے لہجے میں بولا۔

”ابھی وقت نہیں موقع آنے پر تمہیں میں اس کے سامنے کھڑا کر دوں گا۔“ میں نے بووی سے کہا اور تیزی سے ایک کھلے در کی طرف بڑھا۔ بھیڑا کا دروازہ مسلسل توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی کسی بھی لمحے بوگالے ساتھیوں سمیت ہمارے سروں پر مسلط ہو سکتا تھا۔ اب ایک ہی رستہ تھا ہم کو طرح ان کھلے دروں میں سے کسی ایک سے کود جائیں مگر میں ابھی اس چیز سے لاعلم تھا کہ ہم اس وقت کافی بلندی پر کھڑے ہیں جو نہی میں نے ایک در سے نیچے جھانکا میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہاں زمین کا فاصلہ ساٹھ ستر فٹ کے قریب تھا۔ اتنی بلندی سے کود کے جان تو دی جا سکتی تھی فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ابھی جھک کر جائزہ لے رہا تھا کہ ایک اور منظر نے مجھے چونکا دیا اور میں سر تاپا لارز گیا۔ درجنوں کے قریب جنگلی رسوں کی مدد سے اوپر چڑھے آ رہے تھے۔ ان کی کندیں دروازے منڈیروں کے ساتھ پیوست تھیں۔ تین چار کے قریب جنگلی ایک ساتھ اچھل کر بھیڑا کے اندر کودے میں ان سے مقابلے کے لیے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ بووی نے مجھے ایک اندھیرے کونے میں

پانی میں گھوڑا لگی چال چلتا پار ہو گیا، نالے سے نکلتے ہی میں نے ایک بار پھر سے گھوڑے کو تیز کر دیا۔  
نبرد کی برسات ابھی بھی جاری تھی مگر میں تیروں کی ریش سے اب دور نکل آیا تھا۔ دور سے نظر آنے  
والی بستی کے اب ہم قریب پہنچ چکے تھے یہ چھوٹی چھوٹی گلیوں کا ایک گورہ دھندہ تھا، یہاں سینکڑوں کی  
ندادیں پتھروں اور لکڑی کی مدد سے بنے ہوئے مکان موجود تھے۔

گلیوں میں جا بجا کیچڑ اور بارش کا پانی نظر آ رہا تھا، میں جست لگا کر گھوڑے سے نیچے اترا  
بودی کی طرف دیکھا جو بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے میں نے کندھے پر ڈالا، گھوڑے کو ایک مخصوص  
تھکی رسید کی اور گھوڑا گلیوں سے نکلتا ہوا جنگل کی سمت بھاگ گیا۔ میں بودی کو کندھے پر ڈالے  
بری بارش میں پیر گھسٹا ہوا چلا جا رہا تھا۔ صرف ایک یا دو منٹ کی بات تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والا  
گروہ یہاں پہنچنے والا ہی تھا جس کا سردار حزیرو تھا وہی..... حزیرو جس نے میرے سینے میں تلوار اتارنا  
پاہی تھی مگر عین وقت پر سردار روبان نے اس کا ہاتھ روک لیا تھا۔

میں ایک پاؤں گھسٹا اور بھاگتا ہوا ایک گلی سے جب دوسری گلی میں پہنچا تو ٹھیک وہ وقت تھا  
جب بستی کے پہلے کنارے سے مجھے جنگلیوں کا شور سنائی دیا۔ میں جان گیا کہ میرے میزبان پہنچ چکے  
ہیں۔ میں اور تیزی سے پیر گھسٹے لگا۔ بجلی کے کڑا کے جیسے میرے بے طرح دھڑکتے دل پر وار کر  
رہے تھے۔ میرے ایک ہاتھ میں کھڑا دوسرے کندھے پر بودی تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا  
کروں۔ کہیں جائے پناہ نظر نہیں آرہی تھی۔

پھر اچانک مجھے ایک گڑھ نظر آ گیا یہ ایک مکان کی بچھلی دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ یہ اتنا گہرا  
نما کہ دو چار آدمی اس کے اندر ساکت تھے مگر خرابی یہ تھی کہ وہ گڑھا اس وقت نصف پانی سے بھرا ہوا تھا  
میں نے کوئی موقع ضائع کئے بغیر اس میں اترنے میں ہی عافیت محسوس کی، میں گڑھے میں اس طرح  
بیٹھ گیا کہ بودی کی ٹانگیں پانی کے اندر اور بالائی دھڑ میری ٹانگوں پر تھا۔ میں پانی میں بیٹھا ہوا تھا اور  
میرے اوپر بھی پانی ہی برس رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی میرا پیچھا کرنے والے بستی میں پہنچ گئے۔  
گھوڑوں کے ہنہانے کی آوازیں اور پیروں کی شپاشپ ہر طرف سنائی دینے لگی۔ میں فطری طور پر  
گڑھے کے اندر ہی اندر چلا جا رہا تھا۔ تیرا بھی تک بودی کی ٹانگ میں پیوست تھا۔ بودی کی ٹانگ  
اچانک ہلی تو تیر کسی اہنی دھات کے ساتھ ٹکرایا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے، میں نے پانی میں ہاتھ  
ڈال کے وہ جگہ ٹوٹی تو وہ سلور کی پرات کی مانند کوئی شے تھی۔ میں نے پاؤں سے آگے کی طرف تھوڑا  
مدا باؤ ڈالا تو وہ پرات اپنی جگہ سے کھسکی۔ میں نے اور زور لگایا تو وہ پرات اور اندر کودھنس گئی۔ میں

سے سردار روبان نے سب کی آنکھوں کے سامنے راکو کو مار ڈالا تھا۔ یاد رہے..... یاد ہے نا تمہیں.....  
سردار میرے سامنے انگلی نکاتے ہوئے بولا تو میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ یہ جنگلیوں کا وہ گروہ  
جو برب کی طرف آتے ہوئے مجھے راستے میں قتل کرنا چاہتا تھا جبکہ سردار روبان کے گروہ کا کہنا تھا کہ  
اسے برب دیوتا کے آگے قربان کرنا ہے۔

اس وقت اس بات پر دونوں گروہ آمنے سامنے صف آراء ہو گئے تھے پھر دونوں گروہوں میں  
شدید ترین لڑائی ہوئی تھی بعد ازاں میرے فوری قتل کا منہی گروہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا اور میری  
زندگی کے دن کچھ اور بڑھ گئے تھے مگر اب وہی گروہ دوبارہ منظم ہو کر سردار رواڈو سے ٹکرا گیا تھا۔ ان  
خبر مل چکی تھی کہ جس ”باہر کے آدمی“ یعنی ”مجھ“ کو برب دیوتا کے چرنوں میں قربان کیا جانا تھا وہ  
ہے اور نا صرف زندہ ہے بلکہ برب وادی میں موجود ہے۔

میرے اعصاب تن گئے تھے اور میں ذہنی طور پر اپنی جان کے دشمن ان جنگلیوں سے لڑنے کا  
تیار ہو چکا تھا۔ وہ تعداد میں چھ تھے، چار کے پاس تلواریں اور دو کے پاس دودھاری کھڑاے تھے۔  
میں نے بودی کی طرف دیکھا آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے اور ہم ان مادر زاد  
جنگلیوں سے بھڑ گئے۔ پہلے پہلے میں ہی دو جنگلیوں کا رخ کر گھوڑوں سے لڑھک گئے۔ دو اور کو کاری  
لگے تو سردار اپنے ایک سوار کو نہتہ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ آخری سوار بھی اپنے سردار کے تعاقب  
نکل بھاگا۔ ہم دونوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ پھیرا اور ڈھلوان اترتے چلے گئے۔ ابھی ہمیں  
دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ بلندی سے بہت شور سنائی دینے لگا۔ بجلی کے کڑا کوں میں  
درجن کے قریب جنگلی لکارتے اور چنگھاڑتے ہوئے ڈھلوان اترنے لگے۔ ہم نے گھوڑوں کی رز  
تیز کر دی۔ اچانک ہم پر تیروں کی بارش ہو گئی۔

اس حملے کے لیے ہم قطعی طور پر تیار نہیں تھے۔ بارش ہنوز زوروں پر جاری تھی ایک تیر بودی  
ران پر لگا اور وہ اونڈھے منہ گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا  
بودی نے کراہتے ہوئے اپنا ہاتھ مجھے دیا اور میں نے اسے کھینچ کر گھوڑے پر اپنے ساتھ بٹھالیا  
تیروں کی بوچھاڑ میں گھوڑا ڈھلوان اترتا ہوا میدانی حصے میں آیا تو اس کی رفتار خود بخود تیز ہوتی  
گئی۔ بودی دائیں بائیں جھول رہا تھا پھر ایک دم اس کا سر گھوڑے کی گردن سے جا لگا شاید زخم  
تکلیف نے اسے دھرا کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا حملہ آور ہمارے پیچھے لپکے آرہے تھے۔ میرے دائیں  
ہاتھ پر ایک پہاڑی نالہ روانی سے بہتا چلا جا رہا تھا میں نے گھوڑا اس میں ڈال دیا۔ تین فٹ گہر

نے اور کوشش کی مگر پرات نما چیز اس جگہ قائم رہی۔ میں ادھر سے اپنی توجہ ہٹائی مگر پھر اچانک ایک نے مجھے حیران کر دیا۔ گڑھے میں موجود پانی آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور آخر کار ختم ہو گیا۔ اندھیرے، گار آلود گڑھے میں اچانک ایک چمکتی ہوئی شے نظر آئی۔ میں نے پرات پے دباؤ دیا تو چمکتی چیز مومی روشنی میں ڈھل گئی۔ وہ ایک کمرہ تھا جس میں ایک مومی مشعل روشن تھی۔ میں نے پرات زور لگا کر پرات اس جگہ سے اکھاڑ دی۔ میں آسانی سے اندر کو پھسل گیا پھر میں نے ٹانگوں سے کھینچ کر بووی کو بھی اندر گرا لیا۔ پرات کے اندرونی جانب ایک آہنی دتی بنی ہوئی تھی میں نے اس دتی پے ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے اس روزن کو بند کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو دنگ رہ گیا اس کمرے کا کوئی در کوئی کھڑکی کوئی دروازہ نہیں تھا مگر پھر فوراً ہی میرا دھیان چھت کی طرف چلا گیا جہاں لکڑی کا ایک تختہ دھرا تھا تو اس کا مطلب تھا یہ اس مکان کا تہہ خانہ تھا۔ یہ تہہ خانہ کافی بڑا تھا اور میری بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اس تہہ خانے میں بھوسے کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ ایک چیز جس نے مجھے حد سے زیادہ حیران کیا وہ گینڈے کے سینگوں کا بڑا ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر میں چھوٹے بڑے طرح طرح کے سینگ پڑے ہوئے تھے۔

میں نے بھوسے کے ایک بڑے سے ڈھیر کے پیچھے بووی کو لٹایا اور اس کی ٹانگ سے تیر نکالنے کی سعی کرنے لگا۔ جلد ہی میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اپنی آستینیں بھار کے مشعل میں جلا کے راکھ بنائی اور پھر اس راکھ کو بووی کے زخم پے باندھ دیا۔ باہر سے بادلوں کی مدہم گونج اور دشمن جنگیوں کے لکارے گونجتے رہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگیوں کی آوازیں یکسر ختم ہو گئیں جبکہ بادلوں کی گونج اور بجلی کے کڑا کے جاری رہے۔ بووی ابھی تک نیم بے ہوشی میں تھا۔ گاہے گاہے اس کی مدہم کراہ سنائی دے جاتی تھی۔ میں نے اس کا سراپنی ٹانگوں پے دھرا ہوا تھا اور میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ میں اس کی تکلیف دیکھ کر اپنا زخم یکسر بھولا ہوا تھا۔ میرے پاؤں کا انگوٹھا بالکل کچلا ہوا تھا۔ مسلسل پانی میں رہنے کی وجہ سے انگوٹھے کا زخم بگڑ چکا تھا وہ کسی شاعر نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ مشکلیں اتنی پڑیں کے آساں ہو گئیں۔ مجھ پر ایک دم اتنے مصائب ٹوٹ پڑے تھے کہ تکلیف کا ہر احساس مٹا چلا گیا تھا۔ ایک عرصہ ہو چلا تھا مجھے مسکرائے ہوئے۔

میں بھوسے کے بلند ڈھیر کے پیچھے بووی کا سراپنے زانو پے رکھے کتے ہی گھٹے سوچوں کے بھنور میں ڈوبتا بھرتا رہا۔ نا جانے وہ رات کا کون سا پہرہ تھا۔ بووی تھوڑی دیر کے لیے بیدار ہوا اور پھر

پھر ہی نیند سو گیا شاید اس کے زخم کو آرام پہنچا تھا۔ میری آنکھیں بھی نیند کے بوجھ سے بند ہو گئیں۔ یہ نیند بھی عجیب چیز ہے۔ مقتل کے سناٹوں میں بھی چلی آتی ہے۔ میں بیداری اور نیند کے درمیان لٹکا ہوا تھا جب اچانک کھڑکا ہوا اور چھت والا لکڑی کا دروازہ کھل گیا۔ میرا دل حلق میں آ گیا، بند کا اڑن چھو ہونا تو لازمی امر تھا۔ میں نے پاس پڑے ہوئے کلبھاڑے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ میں نے آہستہ سے بووی کے سر کے نیچے سے اپنی ٹانگیں نکال لیں۔ یکا یک میرے اعصاب تن گئے تھے جو واحد خوف میرے سر پر سوار تھا وہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ لکڑی کا دروازہ چھت سے ہٹتے ساتھ ہی ایک چوبلی سیڑھی کھلے در سے نیچے آئی اور فرش پے ٹنگ گئی۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر ایک ستون کے ہاتھ لگ گیا۔

مگر پھر جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا اس نے میرے دل کے ایوانوں میں ہلچل مچا دی۔ پتا نہیں ایک دم اچانک اتنا پانی میری آنکھوں میں کیسے بھر آیا۔ وہ خوبصورت سہانا منظر ”پانی“ کی شورش میں ڈوب کے رہ گیا۔ میں نے جلدی سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے مبادا یہ پیارا منظر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ سیڑھیوں سے نیچے اترنے والی نازنیں، حسن کا مجسمہ، پری پیکر رابعہ تھی۔

رابعہ میری رابعہ۔ اس کی حسین لائبریری آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ مومی روشنی میں اس کا چہرہ کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ وہ سیڑھی سے نیچے اتر کر نازک چال چلتی ہوئی تہہ خانے کے ایک کونے کی طرف ہوئی۔ وہاں لکڑی کا ایک صندوق دھرا تھا۔ اس نے آہستگی سے صندوق کھولا اور اس میں سے کچھ نکال کر دیکھنے لگی۔ وہ کتنی ہی دیر ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز دیکھتی رہی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا میں نہیں دیکھ پایا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز دوبارہ صندوق میں رکھی، اس کی سریلی سی پچی بلند ہوئی اس نے صندوق بند کیا اور واپس مڑی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں شبنمی آنسو تیر رہے تھے۔ برا کیجہ کٹ کے رہ گیا۔

وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس مڑی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی ابھی وہ دو تین سیڑھیاں ہی چڑھی تھیں کہ اُسے کچھ یاد آیا اور وہ دوبارہ نیچے اتر آئی۔ اب اس کا رخ میری طرف تھا۔ میرے سینے میں ہڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے، جسم میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ رابعہ میرے پاس سے بڑگڑگڑنے لگی تو میں بڑی سرعت سے ستون کی اوٹ سے نکلا۔ میں نے ایک بازو رابعہ کی گردن کے

پہنچے؟“

وہ آتے ہی بول پڑی۔ میں نے تھوڑا سا توقف کیا اور پھر اول تا آخر راجہ کو اپنی ساری کہانی نادی کہ کس طرح میں اس کو بے ہوشی کی حالت میں پڑاؤ کے اندر چھوڑا اور رینا کی تلاش میں چل نکلا۔ راستے میں آنے والے سارے مصائب جھیلتا رینا تک پہنچنا پھر وہاں سے رینا کا اور میرا فرار پھر پڑے جانا۔ سردار روادو کے محل میں رہنا۔ پھر رینا کی اندوہناک موت۔ میرا قید ہونا، محل پر چالین کا حملہ، بودی کے ساتھ میرا فرار اور پھر یہاں اس تہہ خانے تک پہنچنا، سب کچھ میں نے راجہ کو حرف بہ حرف بتا دیا۔ ساری کہانی سننے کے بعد راجہ مغموم سی ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کتنے لمحے ایسے گزر گئے پھر میں نے یہ خاموشی توڑی۔ میں کھنکھارتے ہوئے بولا۔ ”راجہ! میں نے تو تمہیں سب کچھ بتا دیا اب تم بھی اپنی کہانی سناؤ۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ یہاں کیسے پہنچی؟“

راجہ چند لمحے نمناک آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہی پھر اس نے کہنا شروع کیا ”علی نواز! پڑاؤ پر حملہ میری نا سمجھی کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں جنگل میں ایک چیز کی تلاش میں نکلی تھی مگر میری غلطی میں الٹی سمت چلی گئی۔ وہاں جنگلیوں کا ایک قافلہ جا رہا تھا اسی قافلے میں سے ایک بن مانس نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوا جسے میں نے بارہ بار اور ایک ہی فائر کر کے ڈھیر کر دیا۔ بن مانس کو مارنا میرے لئے وبال جان بن گیا۔ جنگلی میرے پیچھے چڑھ دوڑے۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگی۔ میں اپنا گھوڑا دوڑاتی پڑاؤ کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔ میں گرتی پڑتی پڑاؤ میں پہنچ گئی۔ اس سے آگے جو حالات پیش آئے ان کا تمہیں معلوم ہی ہے۔“

راجہ یہاں تک سنا کر خاموش ہوئی تو میں بولا۔ ”راجہ! میرے وہاں سے چلے آنے کے بعد کیا حالات پیش آئے؟“

میرے سوال پر وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ”علی نواز! تم جب پڑاؤ سے چلے گئے تو سب لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کا کہنا تھا کہ علی نواز رینا کی تلاش میں گیا ہے جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ علی نواز رینا کو اغواء کر کے فرار ہوا ہے۔۔۔۔۔“

”تم کس گروہ میں شامل تھی۔۔۔۔۔ راجہ؟“ میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

راجہ میری بات کا مفہوم سمجھ کر بولی۔ ”علی نواز! پہلے میں تمہاری حمایت والے گروہ میں شامل تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ تم ہی گنہگار نہ۔ میں دن رات اسی کرب میں جلتی رہی کہ جسے میں اپنا اچھا دوست سمجھتی ہوں وہ اتنی گری ہوئی

گرد حائل کیا جبکہ داہنا ہاتھ مضبوطی سے اس کے ہونٹوں پہ جما دیا۔ دو کہیں جنگل کے ویرانوں میں بجلی گری تھی یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ ایک زور کا کڑا کسانکی دیا تھا۔ راجہ کی حسین آنکھیں خوفزدہ انداز میں میرے چہرے پہ جم کے رہ گئی تھیں۔ اس کی پتلیاں حرکت کرنا بھول گئی تھیں۔ آنکھوں سے خوفزدگی کا تاثر ختم ہوا تو وہ دلنیش آنکھیں لطیف آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں نے ان آنسوؤں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان چمکتے آنسوؤں میں میرے لیے دکھ ہی دکھ، ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹایا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے مہین آواز نکلی۔ ”نونی۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔؟“

بڑی عجیب بات تھی۔ پتا نہیں کیوں آج زندگی میں پہلی دفعہ مجھے اس کا نونی کہنا اچھا لگا تھا۔ میرے دل میں خوشی کے شادیاں بچ اٹھے تھے۔ میں سرتاپا نہال ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ راجہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تمہارا بچپن کا ساتھی نونی۔۔۔۔۔“

”تم۔۔۔۔۔ یہاں کیسے پہنچے۔۔۔۔۔؟“ اس کی لرزیدہ آواز ابھری۔ باہر بارش مسلسل جاری تھی۔

”راجہ۔۔۔۔۔ میں اپنی کہانی سناؤں گا تو تمہیں جھوٹ لگے گا۔۔۔۔۔ میں تمہیں جتنا بھی یقین دلاؤں تم مجھے اتنا ہی جھوٹا قرار دو گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ میں بڑے دکھ کے ساتھ بولا۔

راجہ نے شرمندہ شرمندہ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر وہ سک پڑی۔ ”علی نواز۔۔۔۔۔! مجھے اور شرمندہ مت کرو۔۔۔۔۔ میں اصل صورت حال جان چکی ہوں۔۔۔۔۔ میں یہ سب جان چکی ہوں کہ رینا سے تمہارا کیا رشتہ تھا اور۔۔۔۔۔ رینا کس طرح قتل ہوئی تھی۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ علی نواز۔۔۔۔۔ میں نے انجانے میں تمہیں بہت دکھی کیا ہے۔۔۔۔۔“ راجہ کا آخری فقرہ سن کر میں ایک دم چونک گیا۔ مجھے معلوم تھا راجہ نے یہ فقرہ کس نظریے سے کہا ہے۔ میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ ”راجہ! کاش تم جان سکتی کہ تم نے مجھے انجانے میں کس قدر دکھی کیا ہے۔“ میں دل کی بات زبان پر نہ لاسکا۔

”چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔ تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی۔۔۔۔۔ ورنہ شاید میں ہمیشہ اس کرب میں جلا رہتا۔۔۔۔۔“ راجہ خاصی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی شرمندگی مٹانے کیلئے اوپر چلی گئی اور پھر چند منٹ بعد لوٹ آئی۔

”اوپر سب ٹھیک ہے۔ میں دیکھ آئی ہوں۔۔۔۔۔ اب مجھے تم بتاؤ تم یہاں اس تہہ خانے میں کسے

زرد سے رنگ کا محلول تھا۔ اس نے مجھے بٹھایا اور بڑی نفاست کے ساتھ پیر کے انگوٹھے کا زخم دھونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت ماہر سرجن ہے۔ میرے پیر پر پٹی باندھتے ہوئے ہی رابعہ نے مجھے بتایا تھا کہ ساسا اس کا چھوٹا بچہ اور انٹی ایبا اوپر کمرے میں بے خبر سو رہے ہیں۔ وہ بہت کم اس نہ خانے میں آتے ہیں۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔

بودی کے بارے میں بھی رابعہ کو معلوم پڑ چکا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بھی فکر مند ہوئی مگر میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ اگلے دن دوپہر تک بودی کو بھی ہوش آ گیا، ٹانگ پے لگنے والا زخم کافی گہرا تھا۔ رابعہ بودی کو ایک کڑوی جنگلی دوا پلا دیا کرتی تھی جس کی وجہ سے اکثر اس پر غنودگی طاری رہنے لگی تھی۔ اس دوا کی بدولت اس کا زخم دن بدن بہتری کی طرف جانے لگا تھا۔ وہ بڑے عجیب اور کیف آفریں دن تھے۔ رابعہ دن رات ہماری خدمت میں جتی ہوئی تھی۔ اسے جونہی موقع ملتا وہ تہہ خانے میں چلی آتی۔ کبھی اس کے ہاتھ میں کوئی دوا ہوتی، کبھی پھل تو کبھی کوئی پکوان۔ وہ ان دنوں باؤلی ہوئی پھرتی تھی۔ اس کے قدم جیسے ہواؤں پے پڑ رہے تھے۔ ہر وقت اس کے چہرے پے ایک بے نام سی مکان کھیلتی رہتی تھی۔ رات کے کسی پہر جب کڑوی دوا کے زیر اثر بودی گہری نیند سو رہا کرتا تو رابعہ بچے چلی آتی اور گھنٹوں بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ وہ ساری باتیں بچپن کے دور کی ہوتیں۔ باتیں کرتے ہوئے ان لمحوں میں وہ ایک بچی بن جاتی۔ ایک شوخ و چمچل بچی جس کی چمکیلی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی ہو۔ کبھی کبھی وہ باتیں کرتے کرتے ہنس کر دوہری ہو جاتی۔ کبھی اچانک خاموش ہو جاتی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔

ایک دن میں اس سے بولا۔ ”رابعہ! پہلے دن میں نے تمہیں دیکھا کہ تم نیچے اتری اور اس صندوق کے پاس گئی تھی، صندوق میں سے کوئی شے تم نے نکالی اور اسے دیکھنے لگی۔ وہ چیز کیا تھی مجھے آج تک تجس ہے۔“

میری بات سن کر ایک دم اس کے چہرے پے ایک رنگ سا آ کر گذر گیا۔ وہ بے حد مضطرب نظر آنے لگی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں..... کک..... کچھ بھی تو نہیں تھا.....“ پتا نہیں کیوں رابعہ کو پریشان دیکھ کر میرا دل بھی دکھی ہو جاتا تھا۔ میں نے دوبارہ اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا..... وہ بڑی ہی لپٹی لڑکی تھی۔ اس نے مجھے صحت مند دیکھنے کے لیے اپنا سارا چین و مکون برباد کر لیا تھا۔ اس کے بال بکھرے اور پراگندہ رہتے تھے۔ وہ مسلسل میری اور بودی کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی..... مگر کبھی کبھار..... مجھے شک سا گزرتا تھا جیسے رابعہ یہ سب کچھ صرف میرے

حرکت کر چکا ہے۔ پورا پڑاؤ بہت دن تک تمہاری تلاش میں جا بجا بھٹکتا رہا مگر تم کسی کو نہیں ملے تمہیں جنیسے زمین نکل گئی تھی پھر انہی دنوں بہت تیز بارشیں شروع ہو گئیں۔ بادل گھر گھر آتے اور طوفان باد و باران کا منظر باندھ دیتے۔ بہت دن جب یہی صورتحال رہی تو زمبابوے واپسی کا پروگرام بنا۔ جب سب لوگ واپس لوٹ رہے تھے تو اس وقت ایک طوفانی شام جنگلیوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ مارے گئے مگر جلد ہی صورتحال بہت حوصلہ افزاء ہو گئی۔ جنگلی جم کیٹی انکل کے جان پہچان والے نکل آئے۔ تاجر برادری، کالج گروپ اور کچھ شکاریوں کو زمبابوے واپس بھیج دیا گیا۔ ہمیں بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ جنگلی اسی وادی میں لے آئے جہاں اب میں تمہیں نظر آ رہی ہوں۔

انکل جم کیٹی بہت کام کے آدمی ہیں۔ ان کی بدولت ہم یہاں بہت مزے میں ہیں۔ انہی کی کوشش سے میں تمہیں اس تہہ خانے میں ملنے چلی گئی تھی جہاں..... جہاں..... میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی..... مجھے بعد میں ساسا نے سب سچ سچ بتا دیا کہ علی نواز..... رینا کا قاتل ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ تو اس کا سب سے بڑا ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ ہاں..... علی نواز..... ساسا نے اپنے جھوٹ کو بچ میں بدل لیا ہے۔ تمہارے بارے میں اس نے جھوٹ صرف اپنے دو سالہ بچے کی رہائی کیلئے بولا تھا۔ وہ بے جا رہی بہت مجبور تھی۔

یہاں ایک میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب مجھے پہلی دفعہ سردار رواڈو کے محل میں پہنچا جا رہا تھا اور محل سے باہر لکڑی کے تختے پر بیٹھے ہوئے میں نے ساسا کو ایک چھوٹے بچے کے ساتھ دیکھا تھا پھر ساسا کو وہ بچہ اٹھا کر بھاگتے دیکھا تھا۔ تو کیا وہ اس کا بچہ تھا..... ساسا کا بچہ..... اس کے بچہ جانے والے شوہر بالی کا بچہ.....

”رابعہ! تمہارے علاوہ یہاں اور کون کون مقیم ہے؟“

”میں یہاں ساسا اور اس کی بوڑھی ساس ”ایبا“ کے ساتھ مقیم ہوں۔ انکل جم کیٹی، شاہنواز، گوگی، ابو، انکل ہیری کرس ساتھ والے گھر میں مقیم ہیں۔“ بات کرتے کرتے اس کا دھیان میرے انگوٹھے کی طرف چلا گیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ تڑپ کر نیچے بیٹھی اور میرے پاؤں کو تھام کر انگوٹھے کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔

اس کا چہرہ اچانک سروسوں کی طرح زرد نظر آنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے واپس پلٹی اور سڑھیال چڑھتی چلی گئی۔ اس کی واپسی چند منٹوں بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک کبا، کچھ کپڑا اور ایک

لئے کرتی ہے۔

میرا حلق آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا اور آنکھیں ڈبڈبائیں تھیں۔ وہی ہوا تھا میرے اظہار محبت کرنے سے پہلے ہی رابعہ نے مجھے چپ لگا دی تھی۔ وہی ”چپ“ جس نے میری زندگی کے بیس بائیس سالوں کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ وہی چپ جس نے مجھے کانٹوں پر گھسیٹا تھا۔ آگ پے چلنے پر مجبور کیا تھا آج بھی اگر میں چپ کا ساتھ ہی دیتا تو شاید مجھے زندگی بھر بچھٹانا پڑنا تھا۔ مجھے آج اس چپ کویت و نابود کرنا تھا۔ مجھے بولنا تھا۔ مجھے اپنا دل کا حال رابعہ کو بتانا تھا۔

ایک بوڑھی انتظار کرتی آنکھوں کا ذکر سنا تھا۔ میں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے رابعہ کی طرف دیکھا، آنکھیں بند کر کے ایک گھونٹ سا بھرا اور حوصلوں کی بلند دیوار کو میں پھاندتا ہوا بول پڑا ”رابعہ..... مم..... میں تم سے بے انتہا پیار کرتا ہوں۔“ جیسے ایک ستارہ ٹوٹ کر آسمان پر چاروں طرف بکھر گیا تھا اور اس کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ میں بول رہا تھا۔ ”رابعہ تمہاری عمر کے اتنے دن نہیں جتنے میں نے تمہارے لئے زخم سہے ہیں۔ میں نے تمہارے لیے غم کا ناقابل عبور کوہ گراں عبور کیا ہے۔ اب میں تمھ چکا ہوں..... رابعہ..... اب تو چلنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ اب تو میرے جسم پر پڑنے والے آبلے بھی جھل چکے ہیں۔ میں ماں سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر تمہیں اپنی دہن بنا کر لاؤں گا..... مگر..... مگر مجھے لگتا ہے.....“ اس سے آگے میں نہ بول سکا۔ میرے حلق میں پیشگی ناکامیوں کا پھندا سا لگ گیا۔ رابعہ حیرت کے عالم میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے بہت انہونی بات کہہ ڈالی ہے۔ اس کی گہری لمبی آنکھیں پوری کی پوری کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پے دکھ تھا، پریشانی تھی، الجھن تھی یا کچھ اور تھا میں اس کے چہرے کا تاثر جان نہیں سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے اور آنسوؤں میں ناقابل فہم چمک بھی۔ آخر ایک بوجھل خاموشی کے بعد رابعہ کے لب ہلے اور وہ بولی۔ ”علی نواز! یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“

”رابعہ جو تم نے سنا ہے میں نے وہی کہا ہے۔ میرے امتحانوں کی کہانی بہت طویل ہے۔ میری چاہت کی مدت برسوں پے محیط ہے۔ سنا نے بیٹھوں گا تو زمانے بیت جائیں گے۔“

رابعہ نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ کتنے ہی قیامت کے لمحے خاموشی میں گذر گئے۔ اچانک مجھے احساس ہوا جیسے رابعہ رو رہی ہے۔ جلد ہی میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے چہرہ اٹھایا تو وہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کے ریشمی بالوں کی ایک لٹ اس کے تلخ چہرے پے چپک گئی تھی ”بہت نحیف آواز میں بولی جسے میں بمشکل سن چکا۔“ علی نواز! مم..... میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں

میرا تہہ خانے میں وہ ساتواں دن تھا۔ رابعہ کی زبانی مجھے بتا چلا تھا کہ بارش مسلسل وقتاً فوقتاً جاری ہے۔ رابعہ کی سخت فکر مندی کی بدولت میرا انگوٹھے کا زخم بہت حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب بھی وہ میرے لیے گرم شور ہے میں مکئی کی روٹی کے ٹکڑے ڈال کر لاتی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اس تر خانے میں بھی مدہم آواز میں سنائی دے جاتی تھی۔ بووی بے خبر سویا پڑا تھا۔ میں مکئی کے شور بے میں ڈوبے ہوئے ٹکڑے کھا رہا تھا کہ اچانک پتا نہیں رابعہ کو کیا ہوا اس نے مکئی کی رکابی میرے ہاتھ سے چھین لی اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں نوالے ڈالنے لگی۔ میرا دل بھرا آیا۔ پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ بے بس آہ کسی بچی کی صورت میرے حلق سے نکلی اور آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔ میرا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔ آج اس وقت موقع تھا میں اپنے دل کا حال رابعہ سے بیان کر سکتا تھا جس مقصد کیلئے میں نے دور دراز کا سفر اختیار کیا تھا شاید اس کی تکمیل کا وقت آن پہنچا تھا۔ ماں سے کیا ہوا وعدہ مجھے شدت سے یاد آنے لگا۔ رابعہ میرے منہ میں نوالہ ڈال رہی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میری آنکھوں میں بے بسی کے آنسو اُمڈ آئے تھے۔ میں اپنے اندر وہ حوصلہ اکٹھا کرنے لگا جو مجھ سے سب اگلا اسکے۔ میری لرزتی آواز جیسے کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

”رابعہ.....“

”ہوں.....“ وہ میرا چہرے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”رابعہ..... تمہیں یاد ہے..... بچپن میں، میں تم سے کس قدر پیار کیا کرتا تھا..... تمہیں گرم ہوا بھی چھو جاتی تھی تو میں پریشان ہو جایا کرتا تھا..... شاہ نواز..... تمہیں پیٹتا تھا اور میں اس سے تمہارا بدلہ لیا کرتا تھا.....“ میرا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔

”ہاں..... علی نواز..... مجھے سب یاد ہے۔ میں بچپن میں شاہ نواز سے پٹ کے تمہارے پاس ہی جایا کرتی تھی۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی اور آنکھیں پٹپٹا کے بولی۔ ”مگر دیکھو..... قدرت کے کام کیسے نرالے ہوتے ہیں۔ بچپن میں شاہ نواز سے میری بالکل نہیں بنا کرتی تھی مگر جوان ہو کر وہی شاہ نواز میرے لئے دنیا کی سب سے عزیز ہستی بن گیا ہے۔“

ایک لمحے کے لئے سماعت شکن بجلی کوندی اور دل کی دنیا میں بھونچال آ گیا۔ رابعہ اپنی رو میں بولی جا رہی تھی۔ ”علی نواز! میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی..... پتہ نہیں یہ کیسا جذبہ ہے جسے میں آج تک کوئی نام نہیں دے سکی..... وہ آنکھوں سے اوجھل ہو تو جیسے میری بصارت بھی کہیں کھو جاتی ہے۔“

شاہنواز سے پیار کرتی ہوں۔“

”مگر رابعہ..... تم مجھے نہ ملیں تو میں برباد ہو جاؤں گا۔“

”علی نواز! تم میرے بہت اچھے..... بہت بھلے دوست ہو..... میں دل کی گہرائیوں سے تمہاری عزت کرتی ہوں۔ مگر..... تمہارے متعلق میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔“

”رابعہ! تمہاری سب باتیں ٹھیک ہوں گی مگر مجھے صرف ایک بات بتلا دو میں اپنے اس دل پر کیا کروں جس نے آج تک تمہارے سوا کچھ سوچا ہی نہیں ہے، تمہارے علاوہ کچھ چاہا ہی نہیں ہے، میں تمہاری محبت اپنے دل سے کیسے کھرچ کر نکال دوں۔“ میں نہایت کرب سے بولا۔

”علی نواز! انسان تمام عمر خواہشوں کے پیچھے بھاگتے گزار دیتا ہے۔ کسی میں اسے منزل ملتی ہے کسی میں ناکامی و حسرت ہاتھ آتی ہے۔ بس یہ دنیا ہے..... وقت گزرتا ہے تو گہرے داغ بھی ختم ہو جاتے ہیں۔“

”رابعہ.....! میرے دل کا داغ تو انٹ ہے۔ اسے تو برسوں کی گرد بھی نہیں چھپا سکی یہ ایسا داغ ہے جو میری موت کے ساتھ ہی ختم ہوگا.....“

”علی نواز! اُدھی جس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس کی موت کے چند برسوں بعد وہ اسے ایسے بھولتا ہے جیسے کبھی شناسائی ہی نہیں تھی۔ یہ سب زندگی کے رنگ ہیں۔ وقت کا پھر دلوں کے جذبات بدل کے رکھ دیتا ہے۔ میں شاہنواز کے ساتھ منسوب ہو چکی ہوں۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہمارے درمیان رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ زمبابوے پہنچتے ہی ہم دونوں شادی کرنے والے ہیں۔“ رابعہ نے یہ الفاظ ادا کیے۔ اٹھی مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی میری نظروں کی حد سے اوجھل ہو گئی۔ چھت کا لکڑی والا دروازہ بند ہوا تو تہہ خانے میں ہر طرف زہری زہر پھیل گیا۔ تہہ خانے کی فضا اچانک ہی اتنی اذیت ناک ہو گئی کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ میرے لیے وہ رات پہاڑ جیسی لمبی تھی۔ رابعہ میرے اور بووی کے لیے پھل رکھ گئی تھی۔ دن چڑھا اور بیت گیا۔ اگلی اذیت ناک رات بھی بیت گئی مگر رابعہ نہیں آئی۔ میں مانی بے آب کی طرح تڑپا، جسم و جاں کی آبیاری کرنے والے سرخ سیال کی جگہ جیسے حسرت و ناکامی رگوں میں دوڑنے لگی۔

وہ اگلے دن کا کوئی پہر تھا۔ میں بے خبر سو یا پڑا تھا جبکہ بووی جاگ رہا تھا۔ دفعتاً اس نے مجھے اٹھایا وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے صورتحال دریافت کرتا میری نظر اس طرح اٹھ گئی جس طرف سے کچھ لوگ سیڑھیاں نیچے اتر رہے تھے۔ ہم دونوں پرالی کے پیچھے اندھیرے

کرنے میں ہو گئے۔ جب نیچے پہنچنے والے لوگوں کے چہرے واضح ہوئے تو میں دنگ رہ گیا۔ جم کیٹی، شاہنواز، گوگی، انکل ہیری کرس اور بوگا لے آنے والوں میں شامل تھے۔ وہ بڑے پراسرار انداز میں آنے سامنے بیٹھے اور دھیمے لہجوں میں گفتگو شروع کر دی۔ بوگا لے کی طرف دیکھ کر میری آنکھوں میں چہم اُچھلنے لگی تھی۔ پیاری بہن رینا کی شکل آنکھوں میں قس کرنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود انہیں روک سکوں گا، پرالی کے پیچھے سے نکلوں گا اور اس دشمن عظیم کوفنا کے گھاٹ اتار دوں گا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پالیا۔

برب وادی کے نواح کے اسی مکان کے تاریک تہہ خانے میں، میں نے ان لوگوں کی جو گفتگو سنی۔ اس نے میری دھڑکنوں میں طوفان بپا کر دیئے۔

جم کیٹی سرداروں والا خود سر پے رکھے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”بوگا لے! ہم پہلے خود پر بت کے پار جائیں گے۔ رابعہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گی..... ہم کالی فوج کا ساتھ دینے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ ہم بوکاشی دیوتا کے حکم کی پاسداری کریں گے مگر رابعہ اسی صورت بوکاشی دیوتا کے سپرد کی جائے گی جب بوکاشی دیوتا ہماری مطلوبہ شے ہمیں عنایت کر دیں گے۔“

”رابعہ! اگر ہمارے ساتھ نہ گئی تو یہ بوکاشی دیوتا کی حکم عدولی ہوگی اور ہمیں معلوم ہے۔ بوکاشی دیوتا حکم عدولی کسی صورت گوارہ نہیں کرتے۔“ بوگا لے اپنا اعصاب زمین پر مارتے ہوئے غصے سے بولا۔ جم کیٹی بھی طیش میں آ گیا۔ ”بوگا لے! تم جانتے ہو..... میں نے بوکاشی دیوتا کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دیں ہیں۔ کتنے سر دیوتا کے حضور پیش کئے ہیں۔ اور تو اور..... اپنی بھانجی کا سر بھی بوکاشی دیوتا کے حکم سے ان کی نذر کیا ہے۔ بھیڑا میں پڑے ہوئے نصف درجن سر میری ہی وجہ سے وہاں بچے ہیں۔“

”یہ سب باتیں تو ٹھیک ہیں مگر.....“ بوگا لے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ”مگر..... اگر کچھ نہیں..... بوگا لے..... ہمیں رابعہ کو بوکاشی دیوتا کے حضور پیش کرنے میں عار نہیں مگر جب تک خزانہ ہمیں نہیں ملتا ہم رابعہ کو بوکاشی دیوتا کے حوالے ہرگز نہیں کریں گے۔“ اس نے شاہنواز اپنے مخصوص لہجے میں بولا تھا۔ وہ بات، وہ لہجہ دنیا کا غلیظ ترین لہجہ تھا جوڑ کی شاہنواز کو اپنی ہالان سے زیادہ پیار کرتی تھی..... وہ اس کی زندگی اس کی عصمت کو چند سنہری سکوں کے بدلے فروخت کر رہا تھا۔

بوگا لے شاہنواز کا فیصلہ کن لہجہ سن کر بولا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے۔ تم لوگ آج ہی پر بت کے پار



روانہ ہو جاؤ..... میں کل تک نکل پڑوں گا۔“

”مگر تم کو تو ہمارے ساتھ چلنا تھا؟“ اس دفعہ گوگی نے مداخلت کی۔

”مجھے سردار رواڈو کے محل میں موجود لوگوں کو روانہ کرنا ہے جو نبی محل خالی ہوا۔ میں بھی نکل پڑوں گا۔“ بوگا لے اٹھتے ہوئے بولا اور پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گیا۔

انگل ہیری اپنی جگہ سے اٹھے اور ٹپلتے ہوئے اس ڈھیر کی جانب چلے آئے جس کے دوسری جانب ہم دونوں چھپے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے سانس تک روک لیے تھے۔ انگل کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو خطرناک صورتحال پیدا ہو سکتی تھی۔ ہم کھسک کر کچھ اور پیچھے ہٹ گئے۔ انگل جہل قدمی کرتے ہوئے ڈھیر کی پچھلی جانب آگئے۔ ان کی نگاہ بائیں جانب تھی اگر وہ اپنے داہنے طرف دیکھتے تو ہم ان کی نظروں کی رینج میں آجاتے پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انگل نے دائیں طرف دیکھا اور ان کی نگاہ ہم پر جم کر رہ گئی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یوں لگا وہ ابھی شور مچائیں گے اور سب لوگ ان کے پیچھے چلے آئیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انگل جیسے آئے ویسے واپس پلٹ گئے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے بووی جان چکا تھا کہ اس کی محبوبہ میگی کا قاتل اس تہ خانے میں اس سے چند قدموں کی دوری پر بیٹھا ہے۔ اس نے جم کیٹی کی طرف بڑھنے کے لیے کئی دفعہ اپنا ہاتھ مجھ سے جھڑانا چاہا تھا مگر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہی رہی اور میری خاموش آنکھوں میں اس کے لیے ایک تنبیہ ہی رہی۔

ان لوگوں کی محفل تقریباً آدھ گھنٹے بعد برخاست ہوئی۔

اس کے بعد واقعات بڑی تیزی کے ساتھ پیش آئے۔ اسی رات پچھلے پہر رابعہ آٹھ پہر کے بعد نیچے آئی اور کھانا رکھ کر ہم دونوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا وہ بہت دیر روتی رہی ہے۔ میں نے رابعہ سے کوئی بات نہیں کی..... وہ باتیں کرتی رہی اور بووی ہی اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ میں نے بووی کو سمجھا دیا تھا کہ رات والی میٹنگ کے بارے میں رابعہ کچھ پتہ نہیں چلنا چاہئے۔

رابعہ تقریباً پون گھنٹہ بیٹھی رہی وہ کن اکھیوں سے میری طرف دیکھتی رہی مگر میں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ میری بے پرواہی کا اسے ٹھیک ٹھاک شک لگا تھا۔ وہ مزید ایک گھنٹہ وہاں بیٹھی رہی۔ وہ مجھ سے بھی باتیں کرتی رہی جس کا میں ”ہوں“۔ ”ہاں“ میں جواب دیتا رہا۔ رابعہ جب وہاں سے اٹھ کر گئی تو بہت دکھی تھی۔ مجھے اس کے دکھی ہونے پر خوش ہونا چاہئے تھا مگر میرا من غم

بہر گیا۔

اگلے دو دن بھی رابعہ نیچے آتی رہی مگر کھانا رکھ کر وہ چلی جاتی۔

یہ دوسری رات کے آخری پہر کا ذکر ہے۔ میں چپٹ لیٹا ہوا تھا۔ بادلوں کی مدہم گڑگڑاہٹ بانی دے رہی تھی۔ یہ پتا نہیں کیسی جھڑی تھی جو ڈیڑھ ہفتہ گزر جانے کے باوجود وقتاً فوقتاً جاری تھی۔ یہی بھی میرے برابر میں لیٹا اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اچانک اوپر والا دروازہ کھلا سیڑھی لگی اور کوئی نیچے آنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ ہیری کرس تھا۔ بووی اندھیرے کو نے میں چھپنے کے لیے بڑی سے اٹھا مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھالیا۔ بووی میری طرف الجھن سے دیکھنے لگا۔ انگل بڑی آہستہ قدموں سے ہمارے پاس چلے آئے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور بولے۔ ”علی از! کیسے ہو.....؟“ ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

”انگل..... جیسا بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔“ مجھے انگل ہیری کا کل سے انتظار تھا۔

”علی نواز! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لئے میں صرف تم سے کام کی بات کروں۔ میں یہاں اپنی جان پر کھیل کر پہنچا ہوں اور تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری جان کو یہاں سخت خطرہ ہے۔ چند دن پہلے سردار رواڈو کے محل میں جو بیرونی طرف سے حملہ ہوا تھا وہ ”بیلی قبیلے“ کے دارحزیر و اور اس کے حواریوں کی کارستانی تھی وہ لوگ اپنا کوئی پرانا حساب چمکتا کرنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کا مقصد تمہیں زندہ یا مردہ گرفتار کرنا بھی تھا۔ وہ لوگ تمہاری جان کے دشمن تھے۔ وہ تمہارے خون سے اپنی انتقام کی بیاس بجھانا چاہتے ہیں۔ ”بیلی قبیلے“ کے حملے سے دونوں ف بھاری جانی نقصان ہوا ہے۔ بوکاشی دیوتا کے سپاہیوں نے ایک دن تو ”بیلی قبیلے“ کی فوج کو دھکیل کر برب وادی کی حدود سے باہر نکال دیا ہے مگر وہ زیادہ دیر اپنا دفاع نہیں کر سکیں گے۔ حزیرو اپنی رانی فوجی طاقت برب وادی کی بیرونی سرحد پہ اکٹھی کر رہا ہے۔ وہ محل پر آخری اور فیصلہ کن وار لڑنا چاہتا ہے۔ ادھر بوکاشی دیوتا نے اپنی تمام فوجی طاقت کو پربت کے پار طلب کر لیا ہے۔ پربت پار ایک بہت بڑا اور خون ریز معرکہ ہونے والا ہے۔ بوکاشی دیوتا کا حکم ہے کہ ”بیلی فوج کو اس کے ماپر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ انہیں ہتھیاروں سے مارنے کی ضرورت نہیں۔ میری غیبی تیس انہیں بہا کر ان کا نام و نشان تک مٹا دیں گی۔“

”انگل ہیری! کیا بوکاشی دیوتا خدا ہے.....“ میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

”بیٹا! میں بھی ان چیزوں کو نہیں مانتا مگر تم سن کر حیران ہو گے کہ میں بوکاشی دیوتا کی غیبی

نہ تہا ہری باتوں سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ رابعہ ہی وہ لڑکی ہے جس کی خاطر تم پاکستان سے بہاؤے چلے آئے ہو۔“ جس وقت انکل ہیری کرس یہ باتیں کر رہے تھے مجھے ان کی آنکھوں میں وہی شفقت بھری چمک نظر آرہی تھی جو اکثر مجھے ماں کی آنکھوں میں نظر آیا کرتی تھی۔ اچانک پتا نہیں مجھے کیا ہوا میں خود پے اپنا اختیار کھو بیٹھا۔ میری آنکھوں سے خاموش آنسو لڑھکتے چلے گئے۔ میں بوجھل لپچے میں بولا۔ ”انکل! آپ نے میرے بارے میں بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انکل..... رابعہ مجھ سے پار نہیں کرتی..... وہ..... وہ.....“

”بس..... بیٹا..... اتنی جلدی ہمت ہار بیٹھے۔ میں تمہیں سمجھانے کیلئے صرف ایک چھوٹی سی ٹال دوں گا پھر مجھے واپس جانا ہے۔ میں نے مدثر سے بھی تمہارے بارے میں بات کی تھی۔ اس نے ارے آگے بھی وہی رونا روایا تھا جو تمہارے سامنے رویا تھا یہی کہ رابعہ کسی کی نہیں سنتی اسے شاہنواز نے علاوہ کچھ نہیں سوچتا..... مگر بیٹا تم اپنی کوشش اسی طرح جاری رکھو تمہیں اپنا پیار بھی حاصل کرنا ہے ایک بوڑھے باپ کی برسوں کی پریشانی کو بھی حل کرنا ہے۔ تم مدثر کو اپنے پیار کے زور پے اس کی دادا پس لوٹا سکتے ہو۔“

”مگر انکل..... میں اب تھک چکا ہوں..... میری ہمت جواب دے چکی ہے.....“ میں سسک پڑا۔ انکل ہیری کرس نے اپنا چشمہ اتار کر ہاف کر کے دوبارہ لگایا اور شہادت کی انگلی میرے انکے کرتے ہوئے بولے۔ ”علی نواز! شکاری دنیا میں اکثر اوقات شکاری رستہ بھٹک جاتا ہے پھر وہ بانوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ پانی کی تلاش اسے مگر نگر گھماتی ہے۔ وہ پیاس کی شدت سے قریب لڑکھو کر جنگل کے آخری کنارے پر پہنچ جاتا ہے، سامنے دیکھتا ہے تو پہاڑ کی وجہ سے آگے رستہ بند ہے، وہ مایوس اور ناامید ہو کر وہیں ریڑھیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا ہے مگر وہ بے چارہ یہ نہیں جانتا کہ بہت سے اس پار زندگی کی لطافت سے مزین جھاگ اڑاتا پانی اس کا منتظر تھا۔ اگر وہ تھوڑی سی منت اور کر لیتا تو پانی تک پہنچ جاتا اور زندگی پالیتا۔ علی نواز! تمہیں باہمت اور سمجھدار شکاری بننا ہے نہیں بہت کے پار پہنچنا ہے۔ تمہیں زندگی کو پانا ہے، تمہیں اپنی رابعہ کو پانا ہے..... نہ صرف اپنی بہت کے لیے بلکہ ایک بوڑھے شخص کی خوشی کے لیے۔“

انکل ہیری کی باتوں نے اچانک میرے اندر جیسے توانائی بھردی۔ مجھے یاد آیا میں نے انکل مدثر سے وعدہ کیا تھا کہ رابعہ مجھے ملے ملے میں ان کو ان کی بیٹی ضرور واپس لوٹا کر جاؤں گا۔ میں نے وعدہ کیا تھا اور اب اس وعدے کو ایفا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ انکل ہیری مجھے اور

طاقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا ہوں۔ تم یہاں اتنی دور بیٹھے جو کچھ کر رہے ہو..... بوکاشی دیوتا کو اس کا علم ہے۔ وہ ایک پراسرار اور غیر معمولی انسان ہے۔ تلوار اس کے جسم پے لگنے کے بعد پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گولی اس انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”انکل! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں.....؟“ میں انکل کی بات پے ہنس دیا۔

”علی بیٹا! ادھر میری طرف دیکھو.....“ انکل عینک کے شیشوں کے پیچھے سے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ بولے۔ ”تم میرے بیٹے کی طرح ہو..... مجھے تم سے ایک طرح کی الفت ہو گئی ہے۔ شاید..... شاید اسی لیے اپنی جان پر کھیل کر یہاں پہنچا ہوں۔ بیٹا مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہیں اس دوزخ سے نکالنا چاہتا ہوں..... میری باتیں ذرا غور سے سنو اور انہیں مذاق مت سمجھو۔ بوکاشی دیوتا واقعی غیر معمولی طاقتوں کے مالک انسان کا ایک نام ہے۔ اس نے اتنی دور بیٹھے ہمارے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں اس عجیب وغریب انسان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ رابعہ آج تک بہت کے پار نہیں گئی مگر بوکاشی دیوتا وہاں بیٹھا اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اس نے رابعہ کا تمام ناک نقشہ ہمارے سامنے بیان کر دیا ہے اور اس نے یہاں تک بتایا کہ رابعہ کے داہنے پاؤں کی درمیانی انگلی کے نچلی طرف ایک تل ہے۔ بوکاشی دیوتا بری طرح رابعہ پر فدا ہو چکا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہے۔ وہ اس کے بدلے جم کیٹی کو اس کروڑوں ڈالر مالیت کے دینے تک پہنچانے پر راضی ہو گیا ہے۔“ میں انکل ہیری کی چشم کشا اور حیرت انگیز کھٹھان رہا تھا اور میرا دماغ گھومتا جا رہا تھا۔

”بیٹا! تمہارے پاس ایک زبردست موقع ہے۔“ انکل ہیری نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”کل امادس کی رات ہے اس رات میں بوکاشی دیوتا کی غیر مرئی طاقتیں سو جاتی ہیں۔ تم رابعہ کو لے کر یہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔ یہ رات تمہارے لیے پہلا اور آخری موقع ہے تم اتنے وقت میں کیبرو کا یہ پراسرار جنگل پار کر کے زمبابوے پہنچ سکتے ہو اور اگر تم فرار ہونے میں ناکام ہو جاتے ہو تو یاد رکھو رابعہ تمہارے لیے بھولی ببری داستان بن کے رہ جائے گی۔ تمہارا پیارا دھورارہ جائے گا۔“

مجھے انکل ہیری کی آخری بات پر شدید جھٹکا لگا۔ ”انکل آپ.....“

”ہاں بیٹا! میں جانتا ہوں تو رابعہ کو خود سے بھی بڑھ کر چاہتا ہے۔ تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ مجھے کیسے پتا چلا تو بیٹا اس کا جواب یہ ہے کہ جس رات پڑاؤ میں تمہیں تیز بخار ہو گیا تھا تو میں تمام رات تمہارے سر ہانے بیٹھا رہا تھا۔ تم بے ہوشی میں بار بار رابعہ کا نام لے رہے تھے اور بہت کچھ بول رہے

ہنم کر کے میں اپنی پیاری بہن رینا کے قتل کا بدلہ چکا دیتا اور ساسا کو اس کا شوہر بالی واپس مل جاتا۔  
لی جو بہادر ہونے کی پاداش میں پرست کے پار پہنچا دیا گیا تھا۔

گھوڑے پے بیٹھے ہوئے بار بار رابعہ میری طرف دیکھ رہی تھی شاید میرے چہرے کے  
اثرات جاننے کی کوشش کر رہی تھی مگر میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ دور بلند پہاڑ کی طرف سیاہ بادل  
میں دھند کی مانند لگ رہے تھے۔ میری منزل اس پہاڑ کے پار تھی۔ ہم تنگ گلیوں اور پڑے رستوں  
سے گزرتے ہوئے تقریباً آدھے گھنٹہ میں بھوری چٹانوں کے پاس پہنچ گئے۔ سارے راستے ہمارا  
کہہ کسی ذی روح سے نہیں ہوا البتہ راستے میں جگہ جگہ آدھ چلی کچلی اور کئی پھنی لاشیں پڑی ہوئی تھیں  
شاید بوکاشی دیوتا اور حزیرو کی فوج کے درمیان جنگ کی باقیات تھیں۔ بھوری چٹانوں سے جب  
اسا واپس مڑنے لگی تو میں اس کا چہرہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ آنسو بہا بہا کر اس کی آنکھیں سرخ ہو چکیں  
میں۔ ساسا نے میرے قریب ہو کر کہا۔ ”علی نواز! تم جہاں بھی رہو..... خوش رہو..... دیوتا ہر جگہ  
ہاری حفاظت کریں۔“ اس نے اتنا کہہ کر اپنا چہرہ پھیرا اور واپس دوڑتی چلی گئی۔

بجلی کی ایک کڑک نے جنگل کے تاریک گوشے روشن کر دیئے۔ اس دودھیا روشنی میں میری  
ٹھوس نے دو منظر دیکھے ایک منظر میں ساسا دور سر پٹ دوڑی جا رہی تھی اور دوسرے منظر میں موت  
پانچ تھیں۔ اس کے قریب جنگلی ہم سے صرف بیس گز کی دوری سے گھات لگائے کھڑے تھے۔ ان  
نے مخصوص خود سے اندازہ ہو رہا تھا وہ بجلی قبیلے کے لوگ ہیں۔ وہی بجلی قبیلہ..... جس کا سردار  
زیرو میری جان کا دشمن تھا۔ بجلی قبیلے کے جنگیوں نے ہمیں دیکھتے ہی اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔  
مانے تلوار کھینچ کر نیام سے باہر نکال لی۔ بووی نے بھی میری تقلید کی۔ وہ بھی حالات کی نزاکت  
ان چکا تھا۔ جلد ہی ”بجلی فوج“ کے سوار ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ وہ برہنہ تلواریں لیے ہم پر ٹوٹ  
آ میری اور بووی کے تلواریں ایک ساتھ اٹھیں اور چلتی چلی گئیں۔ میں دو گھوڑوں کو کاروبار زخم لگا  
را بھی تیسرے کی طرف ہونے ہی والا تھا کہ رابعہ کی تیز چیخ میری سماعت سے ٹکرائی میں نے مڑ کر  
لہا تو ایک جنگلی رابعہ کو گھوڑے سے نیچے اتار چکا تھا۔ اس نے تلوار رابعہ کی گردن سے لگا رکھی تھی  
لہا تو دور ان دوسرے جنگلی نے پیچھے سے آ کر رابعہ کو دبوچ لیا۔ میں بڑی تیزی سے رابعہ کی طرف  
ہا مگر دو گھوڑوں نے میرا راستہ روک لیا۔

رابعہ کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور جنگلی رابعہ کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے جکڑ رہا تھا۔ پتا  
لا چانک کیا ہوا، میرا داغ گھوم گیا، ہاتھ میں پکڑی تلوار بجلی کی سی رفتار سے چلنے لگی اور میرے منہ

بووی کو اور بھی ضروری معلومات دیتے رہے اور پھر چپکے سے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اگلا سارا دن  
ہم نے پلاننگ میں گزار دیا۔ انکل ہیری نے ساسا کو ساتھ ملا لیا تھا اور ساسا ہی نے ہمیں بھوری  
چٹانوں سے پار لے کر جانا تھا۔ اگلے روز جب ساسا انکل ہیری کے سمجھائے ہوئے منصوبے کے تحت  
نیچے جنگلی سامان پہنچانے آئی تو وہ خاصی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

”علی نواز! مجھے معاف کر دو، اپنے بچے کو بچانے کے لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔“

”کیسا جھوٹ..... ساسا.....؟“ میں بولا۔

”یہی کہ تم رینا کے قاتل ہو.....“

”چھوڑو ان باتوں کو، جس کی غلط فہمی دور کرنا تھی ہو چکی ہے۔ باقی مجھے کسی کی پروا نہیں.....“

”تم رابعہ کی بات کر رہے ہو ناں.....؟“

”ہاں ساسا.....“

”علی نواز! رابعہ بہت اچھی لڑکی ہے..... اسے اپنا لو.....“

”اچھا..... تم کہہ رہی ہو..... تو تمہاری بات مان لوں گا۔“ میں مسکرانے کی کوشش کرنے  
ہوئے بولا۔ ساسا مجھے آئندہ منصوبے کے بارے سمجھانے لگی۔ رابعہ کو یہاں سے فرار کے بارے میں  
قطعی لاعلم رکھا گیا تھا۔ اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ ہم لوگ جم کینی اور شاہنواز کے پیچھے پرست کے  
پار جا رہے ہیں۔

(جم کینی، شاہنواز، گوگی، انکل مدثر اور ہیری کرس کل رات کے ہی پرست کے پار جانے کے  
لیے روانہ ہو چکے تھے۔)

اگلی رات جب ہم منصوبے کے تحت تہہ خانے سے باہر نکلے تو دھیمی دھیمی بارش ہنوز جاری  
تھی۔ ساسا کی اندھی بوڑھی ساس اندرونی کمرے میں لیٹنی ہوئی تھی۔ ساسا مجھے، رابعہ اور بووی کو لے  
کر خاموشی سے گھر سے باہر نکل آئی۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا، پتھریلی زمین پر بھی پانی اور کچھ نظر آ رہا تھا۔ ہم تینوں اپنے  
اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ساسا ہمارے آگے آگے پیدل دوڑ رہی تھی۔ جو منصوبہ میں اپنے ذہن میں  
بنا چکا تھا اس کے بارے میں میرے تینوں ہمراہی نہیں جانتے تھے۔ میں نے تمام رات بہت سوچا تھا  
اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مجھے رابعہ کو زہمباوے تک پہنچا کر واپس ادھر آنا تھا۔ پرست کے پار جانا  
اس طرح میرے تینوں کئے ہوئے وعدے پورے ہو جاتے۔ رابعہ انکل مدثر کو مل جاتی، اپنے دشمنوں

یاد رہی نہیں بلکہ خود کشی گئی جاتی۔ میں نے تیزی سے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا۔

رابعہ نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کی ”سمندری“ آنکھوں میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ میں بووی اور رابعہ دونوں سے مخاطب ہو کر بولا اور گھوڑے کو ایڑ لگا

لی۔ ایک دریا پار کر کے ہم دوسرے کنارے پر آ گئے۔ مگر ہم بہت دیر کر چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فوج کا اگلا دستہ ہمارے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ ہمارے گھوڑے سر پٹ دوڑے جا رہے تھے اور بیلی

ج کا دستہ ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ دوڑ تقریباً دس منٹ تک جاری رہی پھر بیلی فوج کے ایک سالار نے رابعہ پر تلوار کا ایک اوچھا وار کیا جو رابعہ نے اپنی تلوار پے روکا جبکہ دوسرا وار گھوڑے کی ٹانگ پے

گھوڑا گرا اور رابعہ لڑھکتی ہوئی دوڑ جا گری۔ میں نے بھاگتے ہوئے گھوڑے کو موڑا اور رابعہ کی

ف بڑھا۔ ایک گھوڑا سوار گھوڑے سے نیچے اتر آیا تھا اور رابعہ کی کلائی تھام کر اسے کھینچ رہا تھا۔

بے تلوار کے ایک ہی وار نے اس کا بازو کہنی تک کاٹ کے رکھ دیا۔ میں جست لگا کر نیچے اتر اور

بد کو تھام لیا۔ رابعہ میرے بازو کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو میرے

اروں جانب گھوڑا سوار کھڑے تھے۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ ایک گھوڑا سوار نے

لوڑے پر بیٹھے بووی پر ٹانگ جھائی اور وہ لڑھک کر گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ نیچے کھڑے جنگلی نے

اپنی بووی کی گردن پے رکھ دیا۔ اسی لمحے ایک بھاری جسامت کا جنگلی گھوڑوں کے درمیان سے چلتا

اٹھارے پاس آن کھڑا ہوا۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا وہ

برو تھا..... وہی حزیرو جس نے جنگل میں میرے پیٹ میں تلوار اتارنا چاہی تھی مگر سردار روبان نے

اس کے اشارے سے اسے منع کر دیا تھا۔ اس وقت وہ میرے سامنے بیلی قبیلے کے سردار کے روپ

ماکھڑا تھا اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور آنکھ میں قہر کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس نے ایک

رکامہ میرے جبرے پر رسید کیا اور میرے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا۔ ”تیرا یوم حساب آج

نا اور اسی وقت ہوگا..... میں نے دیوتا کے چروں میں بیٹھ کر قسم کھائی تھی کہ جب تک تجھے ذلیل

ت نہیں ماروں گا، شادی نہیں کروں گا۔ آج..... وہ وقت آ گیا ہے۔ تیری تلاش میں، میں نے

وقت ضائع کیا ہے۔ اپنے بہت سے بندے مروائے ہیں۔ اب تیرے مرنے کا وقت ہے، میں

ایسی موت دوں گا کہ یہ دھرتی بھی پناہ مانگے گی۔“

میں نے نگاہ اٹھائی تو میرے سامنے سینکڑوں کی تعداد میں بیلی قبیلے کے جنگلی کھڑے تھے۔ ان

اسے ایک سے بڑھ کر ایک میرے خون کا پیا سا تھا۔ حزیرو نے تلوار نیام سے نکالی اور میری طرف

سے چنگھاڑیں بلند ہونے لگیں۔ بووی بھی اس نازک وقت میں حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا تھا۔

میری تلوار نے دونوں گھوڑا سواروں کو نیچے گرایا تو میں رابعہ کی جانب بڑھا اور جنگلوں پر تلوار چلاتا چلا

گیا۔ رابعہ بھی پٹ پٹاتی آنکھوں سے میری جانب دیکھے جا رہی تھی۔ وہ منظر میں آج تک نہیں بھولا

رابعہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں اور بلی چمکی تھی۔ پتا نہیں آسانی بجلی کا کمال تھا یا شاید رابعہ کی

آنکھوں کا اس کی آنکھوں کی پتلیاں نیلے رنگ کی نظر آنے لگی تھیں..... نیلی..... نیلے سمندر جیسی جس

میں بڑے بڑے دیوبیکل جہاز ڈوب جائیں۔ رابعہ کی نظروں کے سامنے میں نے چھ کے قریب

جنگلوں کو خون چاٹنے پر مجبور کر دیا، تین کے قریب بچ جانے والے جنگلی بدحواسی میں واپس بھاگے

رابعہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ بووی نے خوشی سے ہاتھ نچا کر ایک نعرہ بلند کیا مگر میری نگاہ اس

طرف جم کر رہ گئی تھی جس طرف وہ جنگلی بھاگے تھے۔ اس جانب سے ایک دھول اڑ رہی تھی۔ ایک

عفریت نمودار ہو رہا تھا۔ بارش کی دھندلی فضا کے پس منظر میں ایک طوفان بلاخیز اپنی تمام تر حشر

سامانیوں کے ساتھ اٹھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ دس بیس نہیں، سینکڑوں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں جنگلی تھے۔

ان کے گھوڑے پانی کے چھینے اڑاتے زمین دھلاتے ہمارے سروں پر چڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ

یقیناً بیلی قبیلے کا عفریت تھا جو میری جان کے درپے تھا۔ وہ میرے جسم کے کٹنے کر کے اپنے

”جوانوں“ کی موت کا حساب لینا چاہتا تھا۔ اب میرے علاوہ بووی اور رابعہ بھی یہ خوفناک منظر دیکھ

چکے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ رابعہ خوفزدہ نظر آنے کی بجائے کافی مطمئن نظر آ رہی تھی۔ وہ غیر

محسوس انداز میں اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے قریب لے آئی تھی اور اس نے دھیرے سے اپنا ہ

میرے کندھے پر پے دھر دیا۔ میں سر تاپا لرز کے رہ گیا۔ رابعہ کی آنکھیں بند تھیں اور وہ پرسکون سی جے

میرے کندھے پر سر رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے دھیرے سے اسے پکارا وہ خاموش رہی، دوسری اور

تیسری دفعہ پکارنے پر وہ آہستہ سے بولی۔ ”علی نواز! کیا موت کبھی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟“ اس

کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر میرے کندھے میں جذب ہو گئے۔

رابعہ کے سوال پر یوں لگا جیسے میرا تمام وجود بھک کر کے اڑ کر فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ مجھے

اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نہایت سہانا خواب دیکھ رہا ہوں

ابھی آنکھ کھولوں گا اور سب ختم ہو جائے گا۔ میں نے گھوڑا موڑنا چاہتا تو رابعہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے

تھام لیا۔ رابعہ کے لہجے، اس کے رویے نے مجھے وہ حوصلہ دیا تھا کہ میں اس وقت بڑے سے بڑے

طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار تھا مگر اس وقت جو قیامت اٹھی چلی آ رہی تھی اس سے ٹکرا

بڑھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رابعہ نے مضبوطی سے میرا کندھا بھینچا تھا اور تھوڑا سا آگے ہوئی تھی۔ یکا یک ایک جانب سے نامانوس سا شور بلند ہوا اور سب کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئیں۔ ایکدم ہی جنگیدوں کے چہرے بے خوف کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ سارے لشکر میں ایکدم بے چینی پھیل چلی۔ پھر افراتفری مچ گئی۔ جنگی اندھا دھند ایک جانب کو گھوڑے دوڑانے لگے۔ چیخوں سے کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے سامنے دھیان دیا تو حیران رہ گیا۔ سردار حزیرو سمیت کوئی جنگی یہاں قریب موجود نہیں رہا تھا۔ میں بھی حالات کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ بووی کی خوف میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ”پانی!.....!..... سیلاب..... بھاگو.....“

میں نے اپنے داہنے طرف دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ایسا عجیب اور خوفناک منظر میں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا۔ تیس بتیس فٹ اونچی پانی کی ہیبت ناک لہر چٹتی چٹکھاتی، اونچے نیچے درختوں، کھیتوں، کھلیانوں، گھروں، مکانوں کو لگتی چلی آ رہی تھی۔ پانی کے رستے میں آنے والی ہر چیز نہیں ہوتی جارہی تھی۔ یہ لہر یہ موت کی روانی ہم سے سو قدم کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا جنہیں فرار ہونا تھا وہ دوڑ پڑے تھے۔ رابعہ نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ ہم دونوں نے آنکھیں بند کر لیں پھر جیسے اچانک ہوا کا ایک تند جھونکا آیا۔ ہمارے پیر زمین سے اکھڑے اور کوئی غیر مرئی طاقت جیسے ہمیں ہواؤں میں اڑائی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف لے جانے لگی۔ موت کی چیخیں، حرنے والوں کے نوے، بادلوں کی گرجا، شوریدہ سرلہروں کا شور یہ سب سماعت میں گڈمڈ ہو گیا تھا۔ یہ سب پتا نہیں کتنی دیر چلتا رہا آدھا گھنٹہ پون گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ وقت۔ میں نے خود کو اس وقت ہوش میں محسوس کیا جب میرے پاؤں کے نیچے زمین آ موجود ہوئی۔ رابعہ کے ہاتھ ہنوز میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ پہاڑ کا ایک ٹیلہ تھا جس پر بے رحم پانی نے رحم کی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیں پٹن دیا تھا۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا وہ ہوش میں تھی اور میری ہی طرف دیکھ رہی تھی وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے میں اتنی جلدی مروں گی نہیں! علی نواز.....“ یہ دوسرا تیسرا واقعہ تھا جس نے مجھے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ رابعہ کے رویے کی مثبت تبدیلی نے میری دھڑکنوں کو ایک نئی لذت سے آشنا کیا تھا۔ میں بڑی محبت سے بولا۔ ”رابعہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی کی طرف سفر کرنا ہے۔“

ہم گرتے پڑتے پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ میں مطمئن تھا مگر بووی کی کشیدگی کبھی کبھی میرے دل پے کچوکا لگا رہی تھی اور میرے دل سے ایک ہی دعا نکل رہی تھی میرے دوست

جہاں کہیں بھی ہو..... خدا کرے صحیح سلامت ہو۔ ہم پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچنے والے تھے کہ اچانک ایک طرف سے ایک جنگلی برآمد ہوا اور مجھ پر تلوار چلانے لگا، میں نہتا تھا، میں جھکائی دے کر اس کے وار سے بچنے لگا مگر میں ایسا کب تک کر سکتا تھا کسی بھی لمحے تلوار میرے جسم کو چھید کر سکتی تھی۔ میں مسلسل تلوار کے وار سے بچ رہا تھا اور خالی وار پتھروں سے ٹکرا کر چنگاڑیاں چھوڑ رہی تھی۔ اچانک حملہ آور تلوار چلاتا چلاتا رک گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوڑ کر گر گئی۔ وہ نیچے گرا تو پیچھے مجھے رابعہ کھڑی نظر آئی۔ رابعہ نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا جس سے وہ زخمی ہو کر گیا تھا میں نے آگے بڑھ کر حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے جھکا سا لگا۔ وہ سردار حزیرو تھا۔ اس کا خود کہیں پانی میں بہہ گیا تھا اگر وہ سر پر موجود ہوتا تو شاید وہ اس حملے سے محفوظ رہتا۔ میں اپنا چہرہ اس کے قریب لے گیا فون اس کے سر سے جھرا جھر بہہ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں نرم لہجے میں بولا۔ ”حزیرو! میری تمہارے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں تھی پھر تم میری جان کے درپے کیوں تھے.....؟“

وہ میری بات سن کر خاموش رہا۔ میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ دیا اور بولا۔ ”حزیرو! میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ میں تمہیں اتنی جلدی مرنے نہیں دوں گا۔ میری بات سن کر وہ مسکرا دیا اور بولا۔ ”نہیں..... دشمن..... اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب میں زندہ ہی نہیں رہنا چاہتا۔ میری ساری فوج پانی میں بہہ چکی ہے، میں برباد ہو چکا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے پنڈلی سے خنجر اتارا اور لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ”تم ایک..... اچھے دشمن ہو..... اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم پر بت کے بار..... اس پار چھائی ظلمت کی دھند کو ختم کرنے کی کوشش کرو، اگر تم ایسا کر گزرے تو دیوتا تم پر بہت خوش ہوں گے۔ ظلم کی چکی میں پے ہوئے لوگ تمہیں دعائیں دیں گے۔“

حزیرو نے یہ الفاظ ادا کیے اور اپنا خنجر اپنی شہرگ پے چلا لیا۔ گرم ابلتا ہوا خون اچھلا اور اس کے کئی قطرے میرے چہرے پے پڑے۔ میں حیرت زدہ سا اپنے اس جانی دشمن کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا جس کی آنکھیں اب ساکت ہو چکی تھیں۔ رابعہ مجھے جھنجھوڑ رہی تھی اور میرا ذہن گھن چکر بنا ہوا تھا۔ انکل ہیری کرس کی تہہ خانے میں کہی ہوئی بات میرے دماغ پے تھوڑے برسا رہی تھی۔ بوکاشی کی طلسمی طاقت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ بوکاشی دیوتا کا کہنا ہے کہ ”بیلی فوج کو ہتھیاروں سے مارنے کی ضرورت نہیں۔ میری غیبی طاقتیں انہیں بہا کر ان کا نام و نشان تک مٹا دیں گی۔“ غیر ارادی طور پر میرا دھیان رابعہ کے سفید دودھیا پاؤں کی طرف چلا گیا۔ میں اس کے پاؤں

وہ بڑا عجیب اور سحر انگیز منظر تھا۔ صبح کاذب کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ میرے دونوں طرف بلند دیوہیکل سیاہ چٹانیں تھیں اور ان چٹانوں کے درمیان دریا بڑی سبک رفتاری سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ تیسری یا چوتھی آواز پر ایک چیز مجھ سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر سطح آب سے نمودار ہوئی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا تو میرے دل کی کلی کھل اٹھی۔ میری زندگی..... میری رابعہ بائیں اٹھائے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ خوشی ایک سسکاری کی صورت میں میرے سینے سے خارج ہوئی اور میں بڑی تیزی سے بہتا ہوا رابعہ تک جا پہنچا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ رابعہ زندہ اور صحیح سلامت تھی۔ رابعہ نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔ اس کا عارض میرے بازو سے لگا ہوا تھا اور صبح کاذب کی دھندلی فضا میں اس کے نتھنوں اور منہ سے بھاپ نکلتی صاف نظر آرہی تھی۔ پانی ہمیں نامعلوم سمت بہاتا چلا جا رہا تھا ہم نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ میری نگاہیں رابعہ کی نیلگوں آنکھوں پر جم کر رہ گئیں تھیں۔ چاروں طرف بلند سیاہ چٹانیں، اطراف میں گھنی جھاڑیاں اور بلند سنہری گھاس اور سرکنڈے اور درمیان میں بہتا ہوا دریا اور دریا کی روانی میں بہتے ہوئے دو اجسام۔ میں نے رابعہ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اٹل لہجے میں بولا۔ ”رابعہ! میں صرف اور صرف تمہارا پیار پانے کے لیے اتنی دور سے اپنا وطن چھوڑ کر آیا تھا۔ میرے یہاں آنے کے پیچھے اور کوئی غرض پوشیدہ نہیں تھی۔ رابعہ میں تمہارے بغیر ادھر ہوں۔ تمہارے بغیر نامکمل ہوں۔ اگر تم مجھے نہ ملیں تو شاید میں کبھی شادی نہ کروں۔ مجھے اور مت ستاؤ رابعہ..... میرا اور امتحان مت لو..... میں..... میں جانتا ہوں تمہارے دل کے کسی کونے میں، میرے لیے پیار کا گوشہ موجود ہے۔ بولو جواب دو..... تم..... تم بھی کسی نہ کسی درجے میں مجھ سے پیار کرتی ہو..... بولو کرتی ہو..... بولو رابعہ جواب دو.....“ میں رابعہ کو تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

اس کی شفاف آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور ان آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس کے ہونٹ لرزے پھرائے اور کوئی جملہ ادا ہوا جسے میں نہ سن سکا۔ اچانک پانی کی روانی انتہائی تیز ہو گئی تھی اور اس کا شور بھی بہت بڑھ گیا۔

میں حلق کے بل چیخا۔ ”رابعہ! مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تم کیا کہہ رہی ہو.....“ رابعہ چیخ چیخ کر کچھ بولتی جا رہی تھی مگر کوئی لفظ میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بس پانی کے تھپڑے تھے اور ان کی مہیب گونج تھی۔ پھر اچانک میرے ہاتھوں پر بہت سا وزن آ پڑا۔ پہلے رابعہ کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹا۔ میں چیخ رہا تھا اور رابعہ رابعہ پکار رہا تھا۔ وہ بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر سب پانی کے بے

تھام کر وہ قتل تلاش کرنے لگا جس کے بارے میں بوکاشی دیوتا نے وہاں بیٹھے بٹھائے بتا دیا تھا۔ اس پاؤں کی پٹلی جانب انگلیوں کے درمیان موجود تھا۔ رابعہ بولی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، کانوں میں شاخیں شاخیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ میں کس دنیا میں آ گیا تھا۔ میں حقیقت پسند اور حقیقت کی دنیا میں رہنے والا انسان تھا۔ یہ حالات کا دھارا مجھے کن جہانوں کی سر کر رہا تھا۔ میں اپنے خیالات سے تب چونکا جب شیر کی خوفناک دھاڑ مجھے سنائی دی۔ میں نے مذکر دیکھا سامنے ایک دل ہلا دینے والا منظر میرا منتظر تھا۔ چٹلی طرف سے دو ز شیر ہماری طرف چلے آ رہے تھے۔ رابعہ کیونکہ شکاری تھی اس لیے اب ہمیں کیا کرنا چاہئے تھا وہ بہتر بتا سکتی تھی۔ رابعہ نے غلات میں میرا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ پہاڑ کے ٹاپ سے آگے وسیع قطعہ زمین کا تھا ہم اس قطعے پر دوڑے چلے جا رہے تھے۔ تب اچانک سامنے سے ایک شیر برآمد ہوا تھا اور ہماری طرف لپکا تھا۔ اس کی لپک میں بڑی تیزی تھی۔ بارش کے دنوں میں شکار کم کم ہی ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شیر حد سے زیادہ بھوکا تھا جو نہی شیر نے ہم دونوں پر جست کی رابعہ نے مجھے زور سے دھکا دیا اور خود شیر کے نشانے پر آ گئی۔ شیر کا پنجہ رابعہ کی کینچی سے چھوٹا ہوا گزر گیا۔ میں بدحواسی کے عالم میں اٹھا اور رابعہ کی جانب بڑھا۔ شیر ایک دفعہ پھر سے مڑا اور حملہ آور ہوا..... رابعہ کھڑی ہو چکی تھی۔ میں بھی کھڑا تھا۔ رابعہ پہاڑ کے کنارے گہری کھائی کی طرف کھڑی تھی۔ ابھی ایک اندیشہ نے میرے ذہن میں سر ابھارا ہی تھا کہ وہ ہو گیا جس کا ڈر تھا۔ دوبارہ شیر سے بچانے کے لیے رابعہ نے مجھے دھکا دیا مگر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ رابعہ نے شیر پر جست کی تھی مگر رابعہ تو وہاں تھی نہیں وہ اپنی جھونک میں آگے نکلتا چلا گیا۔ رابعہ تو سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں گر رہی تھی۔ اس کی چیخ ابھی تک فضا میں گونج رہی تھی۔ اس چیخ نے میرا کلیجہ نکال لیا۔ تقریباً بیس سینکڑ گزرنے کے بعد پانی کا زوردار چھپا کا سنائی دیا..... میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہت دور نکل چکا تھا۔ میں نے دوڑتے ہوئے جست کی اور پھر زمین حقیقتاً میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔ میں فضا میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور نیچے ہی نیچے گرتا جا رہا تھا پھر اچانک چھپاک کی آواز آئی، کڑوا کیلا پانی نتھنوں کے رستے داخل ہوا اور میرے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔ میں دوبارہ جب سطح آب پر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ تقریباً دو سو فٹ چوڑے پاٹ کا ایک دریا تھا جو نامعلوم سمت بہتا چلا جا رہا تھا۔ میرے حواس ابھی بحال نہیں ہوئے تھے کہ میں حلق کی پوری قوت سے چلانے لگا۔ ”رابعہ..... رابعہ.....“ میری آواز انجان ویرانوں میں گونج کر رہ گئی۔

پناہ شور میں مدغم ہو گیا تھا پھر رابعہ کا دوسرا ہاتھ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک بلند چیخ میرے حلق سے برآمد ہوئی اور پہاڑی درے میں گونجتی چلی گئی۔ دوسو فٹ چوڑا دریا کا پاٹ تنگ ہو کر سونف کا رہ گیا تھا اور اس سے آگے دریا ایک بہت بڑی آبشار کی صورت سینکڑوں فٹ نیچے گر رہا تھا۔ رابعہ اسی آبشار کی گہرائی میں نیچے گر رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی آبشار کے بہت بڑے دھارے کا حصہ بن کر نیچے گر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا پوری کائنات میں چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ سفید دودھیا اچھلتا چھینٹے اڑاتا اور دھند کی مانند پھیلتا پانی، میں اس پانی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور چیخ چیخ کر رابعہ کا نام پکار رہا تھا۔ آبشار چند لمحے گزرنے کے بعد ایک تند دریا کی شکل اختیار کر گئی تھی اور میں اس پھرے دریا سے نبرد آزما اپنی رابعہ کو ڈھونڈ رہا تھا مگر رابعہ کہیں نہیں ملی۔ نیلی آنکھیں کہیں نہیں تھیں۔۔۔۔۔ دور دور تک دریا کی طغیانی منہ کھولے کھڑی تھی مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ نہ پیچھے نہ آگے نہ دائیں نہ بائیں۔۔۔۔۔ ”سمندر کی نیلاہٹ“ پھرے دریا کی شوریدہ سرلہروں میں کہیں کھو گئی تھی۔ میں بلند آواز میں رورہا تھا۔ میرا دل رورہا تھا، میرے حلق میں آنسوؤں کے دھارے گر رہے تھے مگر وہ کہیں نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ جس کے بغیر میں ادھورا تھا۔۔۔۔۔ نامکمل تھا۔۔۔۔۔ بے قیمت تھا۔

پانی کی طغیانی میں میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور ہوش جاتے رہے۔ بے ہوشی کی مدت کتنی تھی میں نہیں جانتا مگر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک عجیب جگہ پے پایا۔ میں لکڑی اور گھاس پھوس کے بنے ایک چھپر تلے اوندھا پڑا ہوا تھا۔ ہوا مسلسل اور لگاتار چل رہی تھی۔ میں نے چہرہ موڑ کے دیکھا تو دور دور تک تاحد نگاہ بلند سنہری گھاس لہلہاتی نظر آرہی تھی۔ چمکیلی دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی، نہ دریا تھا نہ آبشار نہ پانی کی طغیانی اور نہ ہی ”سمندر کی نیلاہٹ“ میں اٹھ کر بیٹھا تو درد کی لہریں پورے جسم میں پھیل گئیں مگر یہ دل میں اٹھنے والی ٹیسوں سے کم تر تھیں۔ اس رات والے مناظر میری آنکھوں میں رقصاں ہوئے تو میں پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ ”رابعہ۔۔۔۔۔ رابعہ تم کہاں ہو؟“ اچانک ڈبڈباتی آنکھوں نے ایک منظر دیکھا اور میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ دور کچھ گھوڑ سوار چلے آ رہے تھے۔ ان میں عام انسانوں سے کچھ مختلف تھا۔ ان کے سیاہ لباس مسلسل چلتی ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ گھوڑ سوار میرے پاس پہنچ گئے۔

میں ان کی طرف دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ تھے۔ ان کے گھوڑے سیاہ تھے۔ لباس سیاہ، چہرہ ہاتھ، پیر اور تمام ناخن سیاہ یہاں تک کہ ان کے دانت بھی سیاہ رنگ کے تھے۔ پہلی نظر دیکھنے سے پورے وجود میں خوف کی لہر پھیل جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا ان کے سارے جسم

پہاہ پینٹ کیا گیا ہے۔ ایک دم اچانک آگہی کا ایک مختصر لمحہ دماغ میں روشن ہوا اور میں سر تاپا لرز کے رہ گیا۔ میں جم کیٹی کے منہ سے کالی فوج کا نام سن چکا تھا۔ کالی فوج۔۔۔۔۔ بوکاشی دیوتا کی خاص فوج تھی۔ تو کیا اس وقت میں پر بت کے پار۔۔۔۔۔ بوکاشی دیوتا کی اس حیرت انگیز سلطنت میں پہنچ چکا تھا جس کا نام سن کر میرے کان پک چکے تھے۔ ہاں۔۔۔۔۔ میں پر بت کے پار پہنچ چکا تھا۔ اس پراسرار راوی میں پہنچ چکا تھا جس کا فرمانروا بوکاشی دیوتا تھا، سیاہ پوش گھوڑ سوار میرے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ وہ سب بھاری ذیل ڈول کے جنگجو تھے۔ ان کی وزنی تلواروں کے دستے نیاموں میں سے جھانک رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو شاید ان کا سالار تھا آگے بڑھا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”لڑ کے! تم اس رات بوکاشی دیوتا کی سلطنت میں پہنچ چکے ہو۔ تمہارا نام ”ایلی نیوز“ ہے۔ ہم تمہیں بوکاشی دیوتا کے حضور لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“ ان میں سے اپنے سالار کے حکم سے ایک آگے بڑھا اور اس نے گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے میری مدد کی۔ میں گھوڑوں کے گھیرے میں نامعلوم سمت کی طرف روانہ ہو گیا۔ تقریباً تین کوس چلنے کے بعد ہم ایک عجیب و غریب وضع کی وادی میں داخل ہو گئے۔ یہاں اونچے سرکنڈوں کے درمیان کہیں نیچے کہیں اونچے لکڑی کے مکان بنے ہوئے تھے۔ ہر مکان کی چھت خوبصورت رنگ برنگ پتھروں سے لہلہا رہی تھی۔ اس وادی کی خاص بات یہ بھی تھی کہ یہاں ہوا ایک سینکڑے کیلئے بھی نہیں رکھتی تھی۔ یہ دن کا وقت تھا سورج نصف النہار پے تھا تیز دھوپ اور نرم ہوا کا ملاپ جسم کو آسودگی بخش رہا تھا۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں خوبصورت چھوٹے چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے۔ کچھ سرسبز ٹیلوں پر واقع تھے۔ کچھ سنہری گھاس میں منہ چھپائے ہوئے تھے۔ ایک بھینی فوشو ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی کثرت سے مکان ہونے کے باوجود مجھے ان گھوڑ سواروں کے علاوہ کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم ان خوبصورت چھوٹے چھوٹے مکانوں کے درمیان اونچے نیچے رستوں اور پگڈنڈیوں سے چلتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ان گھروں کے کلین کہاں گئے تھے۔ اچانک ایک منظر نے مجھے ہلا کے رکھ دیا، ایک گھر کے کچھلی جانب سے تقریباً چار سالہ بچہ نکلا اس کے بال سنہری اور چہرہ چمکدار تھا۔ میں ایسا چہرہ ان جنگلوں میں دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ بالکل انگریز بچہ تھا۔ وہ چہل قدمی کے انداز میں نیچے اتر رہا تھا کہ کالی فوج کا ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے پیارا سا وہ بچہ ہاتھ میں پکڑے نیزے میں پرو دیا۔ بچے نے ایک دو جھٹکے لیے اور سارکت ہو گیا۔ اس نے نیزے کو ایک جھکا دیا اور آدھ کھلی کٹی مہرجائی ہوئی زمین پر جا پڑی۔ میں گنگ ہو کر رہ گیا، دستے کا سالار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ یہاں

ہوتا رہتا ہے۔“

”بوکاشی دیوتا کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

”مم..... مگر اس بچے کا قصور کیا تھا.....؟“ میں برداشت نہ کر سکا اور بول پڑا۔

”بوکاشی دیوتا کے حکم سے پوری وادی میں رات کا حکم مسلط ہے۔ بوکاشی دیوتا جب تک چاہیں گے اس وادی میں رات مسلط رہے گی۔ لوگ گھروں میں سوئے رہیں گے۔ انہیں تب ہی اٹھنا ہے جب بوکاشی دیوتا صبح کا حکم دیں گے۔ یہاں بوکاشی دیوتا کے حکم سے رات ہوتی ہے، دیوتا کے حکم سے دن چڑھتا ہے۔ اس بچے نے دیوتا کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اسے فوراً سزا مل گئی۔“ میرا دماغ گھوم کے رہ گیا۔

انکل ہیری کرس کے الفاظ میری سماعت میں گونج کے رہ گئے۔ ”وہاں بوکاشی دیوتا کے حکم سے دن چڑھتا ہے، دیوتا کے حکم سے رات ہوتی ہے۔“ اس وقت میں انکل ہیری کرس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔ اب سب کچھ سمجھ آ رہا تھا۔ سب کچھ میری نظروں کے سامنے تھا جہاں اس حیرت انگیز وادی میں اس وقت بوکاشی دیوتا کے حکم سے رات چل رہی تھی۔ کسی کے گھر سے باہر نکلنے کا مطلب تھا موت۔ گھروں کے مکین بوکاشی کے خوف سے گھروں میں دبے بیٹھے تھے۔ کالی فوج کے سپاہی مجھے اپنے جلو میں لیے بوکاشی دیوتا کے عظیم الشان محل میں داخل ہو گئے۔ محل کا صدر دروازہ تقریباً سات ہاتھ اونچا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ دروازے کی دو طرفی برجیوں کے پاس مسلح سپاہی ہاتھیوں پے بیٹھے تھے۔ یہ سپاہی بھی سر سے لے کر پیروں تک سیاہی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ہاتھی بھی گھوڑوں کی طرح بالکل سیاہ رنگ تھے۔ ہاتھیوں کے دانتوں کو بھی سیاہی سے رنگ دیا گیا تھا۔ جوں جوں میں محل کی اندرونی جانب داخل ہو رہا تھا ایک بے نام سی گھٹن میرا گھیراؤ کیے جا رہی تھی۔ میرے حواس پے جیسے کوئی نشہ سا چھا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سو رہا ہوں۔ میں بار بار اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر باوجود کوشش کے مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میں مکمل ہوش و حواس میں آنا چاہ رہا تھا مگر بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔

میں ایک خدا کا نام لیوا تھا اس کے علاوہ کسی دنیاوی طاقت کو نہیں مانتا تھا مگر یہ کیسی ظلم کاری تھی جو میرے اعصاب پے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ میں نے زور زور سے دو تین دفعہ اپنے سر کو جھکا دیا تو میں نے خود کو ایک نیم اندھیرے کمرے میں پایا۔ ہر طرف دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ اس رنگین دھوئیں کے پیچھے کوئی چیز آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا کالی فوج

ہا کوئی سپاہی میرے پاس موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنے سامنے دیکھا تو آنکھیں جھپکنے بھول گیا۔ وہ ہڈیوں کی شکل میں جسم تھا۔ وہ بے حد چوڑا اور دس ہاتھ اونچا آدمی تھا۔ اس کا تمام چہرہ اپنی خود میں چھپا ہوا تھا۔ خود میں سے صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بڑی عجیب آنکھیں تھیں۔ ان خونی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی۔ ان نگاہوں میں روئے زمین کا مہلک ترین ظلم چھپا ہوا تھا۔ اس غیر معمولی انسان کی گونجدار آواز ابھری اور تمام کمرے میں چکرانے لگی۔ اس نے طلسمی آنکھوں کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنے پر مجبور ہو گیا جیسے..... جیسے کسی نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی بٹھا دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا، میں بیٹھنا نہیں چاہ رہا تھا پھر..... پھر کون سی طاقت تھی جس نے مجھے بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آواز دوبارہ گونجنے لگی۔ ان رنگین دھندلکوں کے پیچھے کھڑے غیر معمولی انسان کے الفاظ جیسے رنگین فضاء میں تیر رہے تھے۔

”لڑکے! تم اس وقت بوکاشی دیوتا کے پوتر استھان پر کھڑے ہو اور میں بوکاشی دیوتا تم سے مخاطب ہوں۔ تمہارے جرموں کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔ تم نے ہماری فوج کے کئی سالاروں کو مار ڈالا۔ تمہارا قصہ شاید وہیں ختم ہو جاتا جب بوگا لے نے تمہیں اور تمہاری بہن رینا کو برب وادی سے نرار ہونے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ ہم ادھر بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سارا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ بوگا لے جب اعصا تھام کر تمہاری طرف دوڑ رہا تھا تو تم تھوڑا سا ٹھٹکے تھے۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹے تھے پھر تم نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ بوگا لے اپنا اعصا تمہارے سینے میں اتارنا چاہتا تھا کہ عین اُتار پر ہم نے اپنے علم کے زور پر اس کا رخ گھوڑے کی طرف موڑ دیا۔ تمہاری بجائے گھوڑے کی قربانی دے دی گئی۔ تمہیں عزت و احترام سے رواؤ کے محل میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں تم بڑے عیش و آرام سے رہے۔ تمہیں ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے تھا مگر تم ناشکرے نکلے۔ رینا کے قتل کے بدلے تم بوگا لے کو جان سے مارنا چاہتے تھے حالانکہ رینا کے قتل کا حکم ہم نے دیا تھا اور جو حکم ہم ایک بار دے دیں اس میں ہمارے علاوہ کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ ہم چاہتے تو تمہیں وہاں بیٹھے بٹھائے ایک لمحے میں ہلاک کر دیتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم تمہیں تب بھی دیکھ رہے تھے جب تم بوگا لے کے تہہ خانے میں بند تھے۔ تم نے بوگا لے کو سر کی نگر ماری تھی جس کے نتیجے میں وہ تمہیں اٹھا کر سزا خانوں میں لے گیا تھا اور تمہارا چہرہ ’زوف‘ میں مسخ کر دینا چاہتا تھا۔“

میں بے یقینی کے انداز میں آنکھیں پھاڑے بوکاشی دیوتا کی جانب دیکھ جا رہا تھا۔ میں یہ سب خواب دیکھ رہا تھا۔ یا..... یا..... یہ سب کچھ حقیقت میں تھا..... نہیں..... یہ سب حقیقت کیسے



کالی فوج کے سپاہی مجھے ایک خوبصورت سے گھر میں چھوڑ گئے۔ یہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا نہری بلند گھاس کے درمیان گھرا ہوا مکان تھا۔ مجھے خاص تاکید کی گئی تھی کہ مجھے گھر سے باہر کسی صورت نہیں نکلنا ورنہ میرا انجام بھی اسی بچے جیسا ہوگا جسے میری نگاہوں کے سامنے نیزے میں پرو دیا گیا تھا۔ گھر میں خورد و نوش کا سامان وافر مقدار میں موجود تھا۔ سارا مکان لکڑی کی مدد سے خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ صندلی لکڑی کی کھڑکیاں دروازے بالکونی اور سیڑھیاں ایک بے نام سی خوشبو دو کمروں کے اس مکان میں چکرائی پھرتی تھی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی طرف گیا تو چھت پے لگے بے تخا شاربنگ برنگے پھول ہوا کے دوش پے فقس کر رہے تھے۔ ہر طرف بلند سنہری گھاس سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ میں ابھی سیڑھیوں میں ہی تھا کہ مجھے کالی فوج کے سپاہیوں کی کبھی ہوئی آغزی تنبیہ یاد آگئی اور میں فوراً نیچے اتر آیا۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک جانب تلواریں، کھلاڑے اور بزدلوں کی انیاں چمک رہی تھیں۔ یہ سب شاید میری مشق کے لیے یہاں رکھا گیا تھا۔ میں ابھی انہیں کچھ ہی رہا تھا کہ کمرے میں کھٹکا ہوا، میں نے ایک وزنی کھلاڑا ہاتھ میں تھام لیا اور تیزی سے کمرے کے اندر گیا۔ وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی جس کے بال شہد رنگ تھے۔ اس کا چہرہ خون کی سرخی سے دمک رہا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی، چہرے مہرے سے وہ انگریز نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بوب انداز میں جھک گئی اور شیریں لہجے میں بولی۔ ”میں بوکاشی دیوتا کی ایک ادنیٰ داسی ہوں، میں نے مجھ کو آپ کی خدمت کے لیے بھیجا ہے جو کھانا آپ پسند کریں گے وہ میں آپ کے لیے تیار کر دوں گی جس قسم کی بھی خدمت آپ مجھ سے لینا چاہیں گے میں ہر وقت حاضر ہوں گی۔“

میں حیرت زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ خوب روڑی انگریز تھی۔ اس سے پہلے میں ایک بوٹے انگریز بچے کو بھی دیکھ چکا تھا۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا تھا افریقہ کے جنگلوں کے اس گورکھ مندے میں کوئی انگریز قبیلہ آباد نہیں تھا تو پھر یہ انگریز لوگ یہاں کیسے موجود تھے؟ میں نے جب اس غلط اس انگریز لڑکی سے پوچھا تو وہ بڑے نارمل لہجے میں بولی کہ ہم ہمیشہ سے یہاں رہنے والے ہیں۔ یہ تمام وادی اسی نسل سے آباد ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر بولی۔ ”تم یہاں نئے آئے۔ آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ بتا چل جائے گا۔ ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ کیا کھانا پسند کرو گے۔ ہمارے پاس میرے خیال سے آٹھ دس دن ہیں اس کے بعد تمہیں موت کے گولے میں اتر جانا ہے۔ وہاں تمہارا مقابلہ اس وادی کے سب سے بڑے جنگجو سے ہونا ہے اور یاد رکھو تم اسے مار کر رہی لے لے سے باہر نکل سکو گے اگر تم اسے نہ مار سکتے تو خود مر جاؤ گے۔ اسی لیے میں تمہیں بتا رہی ہوں

ہو سکتی تھی۔ ایک شخص غیب کا علم کیسے جان سکتا تھا؟ وہ اتنی دور بیٹھا تمام مناظر کیسے دیکھ سکتا تھا؟ میں زور زور سے سر جھٹک رہا تھا اور خود کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک بوکاشی دیوتا کی آواز دوبارہ گونجی۔ ”لڑکے! ہمارے بارے میں بدگمان ہو رہے ہو..... تمہاری کمر پے دونوں کندھوں کے درمیان ایک ساتھ تین تل ہیں جن کو شاید کبھی تم نے بھی نہ دیکھا ہو مگر وہ اس وقت بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔“ بوکاشی دیوتا کے الفاظ دھماکے بن کر میری سماعت میں گونجے اور میں سر تاپا لڑکے رہ گیا۔ ماں جب بچپن میں تیل سے میری مالش کیا کرتی تھی تو کہا کرتی تھی۔ ”نونی بیٹا! تیری کمر پے کندھوں سے ذرا نیچے تین کالے تل ہیں۔ میں تجھے بتائے دیتی ہوں تیرے تین بچے ہوں گے۔“ انا کہہ کر ماں کھلکھلا کر ہنس دیا کرتی تھی اور میں نا سمجھی سے ماں کی طرف دیکھ کر رہ جاتا تھا۔ مگر ماں کی کبھی ہوئی بچپن کی وہ بات اس طرح سے میرے سامنے آئے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”لڑکے! ابھی بھی تمہیں کوئی شک ہے۔“ بھاری آواز دوبارہ گونجی..... میں جواب میں کچھ نہیں بول سکا۔ آواز دوبارہ ابھری۔ ”تمہاری سزا صرف موت بنتی ہے مگر تمہیں ایک رعایت دی جا رہی ہے۔ ٹھیک دس دن بعد تمہارا یہاں کے ایک جنگجو سے مقابلہ کروایا جائے گا اس مقابلے میں دونوں میں سے ایک کو مرنا ہے۔ تمہیں یا اسے..... جو زندہ بچ جائے گا وہی زندگی پالے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ تم مقابلے کی تیاری کر سکتے ہو۔ تمہاری ضرورت کی ہر چیز تمہیں مل جائے گی اور یاد رکھو مقابلہ اس دن شروع ہوگا جس دن ہمارے حکم سے صبح ہوگی۔“ اچانک مہیب گڑگڑاہٹ سی گونجی زمین ہلکی میں اپنی جگہ پے ڈگمگایا اور نیچے گر گیا۔ دوبارہ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو نہ وہ تاریک کمرہ تھا نہ وہ دھواں دھواں فضا اور نہ ہی وہ گونج دار آواز۔ میں ایک وسیع احاطے میں پڑا تھا جس کے ایک طرف دور دور تک سنہری گھاس دھوپ میں چمک رہی تھی۔ تیز ہوا ہنوز چل رہی تھی۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو میرا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے دوڑنے لگا۔ ایک حقیقت پسند آدمی اور سائنسی نقطہ نظر رکھنے والے انسان کے ساتھ اچانک ایسے حالات پیش آ جائیں جیسے میرے ساتھ آئے تھے تو اس کا دماغ اپنے ٹھکانے پر نہیں رہے گا۔ جیسے میرا نہیں رہا تھا۔ جو کچھ میں بوکاشی دیوتا کے محل میں دیکھ کر آ رہا تھا سب ناممکن لگتا تھا مگر میں نے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اپنے روبرو طلسمی طاقت کا نظارہ کیا تھا۔ میں ان چیزوں کو جھٹلاتے ہوئے بھی جھٹلا نہیں پار رہا تھا۔ بوکاشی دیوتا نے میرے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ حرف بہ حرف سچ تھا۔

ان آٹھ دس دنوں میں تم اپنی ہر خواہش پوری کر لو۔ کیا معلوم پھر یہ لمحے تمہارے ہاتھ آئیں یا نہ آئیں۔۔۔۔۔ مقابلے کی مشقیں کرو، کھاؤ، پیو۔۔۔۔۔ اور اس کے علاوہ میں تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے مٹی خیز انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی ہی شوخی تھی۔ یہ شوخی میرے وجود میں زیر گھول رہی تھی۔ میرے دل میں جلتی نفرت کی آگ کو اور بھڑکار رہی تھی۔ میں دشمن عظیم کی نگری میں پہنچ چکا تھا مگر جو سب سے بڑا اور ناقابل برداشت سانحہ میرے ساتھ ہوا تھا وہ رابعہ کی گمشدگی تھی۔ میں چوبیس گھنٹے سے مسلسل ایک عذاب سے گزر رہا تھا۔ رابعہ کی شبیہ بار بار نگاہوں کے سامنے آتی تھی اور دل پے آرے سے چل جاتے تھے۔

میں تقریباً بارہ دن اس خوبصورت چھوٹے سے مکان میں مقید رہا۔ اس دوران نہ میں نے کوئی مشق کی اور نہ ہی اس انگریز لڑکی کی خدمت سے مستفید ہوا، صرف زندہ رہنے کے لیے کھانا حلق سے اتارتا رہا اور رابعہ کی یاد کے آنسوؤں کی لڑیاں پروتا رہا۔ وہ شاید تیر ہواں دن تھا۔ ایکدم میرے کانوں میں بہت سا شور سنائی دیا۔ مختلف انسانوں کی بولیوں سے ہا ہا کارچی ہوئی تھی۔ وہ انگریز لڑکی جس کا نام ”لیزا“ تھا اور جو تیرہ دن میرے ساتھ اس گھر میں مقید رہی تھی اور جسے میں نے جھوٹا سمجھا تھا سوئی پڑی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور دبا دبا جوش تھا، وہ لڑکتے لہجے میں بولی۔ ”ایلی نیوز! دن چڑھ گیا۔۔۔۔۔ آؤ باہر چلیں۔“ وہ میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے گھر سے باہر آگئی۔ باہر کا منظر حیران کن تھا، ہر طرف لوگ ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ آدمی، عورتیں، جوان لڑکیاں اور چھوٹے چھوٹے بچے۔ وہ سب سنہرے بالوں والے انگریز تھے، چمکتی دھوپ میں لابی سنہری گھاس کے نشیب و فراز میں دکتے چہروں والے لوگ گھوم رہے تھے، چہچہا رہے تھے۔ دفعتاً ایک نقارہ بجا اور سب لوگ ایک سمت کو بھاگنے لگے۔

لیزا مجھے جھوٹ کر ان لوگوں میں گم ہوگئی۔ میں پریشان حال سا ایک پگڈنڈی پے چل رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے کالی فوج کے چار گھوڑ سوار برآمد ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک سمت کو لے چلے۔ بھر بھری چٹانوں والا ایک قلعہ دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق اس کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ قلعے کے اندر سے بہت شور بلند ہو رہا تھا جو باہر دور دور تک پھیل رہا تھا۔ گھوڑ سوار ایک پتھر یلے رستے سے ہو کر قلعے کے عقب کی طرف بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے اچانک میری نگاہ ایک جانب اٹھ گئی، وہاں پتھر یلے رستے سے ہٹ کے چٹانوں میں پیالہ نما جگہ بنی ہوئی تھی۔ اس پیالہ نما جگہ کی گہرائی میں دو عجیب وضع کے چراغ جل رہے تھے۔ ان چراغوں میں سے ایک بڑا جبکہ دوسرا نیچا

چھوٹا تھا اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تیز ہوا کی روانی کے باوجود دونوں چراغ بجھ نہیں رہے تھے جو بھی ان چراغوں کے پاس سے گزرتا تھا اپنا ماتھا ضرور ٹیکتا تھا۔ مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگا، یہی میں اسی الجھن میں گرفتار تھا کہ قلعے کا عقبی دروازہ کھل گیا اور گھوڑے قلعے میں داخل ہو گئے۔ یہ قلعہ کا بہت وسیع احاطہ تھا۔ احاطے سے ذرا ہٹ کر لکڑی کی اونچی اونچی گیلریاں بنی ہوئیں تھیں۔ ہاں جوق در جوق تماشاخی براجمان ہو رہے تھے۔ مجھے ایک نشست پر بٹھا کر کالی فوج کے کارندے ملے گئے۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں چھپے ناک موٹے ہونٹ اور کالی رنگت کا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا۔ اس کی موٹی آنکھیں خاموش سمندر کی مانند تھیں، کوئی جذبہ کوئی تاثر، کوئی ولولہ ان خاموش نھری ٹھوں میں نہیں تھا۔

تلواروں کے ٹکرانے کی آواز سے میں چونکا اور میرا دھیان سامنے کھلے میدان کی طرف اٹھ گیا۔ وہاں دو گرائڈیل شخص تلواریں سونٹے آپس میں نبرد آزما تھے۔ وہ بے دریغ ایک دوسرے پر تلوار اڑہتے تھے۔ یہ لڑائی چار ستونوں کے درمیان ہو رہی تھی، چاروں ستونوں میں سے دھواں سا نکلتا ان دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا، دونوں جانبازوں کی لڑائی تقریباً دو منٹ جاری رہ سکی۔ ایک نیچے گر کر لڑا ہوا تھا تو دوسرے نے اپنی تلوار کی نوک اس کی گردن سے لگا دی۔ یہ لڑائی ہمارے چکر چک رہا تھا، ہارنے والے کو دو کارندے اٹھا کر ان چار ستونوں کی حدود سے باہر لے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک تازہ دم شخص کو چار ستونوں کے درمیان بھیج دیا گیا۔ پہلے کی طرح لڑائی بارہ شروع ہوگئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک جانباز بالکل تازہ دم تھا جبکہ دوسرا ایک لڑائی جیتنے کے کافی ہانپا ہوا تھا۔ چاروں ستونوں پر پانی پھر سے پھینکا جانے لگا، دھوئیں کے مرغولے اٹھنے لگے اور اریں ٹکرانے لگی۔ تین منٹ بعد پہلی لڑائی جیتنے والا دوبارہ جیت گیا، دوسرے ہارنے والے کو بھی احاطے کے ایک کونے میں پتھر کی سل پر لٹا دیا گیا۔ تیسرا معرکہ پھر فوراً شروع ہو گیا۔ میں نے نئے والے جانبازوں کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ ان کے چہرے کی جلد جلی ہوئی اور سانس اکھڑا تھا وہ بڑی مشکل سے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے۔

میرے برابر بیٹھا ہوا کالا بھنگا ادھیڑ عمر جیسی پہلی دفعہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔

”گتا ہے یہاں پر نئے آئے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مجھ سے نظریں ہٹا کر بولا۔ ”یہ لڑائی گندھک کے ستونوں کے درمیان ہو رہی ہے، یہاں صرف وہی جیت سکتا ہے جس کا سانس بہت پکا ہو۔ جس کا ذرہ سا

نہیں نکلا۔

اس کے بعد پورے مجمع میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، اس خاموشی کی مدت بہت  
 تھوڑی تھی اس کے بعد وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک گرائڈیل کالی فوج کا  
 سپاہی میدان میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی وہ اسے اپنے دائیں بائیں لہرا رہا تھا۔ اس  
 دوران کالی فوج کے دس سپاہی لکڑی کا ایک بہت بڑا گولہ میدان میں رکھ گئے، گرائڈیل سپاہی اس  
 گولے کے اندر داخل ہو گیا۔ ہارنے والے تین جانبازوں کو اکھڑے سانس کے ساتھ لکڑی کے  
 گولے میں پھینک دیا گیا، ان کے ہاتھوں میں بھی تلواریں تھیں۔ تینوں ہارنے والے ایک دم کالی فوج  
 کے گرائڈیل سپاہی پر پل پڑے، تلواریں نکرائیں اور خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ وہ خونی لڑائی تقریباً  
 دس منٹ جاری رہ سکی۔ کالی فوج کے سپاہی نے تینوں مخالفوں کو خون میں نہلا دیا۔ تینوں کی لاشیں  
 لکڑی کے گولے سے باہر نکال لی گئیں۔ میں اس منظر میں کھویا ہوا تھا کہ کالی فوج کے دو سپاہی میرے  
 پاس آئے اور دونوں بازوؤں سے دبوچ لیا، وہ مجھے لکڑی کے اس گولے کی طرف لے جا رہے تھے  
 جس میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کالی فوج کے گرائڈیل سپاہی نے تین انسانوں کو تہ تیغ کیا تھا۔ میری  
 آنکھوں کے آگے دھندہ ہی دھند چھا گیا تھی تمام مناظر دھندلا گئے تھے۔ اس دھندلا ہٹ کے پس منظر  
 میں، میں نے ایک منظر دیکھا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بوکاشی دیوتا جس بالکونی پر کھڑا تھا اس  
 کے نیچے لکڑی کے کیبن میں جم کیٹی، شاہنواز گوگی اور سردار رواڈو کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اس  
 مسکراہٹ نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا تھا۔ شاہنواز کے کردار میں کسی شک و شبہ کی گنجائش  
 نہیں رہی تھی۔ یہ وہی شاہنواز تھا جو میرے بچپن کا، بھجولی تھا ہم ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے لکھے تھے، ہم  
 نے زندگی کی دس بہاریں ایک ساتھ دیکھیں تھیں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر  
 شاہنواز سے یوں ملاقات ہوگی۔ شاہنواز کیبن سے نکل کر بڑی تیزی سے میرے قریب پہنچا تھا اور  
 آنکھ نہچاتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! تم نے زندگی میں بہت بڑے بڑے معرکے مارے ہوں گے مگر  
 بارکھو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری لڑائی ہوگی۔ تم بڑے بے وقوف دشمن  
 ہو۔ آئے تھے تم۔ رابعہ کو حاصل کرنے۔ مگر بے موت مارے جاؤ گے۔ علی نواز رابعہ میری۔۔۔۔۔  
 اور صرف میری ہے۔ میں نے تمہیں یہ وقوف بنایا۔۔۔۔۔ میں تم سے کھیلا رہا۔ تمہیں اتنی بات بھی سمجھ میں  
 نہیں آئی کہ رابعہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔۔۔۔۔ اور میں رابعہ کے بغیر۔۔۔۔۔ کوئی اس پر بری نگاہ رکھے  
 مجھے گوارہ نہیں ہے۔ مارے تو تم اسی دن جاتے جس دن میں نے ہٹ پر رات کے وقت فائرنگ کی

سانس بھی اکھڑ جائے سمجھو وہ ہار گیا۔ اصل میں بیڑائی طاقت اور قوت ارادی کا کھیل ہے اس میں جو مسلسل تین بندوں کو بغیر سانس ٹوٹے ہر ادے وہ جیت جاتا ہے۔ اسے کالی فوج میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ ”ابھی حبشی کی باتیں جاری تھیں کہ ایک دم بہت سا شور بلند ہوا۔ نگاہ سامنے اٹھی تو پہلے والا جنگجو تیسرے مخالف کو بھی ہرا چکا تھا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔ ایک جانب سے بڑی تیزی کے ساتھ کالی فوج کا ایک گروہ برآمد ہوا۔ انہوں نے فاتح جوان کو گھیر لیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں کی نظر سے روپوش ہو گیا تقریباً پانچ منٹ بعد دائرہ منتشر ہوا تو فاتح جوان کالی فوج کے حلیے میں ڈھل چکا تھا اس کا تمام جسم اس کے دانت اس کے تمام ناخن کالے رنگ میں ڈھل چکے تھے، وہ فاتحانہ انداز میں ناچ رہا تھا یونہی ناچتا ناچتا وہ میدان سے پرے ہٹا گیا اور ہم سے چند قدموں کی دوری پر بے ایک بلند چبوترے کے سامنے جا کر سجدہ ریز ہو گیا۔ میں نے نگاہیں سیکڑے دیکھا تو وہاں بلند لکڑی کی گیلری کے آگے بالکونی بنی ہوئی تھی۔ بوکاشی دیوتا بنفس نفیس وہاں کھڑا تھا۔ وہی حلیہ وہی جسامت وہی قد کاٹھ جو میں نے ایک دن اس نیم اندھیرے کمرے میں دیکھا تھا جب مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ میں بعد میں بہت سوچتا رہا تھا کہ شاید وہ سب فریب نظر تھا، میرے حواس پر چھائی غنودگی کا کرشمہ تھا مگر میرے سب شکوک و شبہات یہاں غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہی تھا جو میں نے اس نیم اندھیرے کمرے میں دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں وہی خونی کشش تھی جو بصارت کو بکلا کرتی تھی۔ اس کے عقب میں بارہ خوبصورت عورتوں کی ایک لمبی قطار بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پہلے ہی ساتھ بیٹھے حبشی نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے مجھ کو وار کو بتایا تھا کہ ”وہ دیوتا بوکاشی بیٹھا ہے اس کے عقب میں بیٹھی ہوئی عورتیں بوکاشی دیوتا کی بارہ بیویاں ہیں۔ ہر پورن ماشی کی رات بوکاشی دیوتا ایک نئی لڑکی سے شادی رچاتا ہے، اسے اپنی بیوی بناتا ہے مگر مگرے کی بات یہ ہے کہ اس کی بیویوں کا تعداد ہمیشہ بارہ ہی رہتی ہے۔“ اتنی بات کر کے حبشی ہنسا اور دبے دبے قہقہے لگانے لگا پھر وہ بہک بہک کر اور بے رابطی باتیں کرنے لگا۔ ان باتوں میں بار بار چار ہیروں کا ذکر آ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ حبشی کا دماغ کچھ کھسکا ہوا ہے۔ میری بات کسی حد تک صحیح تھی وہ حرکتیں ہی عجیب اور انٹی سیدم کرنے لگ گیا تھا۔ میں نے اپنا دھیان اس سے ہٹا کر بوکاشی دیوتا پر مرکوز کر لیا۔ بالکونی میں کھڑا بوکاشی دیوتا نے ہوا میں کوئی چیز اچھالی جو جیتنے والے جوان نے ہوا میں دبوچ لی اور بھاگتا ہوا ایک سیاہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پورا اسٹیڈیم نعروں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا اس کے بعد اس طرح کے دو اور مقابلے ہوئے جن میں کوئی بھی کالی فوج میں شامل ہونے کا

تھی مگر تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ نکلے تھے۔“ میرا دماغ گھوم کے رہ گیا وہ منظر میری نگاہوں میں تازہ ہو گیا جب پہلی رات میں جنگل کے آغاز میں ہٹ میں سویا پڑا تھا اور رات کے پچھلے پہر لکڑی کے بنے ہوئے ہٹ پے اندھا دھند فائرنگ ہوئی تھی اور میں نے کرائنگ کرتے ہوئے اپنی جان بچائی تھی..... تو کیا وہ فائرنگ شاہنواز نے کرائی تھی.....؟

شاہنواز کے رویے نے میرے جسم کی رہی جان نکال لی تھی..... میرا جسم جیسے بے جان ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں پھر سے ڈبڈبا گئیں تھیں۔ میں انہی ڈبڈباتی آنکھوں سے شاہنواز کی طرف طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا کہ کالی فوج کے سپاہیوں نے مجھے لکڑی کے گولے میں پھینک دیا، میرے ہاتھ میں ایک تلوار پکڑ دی گئی اور اعلان ہونے لگا۔ ”حاضرین! متوجہ ہوں یہ موت کی لڑائی ہے اس لڑائی میں اپنے مد مقابل کو موت کے منہ میں دھکیلنے والا ہی زندگی پاسکے گا ان دونوں میں سے ایک کو زندہ اس گولے میں سے باہر نکلنا ہے۔“ اعلان ختم ہوتے ساتھ ہی پورے اسٹیڈیم میں شور و غل بلند ہونے لگا۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگیں۔ ان تمام مناظر سے قطع نظر میری نگاہوں میں سمندر کی نیلا ہٹ گھوم رہی تھی..... نیلی آنکھیں گھوم رہی تھیں..... وہ نیلی آنکھیں جو پتا نہیں اس وقت کہاں تھیں.....؟ تھیں بھی یا..... نہیں۔ میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ میرے مد مقابل نے مجھ پر پہلا وار کیا۔ میں نے بمشکل اسے اپنی تلوار پے روکا اور حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ حقیقت..... جو بڑی اعصاب شکن تھی..... اچانک..... بالکل اچانک میرے اندر ایک آواز گونجی..... علی نواز تمہیں ابھی نہیں مرنا..... تمہیں زندہ رہنا ہے..... تمہارے سر پر ابھی بہت سے وعدوں کا بوجھ ہے..... تمہیں ابھی زندہ رہنا ہے۔

ایکدم ایک دلولے نے میرے دل میں کروٹ سی لی۔ ایک بے نام حوصلے نے میرے وجود میں جنم لیا اور میں غیر متوقع طور پر اپنے دشمن سے نہر آڑا ہو گیا۔ خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ فلواد سے فلواد دکرانے لگا۔ جو شیعے نعرے اور پُر جوش لکارے بلند ہونے لگے، لکڑی کا یہ گولہ تقریباً نو فٹ قطر کا تھا۔ ہمارے پیروں کی حرکت سے گولا بھی حرکت میں آ جاتا تھا اور بیلنس برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ ایک مشکل لڑائی تھی۔ میرا مد مقابل دیوبہکل انسان تھا۔ وہ غیر معمولی جسامت اور طاقت کا ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ وہ ایک مشکل حریف تھا..... اور میں اپنے اس ”مشکل حریف“ کے طوفانی وار روکتا چلا جا رہا تھا۔ میں ایسے کسی موقع کی تاک میں تھا کہ میں اسے کاری زخم لگا سکوں مگر یوں لگتا تھا وہ ہارنے والا انسان نہیں ہے۔

میرے جسم و جان میں ایک بار پھر سے مایوسی سی چھانے لگی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا یا شاید لاشعوری طور پر اس کی وجہ رابعہ کی گمشدگی رہی ہو۔ کالی فوج کے دیوبہکل سپاہی کا ایک زوردار وار بری تلوار سے نکرایا اور میری تلوار دو ٹکڑے ہو گئی اور میں پشت کے بل گولے کے پینڈے میں گرا۔ ایکدم اتنا شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں بازی ہار چکا تھا، موت مجھ سے چند انچ کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔ میرے مد مقابل کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ ہر طرف شور ہی شور تھا، کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ میں ریتا ہار تھا، میں رابعہ ہار تھا اور اب میں..... شاید اپنی جان ہارنے جا رہا تھا..... نمی ایک مرتبہ پھر سے میری آنکھوں میں لہرا گئی تھی اور میں آنکھیں میچ کے رہ گیا پھر اچانک..... بالکل میرے کان کے قریب ایک چیخ گونجی تھی میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ میری آنکھوں نے جو پہلا منظر دیکھا وہ بہت پیارا بہت دلربا تھا۔ رابعہ گولے کے قریب کھڑی چلا رہی تھی، اس نے گرے طر کا لمبا چوغہ سا پہن رکھا تھا۔ اس کی زلفیں شانوں پر منتشر تھیں۔ اس کے گالوں پہ آنسو لڑھکتے جا رہے تھے اور..... وہ مجھے مسلسل پکار رہی تھی۔ ”علی نواز..... اٹھو..... اٹھو..... علی نواز..... خدا کے لیے اٹھو..... علی نواز.....“ کالی فوج کے سپاہی اس کو کھینچ کر پیچھے لے جانے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ رابعہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

میرے دل میں بیٹھا طوفان سا ابھرا اور ہر طرف جلتارنگ سے بجتے لگے۔ میرے مد مقابل نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے تلوار میرے سینے میں اتارنا چاہی مگر وہ یہ بھلا بیٹھا تھا کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے اب اس کا ٹا کرہ کسی ناامید پڑمردہ آدمی سے نہیں بلکہ..... علی نواز خان سے ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنا پاؤں اس کی ٹانگ پہ اس زور سے مارا کہ وہ اچھل کر گرا، میں پلک جھپکتے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس پر جست کی اور اس پر جا پڑا۔ میں نے اس کی تلوار والی کلائی تمام لی اور سر کی زوردار نکر اس کے چہرے پہ ماری۔ اس کے ساتھ ہی گھوم کر کہنی کا ایک وار اس کے پیٹ میں کیا۔ یہ ضرب کارگر ثابت ہوئی اور مد مقابل دہرا ہو گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے تلوار اپنے ہاتھ میں کرنا چاہی تو اس نے ٹانگ اس زور سے میرے سینے پہ جمائی کہ میں لکڑی کی دیوار سے جا نکر آیا۔ وہ حیرت انگیز پھرتی سے اٹھا اور اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی، میں جھکائی دے کر صاف اپنا آپ بجا گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ یہ لمحہ میرے لیے قیمتی تھا۔ مد مقابل میرے ڈھب پر تھا وہ نہیں جان سکتا تھا میں اس کے ساتھ کیا کرنے لگا ہوں۔ وہ مڑ کر میری طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ میری بیک راؤنڈ کلک اس کے سینے پہ لگی اور اس زور اور تیزی سے لگی کہ وہ

خون تھوکت لکڑی کا گولہ توڑتا ہوا باہر جاگرا۔ لکڑی کا گولہ ٹوٹ چکا تھا، آدھے سے زیادہ اسٹینڈیم کھڑا یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے مد مقابل کی تلوار اٹھائے گولے سے باہر نکل آیا۔ میرا رخ اپنے دشمن کی طرف تھا۔ منہ سے خون نکل کر مد مقابل کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پے پھیل گیا تھا۔

کالے ہونٹ، کالے دانتوں اور کالی ٹھوڑی پر پھیلا سرخ خون بڑا عجیب اور خوفناک لگ رہا تھا۔ میرے مد مقابل نے دیوانگی کے عالم میں ایک کالی فوج کے سپاہی کی تلوار کھینچ کے نیام سے نکال لی تھی۔ وہ وحشت کے عالم میں میری طرف بڑھا، میں اس کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ میں اب اس کو کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے وجود میں آتشیں لاوا سنسنار ہا تھا۔ ایک خوفناک آگ تھی جو روئیں روئیں میں جل اٹھی تھی۔ میں اپنے مد مقابل پر پے در پے وار کرتا چلا گیا۔ وہ دیوبیکل کالی فوج کا سپاہی ایک دفعہ پیچھے ہوا تو پیچھے ہٹا چلا گیا۔ اس کی خود اعتمادی اسے لے ڈوبی تھی۔ اس کے پیرا کھڑ گئے تھے اور وہ اپنا دفاع کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے ایک سپاہی سے ڈھال بھی تھام لی تھی۔ میرے پے در پے واروں نے جلد ہی اس کی ڈھال پھاڑ ڈالی۔ میرا ایک وار روکتے ہوئے وہ پشت کے بل پتھر پللی زمین پے گرا تو کالی فوج کا ایک سپاہی چلاتے ہوئے بولا۔ ”ہالی!

اٹھو..... ہمت کرو..... نہیں تو یہ تمہیں مار ڈالے گا.....“

سپاہی کی بات سن کر میرے چہرے پے زلزلے کے آثار نمودار ہو گئے۔ میرے دماغ کے ایوانوں میں صرف ایک ہی لفظ گونجنے لگا ”ہالی..... ہالی..... ہالی..... ہاں..... وہ سو فیصد ہالی ہی تھا..... ساسا کا محبوب شوہر ہالی..... اس کا قد کاٹھ..... اس کے ہاتھوں اور پیروں کی غیر معمولی لمبائی سب ساسا کی ہالی کے متعلق بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق تھا۔

اس نے بتایا تھا کہ ہالی کے داہنے کندھے پے زخم کا ایک پرانا نشان ہے جو کافی گہرا ہے۔ میں بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے تلوار کی نوک سے اس کی صدری پھاڑ ڈالی۔ اس کا کندھا برہنہ ہو گیا..... گہرا نشان وہاں موجود تھا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا تو کیا میرا مد مقابل..... ساسا کا شوہر ہالی ہے۔ ساسا کی معصوم بھولی بھالی شکل میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ اس لڑکی نے میری وجہ سے بہت دکھ جھیلے تھے اس کا باپ مجھے بچانے کے چکر میں مارا گیا تھا اور وہی باپ ہی اس کا واحد سہارا تھا جو ہر وقت اس کی ہمت بندھاتا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کے شوہر ہالی کو پرست کے پارے سے ضرور آزاد کروا کے لائے گا۔

ناکو مجھے فرار کرانے کے چکر میں مارا گیا تھا۔ میں نے اس کی بیٹی ساسا سے وعدہ کیا تھا کہ اگر

کے باپ کا ادھورہ مشن میں پورا کروں گا۔ میں ہالی کو آزاد کروا کر لاؤں گا مگر حالات کی یہ کیسی کرشمہ بازی تھی کہ قدرت نے مجھے ہالی کے مقابل لاکھڑا کیا تھا۔ اب وہی صورتیں تھیں ہالی کی زندگی پاؤں اور خود مارا جاؤں یا خود غرضی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جان بچاؤں اور ہالی کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔

تقدیر نے مجھے ایک عجیب دورا پے پر لاکھڑا کیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کروں۔ مارا اسٹینڈیم کھڑا تھا اور ایک زبان ہو کر آوازے کس رہا تھا۔ میری نگاہ اس طرف اٹھ گئی جہاں رابعہ کالی فوج کے گھیرے میں کھڑی تھی۔ خوشی اس کے چہرے پے ٹوٹ کے برس رہی تھی اور وہ کالی فوج کے گرائنڈیل سپاہیوں کے پیچھے سے اچھل اچھل کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کتنی حسین تھیں وہ انکھیں جن سے محبت پھوٹ رہی تھی، شوخی نچل رہی تھی۔ ایک فقرہ میری سماعت میں گونجا اور ان شکل لمحات میں بھی میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے میں اتنی جلدی مروں گی نہیں! علی نواز.....“ ہاں اس نے ثابت کر دیا تھا..... وہ پانی کی شوریدہ سرلہروں کو پچھاڑ چکی تھی، وہ زندہ سلامت میرے سامنے کھڑی تھی۔

وہ مسلسل مسکرا رہی تھی پھر یکدم جیسے اس کے چہرے پے خوف کا سایہ حاظر آ گیا۔ وہ زور سے چیخی اور اس نے بلند آواز سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دفعتاً میری نگاہ ہالی کی طرف اٹھ گئی۔ اگر ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو ہالی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار میرا پیٹ چاک کر دیتی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں تلوار لیے تیزی سے میری طرف بھاگا آ رہا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ بھڑکی، ہالی کی تلوار میری قمیص کا دامن ادھیڑتی ہوئی گذر گئی۔ ہالی اپنی جھونک میں آگے نکلتا چلا گیا۔ ارک کر دو بارہ کسی خونخوار درندے کی طرح واپس پلٹا۔

اس وقت تک میں تلوار سنبھال چکا تھا۔ ایک بار پھر سے تلواریں نکرانے لگیں اور شور بلند ہونے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہالی کو کس طرح اپنے ہمدرد ہونے کا یقین دلاؤں۔

آخر ایک موقع میرے ہاتھ آ گیا۔ ہالی کی تلوار مجھ پر وار کرتے ہوئے لکڑی کے ایک ستون ٹکڑھٹس گئی۔ میں نے پاؤں کی زوردار ٹھوک سے ہالی کو پرے دھکیل دیا اور پھر تلوار کی نوک ہالی کی گردن کے ساتھ لگا دی۔ وہ نہبتا اور بے بس ہو چکا تھا۔ میں نے تیزی سے پینٹر ابدلا اور پیچھے سے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ تلوار کی نوک میں نے ہالی کے داہنے پہلو کے ساتھ لگا دی اور اپنے ہونٹ اس کے کان کے قریب لے جا کر بہت آہستہ سے بولا۔ ”ہالی! میں تمہارا

ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔ میں تمہیں برب وادی واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔۔۔۔۔ برب وادی جہاں تمہاری جان۔۔۔۔۔ تمہاری۔۔۔۔۔ بیوی ساسا تمہارا بے تابی سے انتظار کر رہی ہے۔“

بالی نے مجھے گھما کر اپنے گرد دیا۔۔۔۔۔ اور مجھ سے گھٹم گھٹا ہو گیا۔ میں نے قریب سے بالی کا چہرہ دیکھا تو وہاں عجیب تاثرات تھے، صاف نظر آرہا تھا کہ میری بات نے اس کے سینے میں ہلچل مچا دی ہے۔

تلوار میرے ہاتھ سے بھی چھوٹ چکی تھی۔ میں نے ایک منظر صاف دیکھا تھا کہ ایک وقت بالی میری تلوار کو آرام سے اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا مگر اس نے تلوار سے نگاہیں پھیر لیں تھیں اور یونہی مجھ سے گھٹم گھٹا رہا تھا۔ اس کی پکڑ میں بھی وہ پہلے والا دم خم نہیں رہا تھا۔

ہم ایک دوسرے سے گھٹم گھٹا تھے کہ ایک ڈراؤنی چیخ کے مشابہہ ایک آواز ابھری اور پھر پھیلتی چلی گئی میں نے دیکھا کہ ایک دم سے کالی فوج میں بے چینی اور ابتری پھیل گئی۔ بالی بھی مجھے دھکا دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

بوکاشی دیوتا کے کارندے بھاگتے اور اچھلتے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ ہر طرف دھول اڑ رہی تھی چٹیں اور لٹکارے بلند ہو رہے تھے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہوا رہا ہے؟ اب وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ بوکاشی دیوتا اپنی بارہ بیویوں سمیت چاچکا تھا گیلری خالی ہو چکی تھی۔ میں نے حفظ ما تقدم کے طور پر تلوار اپنے ہاتھ میں کر لی۔ کالی فوج کے تمام کارندے قلعے کے بڑے پھانک سے باہر بھاگے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں تلواریں، کلہاڑے اور نیزے تمام رکھے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کسی سمت بھاگتا کالی فوج کے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی نے مجھے آگھیرا۔ ان میں سے ایک مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ایلی نیواڈ! بوکاشی دیوتا تمہاری بہادری کے قائل ہو چکے ہیں۔ انہوں نے حالات کے پیش نظر مقابلہ برابر قرار دیتے ہوئے تم دونوں کی زندگی کا پروانہ جاری کر دیا ہے اب تم دیوتا کی خاص فوج میں شامل ہو چکے ہو۔“

”میرے لئے اب کیا حکم ہے؟“ میں فرط جذبات میں بولا۔

”جلی گوریلوں نے ایک بار پھر سے بوکاشی دیوتا کے محل پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمیں ان گوریلوں کا

ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے اور انہیں یہاں سے مار بھگانا ہے۔“

”جلی گوریلے۔۔۔۔۔ کون ہیں۔۔۔۔۔ اور انہوں نے کیوں حملہ کیا ہے؟“

”اتنا وقت نہیں کہ میں تمہیں تفصیل سے کچھ بتا سکوں۔ بس اتنا جان لو۔۔۔۔۔ یہ گوریلے امن کے

ڈن ہیں۔ یہ اس وادی کے ہنستے ہنستے خاندانوں کو اجاڑ کر خوش ہوتے ہیں۔“ کالی فوج کے سپاہی نے جلی گوریلوں کے بارے میں مجھے مزید معلومات دیں اور مجھے لیتا ہوا قلعے سے باہر آ گیا۔

کالی فوج کے سپاہی کی باتوں سے مجھے پتا چلا تھا کہ جلی گوریلے انتہائی زہریلی مخلوق ہے۔ آج سے پہلے کئی دفعہ اس قبیلے نے بوکاشی دیوتا کے علاقے پر حملہ کیا تھا۔ اور بہت سے بے گناہ انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا ان کا مقصد کچھ نہیں ہوتا بس انسانی خون بہا کر یہ گوریلے خوشی سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

قلعے کا کلاوہ کاٹ کے جب میں کالی فوج کی معیت میں بستی کی طرف مڑا تو ایک عجیب ہولناک منظر میرا منظر تھا۔ جلی گوریلے سینکڑوں لوگوں میں صاف پہچانے جا رہے تھے۔ وہ سب ٹھگنے لڑکے جنگلی تھے۔ ان کے جسموں پر بکثرت بال تھے۔ یکدم جھماکا سا ہوا اور وہ منظر میری نگاہوں میں بازہ ہو گیا جب میں گوگی کی اطلاع پر جنگل میں گینڈے کی سربریدہ لاش دیکھنے گیا تھا۔ وہاں میں نے گئے درختوں کی اوٹ میں ایک جنگلی کو دیکھا تھا جس کے جسم پر بکثرت بال تھے اور جس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دھک رہی تھیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جنگلی جلی گوریلا ہی تھا جلی گوریلے ہنگڑوں کی تعداد میں گھوڑوں پر سوار کالی فوج سے بہرہ ور تھا۔ وہ تلواریں چلا رہے تھے لکڑی کے ہل کی پھونکی سے تیر برسا رہے تھے۔ ان کے وحشی لٹکارے گونج رہے تھے۔ میں کالی فوج کی معیت میں ”میدان جنگ“ میں اتر گیا۔ جلی گوریلے انسان کاٹتے چلے آ رہے تھے یوں لگتا تھا وہ انسان نہیں فزاک خونی درندے ہیں جو انسانی گوشت کے ٹکڑے اور خون کے فوارے دیکھ کر سکون محسوس کرتے ہیں۔

میں بے درخ اپنی تلوار چلاتا جا رہا تھا۔ میں نے چھ کے قریب جلی گوریلوں کو کاری زخم لگائے اور گھوڑوں سے نیچے پھینک دیا۔ یہ لڑائی تقریباً ایک گھنٹا جاری رہی پھر جلی گوریلے اپنے کئی ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

سہ پہر ہو چکی تھی سورج مغرب میں اپنی آخری کرنیں سمیٹ رہا تھا میدان جنگ میں جلی گوریلوں کی لاشیں کھلے آسمان تلے پڑی تھیں۔ کالی فوج کے بھی کافی سپاہی مارے گئے تھے جبکہ بچیں نمک کے قریب زخمی ہو گئے تھے۔

مجھے بوکاشی دیوتا کے دربار خاص میں لے جایا گیا۔ محل کی خوبصورتی، پھیلاؤ اور شان و شوکت انوکھے میں دنگ رہ گیا۔ دبیز قالین۔ مخملیں پردے، بلند چھتیں اور منقش ستون، یہ کسی صورت کسی جنگل

میں کھڑا محل نہیں لگتا تھا۔ کالی فوج کے بہت سے سالار اور بوکاشی دیوتا کے مصاحبین دربار میں براجمان تھے مجھے بھی ایک نشست پر بٹھا دیا گیا۔ بوکاشی دیوتا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ معاً ایک مخصوص سریلی آواز بلند ہوئی اور سامنے اونچی دیوار سے پردہ ہٹا چلا گیا۔ میں وہ منظر دیکھ کر آنکھ جھپکنا بھول گیا۔

ایک بہت بلند قامت کا بن مانس میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بن مانس پورا کا پورا سفید رنگ مرمر سے تراشا گیا تھا۔ مشالوں کی روشنیوں سے وہ بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ دربار میں موجود سب لوگ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چار ونا چار مجھے بھی ان کی تقلید کرنا پڑی تھی۔ بن مانس کا منہ پورا کا پورا کھلا ہوا تھا اور اس کھلے منہ میں جو شخص کھڑا تھا وہ بوکاشی دیوتا تھا۔ اس کی شان و شوکت دیکھنے کے لائق تھی حسب معمول اس کا پورا چہرہ اتنی خود میں ڈھکا ہوا تھا اور صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہی پراسرار آنکھیں جن میں خون کے ذورے تیرتے تھے۔ وہ اپنی عالی شان نشست پر بیٹھا تو تمام درباری بھی اپنی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حسین دوشیزاؤں نے بن مانس کے پورے مجسمے کو گھیر لیا۔ ہر لڑکی نے اپنے ہاتھ میں ایک مشعل تھام رکھی تھی۔ ہر لڑکی نے اپنی مشعل بن مانس کے پیروں میں بنے ہوئے سوراخوں میں چھسائی اور بن مانس کی طرف منہ کر کے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور دائیں بائیں جھول کر منہ ہی منہ میں کچھ بد بداری تھیں۔

تقریباً دس منٹ تک یہ عمل جاری رہا پھر دوشیزاؤں نے اپنے لائے بال کھولے اور جھاڑو کی صورت زمین پر پھیرنے لگیں۔ آخر کار بوکاشی دیوتا نے حکم دیا اور وہ آلتی مالتی مار کے بن مانس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔ بن مانس کا یہ مجسمہ تقریباً پچاس ہاتھ اونچا تھا بن مانس کے کھلے منہ میں اس قدر روشنی بکھری ہوئی تھی کہ دیکھنا محال ہو رہا تھا۔ بوکاشی اسی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا ایک طویل وقفے کے بعد آخر کار اس کی آواز بلند ہوئی۔ وہی مدہوش اور بے چین کر دینے والی آواز..... اس کی آواز نکل رہی تھی اور جیسے فضا میں تیر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ہمیں اپنے گھوڑوں کی زینیں کسنی ہیں۔ ہتھیاروں کو تیز کرنا ہے۔ ارادوں کو مضبوط کرنا ہے اور کالی آندھی بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑنا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کالی فوج کا جھنڈا جلی قہیلے کے ایوانوں میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ کالی فوج کے بہادر سپاہی جلی قہیلے کی فصیلوں کو پھلانگتے جلی گوریلوں کو روندتے ہوئے چلے جا رہے ہیں ہاں..... ساتھ ساتھ وہ وقت آن پہنچا ہے اب ہمیں..... جلی قہیلے پر آخری اور کاری ضرب لگانی ہے۔ اس

کے بعد کوئی وحشی فوج ہمارے بچوں کو نہیں مارے گی..... کوئی ہماری عورتوں کو بے عزت نہیں کرے گا..... کوئی ہماری فصلوں کو نہیں اجاڑے گا۔ پچاس سال سے جاری یہ لڑائی اب اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ آج کے دن سے بھر پور تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ آج سے ٹھیک چالیس دن بعد ہمیں موت بن کر جلی قہیلے کے سر پرے سوار ہونا ہے۔ ہمیں اس کی گمری میں جا کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفہ ہستی سے مٹانا ہے۔

میں کالی فوج کے یہاں بیٹھے تمام سالاروں کو حکم دیتا ہوں کہ اپنے اپنے دستے گھروں اور ٹلوں سے نکال کر کھلے آسمان تلے پہنچ جائیں۔ چالیس دن تک رات نہیں ہوگی۔ دن ہی رہے گا۔ تم لوگ اب اس وقت تک عیش و آرام کو خیر باد کہہ دو جب تک جلی قہیلے کا اس دھرتی سے خاتمہ نہیں کر لیتے۔“

بوکاشی دیوتا کی بات ختم ہوئی اور ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ سب کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ درباری محفل برخاست ہو چکی تھی بن مانس کے دیویہکل مجسمے کو پھر سے پردے نے ڈھانپ لیا تھا۔ ہر طرف چہ گویاں گردش کرنے لگیں تھیں۔ درباری جو شیلے انداز میں نعرہ زنی کر رہے تھے۔ اسی دوران پروے کے پیچھے آلتی مالتی مارے پٹی دوشیزائیں پردے سے طلوع ہوئیں اور آٹا ٹاٹا ایک بے ہنگم اور بے ہودہ رقص شروع ہو گیا۔ کالی فوج کے سپاہی بھی دیوانہ وار ناچنے لگے۔ سیٹیاں اور آلودہ نعرے ابھرنے لگے۔ معاً ایک مضبوط ہاتھ میرے کندھے پر جم گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں جم کئی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قہر ٹوٹ رہا تھا۔

وہ نہایت زہریلے لہجے میں بولا۔ ”علی نواز! اپنی زندگی کے چند دن اور جی لو..... اس کے بعد ذلت ناک موت تمہاری منتظر ہوگی۔ میں نے ایک دن تمہیں کہا تھا نا کہ تم مجھے نہیں جانتے میں بہت برا آدمی ہوں میں..... تم نے میری پیاری بھانجی رینا کو مار ڈالا..... میں صرف اپنا یہاں آنے کا مقصد پورا کر لوں پھر یقین مانو..... میں تمہیں اتنی اذیت دے کر ماروں گا کہ تمہاری روح بھی بھٹکتی پھرے گی۔“ میں جم کیٹی کی ساری بات سن کر بالکل خاموش رہا۔ اتنے میں میرے داہنے کان کے پاس دوسری آواز ابھری۔ وہ شاہنواز تھا۔ کہنے لگا۔ ”ہاں علی نواز! ہم اپنا مشن پورا کر لیں اس کے بعد ہم تمہیں یہاں..... زمبابوے سے بھاگنے نہیں دیں گے۔ تمہارے مصیبت کے دن شروع ہو چکے ہیں تم نے ہماری بنی بنائی گیم خراب کی ہے ہمارے گروپ کی ہائی کمان کی طرف سے تمہاری دردناک موت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔“

اسے سر سے بلند کر دیا۔ اس نے کھینچ کر تلوار نیا م سے نکال لی مگر اس سے پہلے میں اسے پتھر لی زمین پر پٹ چکا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی تلوار والی کلائی تھام لی اور میری دو تین ٹھوکروں نے ہی اس کا دم خم نکال دیا۔ قدموں کی آہٹ ہوئی تو میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا وہاں شاہنواز ہاتھ میں تلوار سونے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اچانک میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لہرائی۔ دل کے کسی گوشے میں یہ امید زندہ تھی کہ شاہنواز آخر میرا بچپن کا بھولی ہے کسی آگہی کے ایک لمحے میں اس کی دوستی جاگ اٹھے گی وہ واپس پلٹ آئے گا مگر شاید میں غلطی پر تھا وہ میری دشمنی میں شاید اتنی دور نکل چکا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ وہ تلوار اٹھائے دیوانہ وار بھاگا آ رہا تھا اس کے پیرو بگڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھی گوگی کے ہاتھ سے تلوار چھین لی تھی اور مقابلے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ رقص و سرور بند ہو چکا تھا اور سب دلچسپی سے یہ مقابلہ دیکھنے لگے تھے جیسے یہ سب ان لوگوں کے لئے زندگی موت کی بجائے نمئی کھیل ہو۔ وہ تالیاں پیٹ رہے تھے اور نعرے لگانے لگے تھے۔ آنا فانا ہم دونوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔ شاہنواز بھرپور انداز میں تلوار چلا رہا تھا یوں لگتا تھا وہ مجھے کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی تلوار جیسے میرے خون کی پیاسی ہو چکی تھی۔ میں صرف اپنا دفاع کر رہا تھا شاہنواز کو دم لگانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہو رہی تھی اچانک کسی نے پیچھے سے میرے بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر مجھے دبوچ لیا۔ جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ گوگی ہے میں نے کوئی موقع ضائع کئے بغیر کہنی کی ضرب اس کے پیٹ میں لگائی۔ اس کی گرفت یکدم ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک اور کہنی کی ضرب لگائی پھر گھوم کر ایسی ٹانگ گھمائی کہ وہ شراب کے ایک بڑے مٹکے کے ساتھ ٹکرایا اور جنگلی شراب مٹکا ٹونے سے جھرا جھری بنے لگی۔ اس دوران شاہنواز ایک بار پھر میرے سر پر سوار ہو چکا تھا میرا حوصلہ بھی جواب دیتا جا رہا تھا میں آگے بڑھا اور وار کرتا چلا گیا۔ میرا مقصد اس کے ہاتھ سے تلوار گرانا تھا آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تلوار شاہنواز کے ہاتھ سے چھوٹی اور میں نے تلوار کی نوک اس کی گردن کے ساتھ لگا دی۔ غصے کے عالم میں شاہنواز کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور آنکھوں میں قہر کی جلیاں کڑک رہی تھیں۔

اچانک ایک طرف سے تالیوں کی آواز ابھری۔ میں اس طرح دیکھتا چلا گیا وہاں ایک عورت کھڑی تھی جو شاید بوکاشی دیوتا کی بیوی تھی۔ اس کے سر پر قیمتی موتیوں کا تاج دھرا تھا وہ نہایت حسین و جمیل تھی اس کی گھٹن گھریا لے بال تاج سے نکل کر شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ شاہانہ مہمکت سے آگے بڑی اور ریلے لہجے میں بولی۔ ”ہم تمہارا کھیل دیکھ کر خوش ہوئے..... تمہارے سالار کا نام کیا

”ہاں علی نواز!“ یہ گوگی تھا جو برہنہ تلوار لئے میرے سامنے آن کھڑا تھا۔ ”ہاں علی نواز! تھوڑے دن موج میلہ کر لو وہ لڑائی پھر وہیں سے شروع ہوگی جہاں تم چھوڑ کر گئے تھے..... یاد ہے نا تمہیں.....“ گوگی مجھے یاد دلاتے ہوئے بولا۔ میں ہنوز خاموش تھا بس ایک نیلی آگ تھی جو میرے سینے میں جلنے لگی تھی۔

تقریباً ایک ماہ ہونے کو آیا تھا ایک بے نام سی کک تھی جو تہہ دل مجھے کچوکے لگاتی رہتی تھی۔ میں اپنے تمام کام سرانجام دیتا چلا آ رہا تھا۔ مختلف طرح کے جذبات بھی دل میں ڈوبتے ابھرتے رہتے تھے سب کچھ معمول کے مطابق تھا مگر ان تمام جذبات و احساسات سے قطع نظر ایک الاؤ ہر لوہ دل کے کسی نہاں گوشے میں سلگتا رہتا تھا ایک بے نام تڑپ رگوں میں آتش دھکیلتی رہتی تھی جیسے بہت کچھ تہہ دل میں جمع ہوتا جا رہا تھا اور جسے جمع ہونے والی اس نا دیدہ شے کو ایک دن پھٹک جانا تھا۔ میں حتی الامکان اپنے لہجے کو اعتدال میں لاتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات سب لوگ کان کھول کر سن لو..... میں رینا کا قاتل نہیں ہوں۔ میں نے رینا کو نہیں مارا۔“

”ہاں..... ہم تینوں جانتے ہیں کہ تم نے رینا کو نہیں مارا..... مگر انکل مدثر اور ہیری کرس یہی جانتے ہیں کہ تم رینا کے قاتل ہو۔ ہم ان دونوں کو بتا چکے ہیں کہ ہم علی نواز کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔“ جم کیٹی ہلکا سا ہتھکڑ مار کے بولا۔

”اور ایک یہی بہانا ہے ہمارے پاس تمہیں قتل کرنے کا..... نہیں تو انکل مدثر ہم سے بہت ناراض ہوں گے۔“ شاہنواز معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

رقص کرتی ہوئی ایک دو شیزہ ہمارے قریب آئی وہ میری طرف بڑھنا چاہتی تھی کہ شاہنواز نے راستے میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور رقص کرنے لگا۔ وہ دو شیزہ بار بار مڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے جب غور سے اسے دیکھا تو مجھے سمجھ آ گئی وہ پوہا شے تھی۔ وہی پوہا شے جو رواؤڈ کے محل میں میری خدمت پر مامور تھی۔ جم کیٹی نے وہ جگہ چھوڑی تو گوگی میرے قریب چلا آیا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت سرد لہجے میں بولا۔ ”خان صاحب! گوگی نام ہے میرا..... ممبی کا ایک نمبر غنڈہ رہ چکا ہوں اس دن تو میرے ہاتھ سے بچ نکلے تھے مگر یاد رکھو بہت جلد یہ ”غنڈہ“ تمہارے مقابل ہو گا پھر یہ تمہیں بتا دے گا کہ گوگی کس بلا کا نام ہے؟“ گوگی کا جملہ ابھی مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ پتا نہیں مجھے کیا ہوا ایک آگ سی دھند کی مانند داغ میں چھا گئی میں نے آنا فانا گوگی کو دونوں ہاتھوں پے اٹھایا اور ستون پر پٹ دیا۔ وہ نیچے گر کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھوں کی پکڑ میں آیا اور میں نے



ہے؟“

”میں ابھی یہاں نیا آیا ہوں۔“

”کہیں تم وہ تو نہیں جس کا آج صبح قلعے میں بالی کے ساتھ مقابلہ تھا؟“

”جی ہاں..... میں وہی ہوں.....“

بہت خوب..... روبان..... اسے ہماری قیام گاہ میں لے آؤ۔“ عورت نے روبان کا نام لیا تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ میں نے پلٹ کر اس جانب دیکھا جہاں روبان کو پکارا گیا تھا کالی فوج کا ایک سپاہی آگے بڑھا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا اور بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ میں روبان کے نام سے چونک گیا تھا جیسے سردار روبان یہاں پہنچ گیا ہے مگر میں یہ بھول بیٹھا کہ روبان کسی اور کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ میں کالی فوج کے سپاہی کے ساتھ چلتا ہوں بوکاشی دیوتا کی بیوی جس کا نام ”بیلہ“ تھا کی قیام گاہ میں داخل ہو گیا۔ قیام گاہ کا اندرونی منظر دیکھ کر حسب معمول میں حیران رہ گیا۔ ریشمی پردے، قیمتی مشعلی فانوس، حریری قالین، شاندار مسہری، وہ مسہری پے بڑی تمکنت سے جلوہ افروز تھی اس کی بلوریں آنکھوں میں کوئی بات تھی، کوئی چمک تھی جو اس کے دل کے رازوں کی چٹلی کھاتی تھی۔ وہ پرکھنے والی نظر سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔ اس نے مجھے بیٹھے کا اشارہ کیا اور خود کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ پھر ٹہلنے ٹہلنے وہ رکی اور دونوں ٹھیلیوں کو آپس میں جوتے ہوئے بولی۔ ”ایلی نیواز! نام ہے تمہارا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھر سے ٹہلنے لگی۔ چلتے چلتے ہوئے وہ پھر بولی۔ ”جلی گوریلوں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“

”یہی کردہ خونخوار درندہ صفت قوم ہے۔“

”اس کے علاوہ..... کیا جانتے ہو؟“

میرا جواب نفی میں تھا۔ بیلہ چھت کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”ایلی نیواز! بوکاشی دیوتا کے حکم سے چالیس دن بعد جلی قبیلے پے شب خون مارا جانا ہے مگر ان کو ہرانا ان کو مات دینا اتنا آسان نہ ہوگا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“ میں بے تکلفی سے بولا۔

”وہ ایک پراسرار درہ ہے، وہ ایک سحر انگیز وادی ہے۔ یہاں سے بیس کوس مغرب کی جانب واقع ہے۔ کالی فوج پہلے بھی کئی دفعہ وہاں حملہ آور ہو چکی ہے مگر ہر دفعہ ناکام لوٹی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں اس درے پے دیوتاؤں کا قہر ٹوٹ کے برستا ہے وہاں لڑتے ہوئے کالی فوج کے سپاہی ادھ موئے ہو جاتے ہیں ان کا سانس بری طرح پھول جاتا ہے آنکھیں باہر کو ابل پڑتی ہیں سانس لینا

بٹوار ہو جاتا ہے۔“

”قطع کلامی کی معافی چاہوں گا، جلی گوریلوں کی بھی تو ایسی حالت ہو جاتی ہوگی جیسی کالی فوج کی ہوتی ہے۔“ میں بولا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہی مسئلہ کالی فوج کو درپیش ہے۔ اُس وادی میں لڑتے ہوئے صرف ان کا ہی سانس اکھڑ جاتا ہے اور وہ نیم جان ہو کر اس وادی سے واپس بھاگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں زیر لب بڑا۔

بیلہ نے شاید میری بات سن لی وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ایلی نیواز! ایسا ہی ہے۔ جیسا میں نے تمہیں بتایا بالکل ایسا ہی ہے۔“ وہ تکرار آمیز لہجے میں بولی۔ اچانک چھت پے آہٹ سی ہوئی اور بیلہ کی آنکھوں میں خوف لہرا گیا وہ تیزی سے پلٹی اور بولی۔ ”ایلی نیواز! اب تم جاؤ۔ میں تمہیں پھر کسی وقت بلاؤں گی۔“

میں جب باہر نکلا تو کالی فوج کا سپاہی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ مجھے لیتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا۔ اچانک کالی فوج کا سپاہی دھیمے انداز میں ہنسا۔ تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”علی نواز! تمہاری تمام باتیں سرداروں والی ہیں مگر چہرہ بھولنے والی عادت سرداروں والی نہیں..... میں روبان ہوں..... سردار روبان۔“

”سردار روبان! آپ.....؟“ میں خوشی سے چیختے ہوئے بولا۔

”ہاں علی نواز! میں..... بوگالے تو مجھے مار چکا تھا مگر دیوتا نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ اب دیکھو میں تمہارے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں تم سوچ بھی نہیں سکتے جب میں نے تمہیں قلعے میں زندہ سلامت دیکھا تھا تو میں کتنا خوش ہوا تھا۔ میں نے دیوتاؤں کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔“

”سردار! ہم اب کدھر جا رہے ہیں۔“

”بوکاشی دیوتا نے تمہیں ملاقات کا شرف بخشا ہے۔ میں تمہیں دیوتا کی خاص نشست گاہ کی طرف لے جا رہا ہوں۔“ مختلف گلیوں سنگ مرمر کی خوبصورت راہداریوں سے گزرتے ہوئے آخر ہم بوکاشی دیوتا کی خاص نشست گاہ میں داخل ہو گئے۔ وہ کمرہ تھا یا کوئی خواب گاہ، مختلف رنگوں کی روشنیاں تھیں جو فضا میں تیر رہی تھیں۔ ایک نہایت خوبصورت مسہری فضا میں معلق تھی۔ ہر طرف سے خوشبو اڑ رہی تھی ہلکی ہلکی بوند باندی کی صورت پھوار پڑ رہی تھی۔ یہ بوند باندی یہ پھوار آسمان سے نہیں گر رہی تھی بلکہ کمرے میں سے خود بخود ہی پھوٹ رہی تھی۔

وہی غنودگی پھر حواس پر چھانے لگی جس نے اس وقت میرا گھیراؤ کیا تھا جب میں پہلی بار بوکاشی دیوتا کے روبرو حاضر ہوا تھا۔ میں سر جھٹک رہا تھا اور خود کو چاق و چوبند رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردار روبان مجھے وہاں چھوڑ کر واپس پلٹ گیا۔ اچانک رنگین دھندلے میں سے ایک نیم عریاں لڑکی نکلی اور میرا ہاتھ تھام کر ہوا میں معلق مسہری کی طرف بڑھنے لگی۔ جلد ہی میں ریشم کے نرم گالوں کی مانند نشست پر براجمان تھا۔ میں اس کے اندر دھنستا چلا جا رہا تھا۔

رنگین روشنیوں کے پیچھے چھپی مسہری میں سے بوکاشی دیوتا کی آواز بلند ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جوان! ہم تمہاری بہادری دیکھ کر خوش ہوئے ہیں۔ بہادر انسان ہماری کمزوری ہیں۔ اسی بناء پر ہم تمہاری ہر خطا معاف کر رہے ہیں۔ مگر ہماری ایک شرط بھی ہے کہ ہم جو کچھ بھی کہیں تمہیں آنکھیں بند کر کے ہمارے حکم کا پاس کرنا ہوگا اور اگر کہیں..... تم نے ہمارے حکم سے ذرا سی بھی سرتابی کی تو سمجھو وہ سزا تمہارا مقدر ہوگی جس کا نام سن کر اس دھرتی کے بڑے بڑے سوراخوں کی بھی گھنگی بندھ جاتی ہے۔ وہ سزا زرد زوف کی سزا ہے۔

ہم نے تمہیں اپنی خاص فوج میں شامل کر لیا ہے۔ چالیس دن بعد جلی وادی میں جو معرکہ ہونے والا ہے تم اس میں بھرپور شرکت کرو گے۔ اب تم جاسکتے ہو۔ ہمارے محل میں ہی تمہارے لئے خوابگاہ کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ دو دایاں بھی تمہاری خدمت پر مامور رہیں گی۔ اور ہاں..... ہمیں معلوم ہے کہ بوگا لے تمہاری جان کا دشمن ہوا پھرتا ہے۔ وہ اس وقت برب وادی میں گیا ہوا ہے۔ ہم نے اسے سمجھا دیا ہے کہ تم ہماری خاص فوج میں شامل کر لئے گئے ہو۔ اس لئے وہ تم سے الجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

میں جب وہاں سے اپنی قیام گاہ میں پہنچا تو کافی مطمئن تھا۔ میری خدمت پر مامور لڑکیوں میں ایک پوباشی تھی جبکہ دوسری لیزا تھی وہی سنہرے بالوں والی انگریز لڑکی جو بارہ دن ایک مکان میں میرے ساتھ رہی تھی۔ پوباشی کے آنکھوں میں ہمیشہ سے میرے لئے کوئی پیغام رہا تھا۔ برب وادی میں بھی وہ میری خدمت میں ہر وقت جتی رہتی تھی۔ وہ بڑی عجیب و غریب لڑکی تھی۔

کھانا کھا کر میں سو گیا پھر رات کے پچھلے پہر اپنے پروگرام کے مطابق اٹھ گیا۔ دونوں لڑکیاں میرے کہنے پر برابر والے کمرے میں سو رہی تھیں۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر محل سے باہر نکل آیا۔ رات کے آخری پہر باہر دن کا گمان ہو رہا تھا۔ ہر طرف آگ کے الاؤ روشن تھے۔ کالی فوج کے جنگجو تلوار زنی اور زور آزمائی کی مشقیں کر رہے تھے۔ رات کے اس پہر ایک عجیب سا سماں بندھا ہوا تھا اور اس کی

یہ تھی کہ بوکاشی کے حکم کے مطابق چالیس روز تک دن ہی رہنا تھا۔ آگ اور دھوئیں کے پیچھے کالی فوج کے جنگجوؤں کے وحشی اور کرخت چہرے بڑے بڑے اسرار نظر آرہے تھے۔ کہیں..... کہیں آگ کے الاؤ کے گرد نیم برہنہ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ میں یہ سارے مناظر پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ اس قلعے کی عقبی جانب تھا جہاں میں نے پہاڑ کی ایک پیالہ نما جگہ پر دو چراغ جلتے دیکھے تھے۔ میں قلعے کا کلاوا کاٹتے ہوئے بہت جلد مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا۔ ہوا ہنوز چل رہی تھی اور وہ عجیب و غریب منہ کے چراغ مسلسل جل رہے تھے۔ رات کے اس پہر وہاں عقیدت مندوں کا رش بہت کم تھا۔ میں گھوڑے سے اتر کر ان چراغوں کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں اس وقت تین عقیدت مند عبادت میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک کافی بوڑھا شخص بھی تھا۔ میں انہی کے انداز میں وہاں بیٹھ گیا اور اٹھ اٹھا کر اپنے ”رب“ کو یاد کرنے لگا۔ میری نگاہیں ان چراغوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ایک چراغ بڑا تھا جبکہ دوسرا نسبتاً چھوٹا تھا۔ دونوں چراغ سفیدی لکڑی جیسی دھات کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ آگے بڑھا کے اسے چھونا چاہا تو بوڑھا شخص یکدم آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا میں نے بہت مشکل سے یہ کہہ کر جان چھڑوائی کہ میں یہاں پر نیا آیا ہوں اور میں جلی وادی کی طرف جانے والی فوج میں شامل ہوں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں یہاں آیا ہوں اور جلی گوریلوں کے خلاف والے معرکہ میں شامل ہوں تو ایک دم ہی اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر مجھے بوکاشی یوتا کی سلطنت کے اصولوں اور ضابطوں کے بارے بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ یہ اس وادی کی سب سے تہرک جگہ ہے۔ یہ دونوں جلتے چراغ اس وادی کی سلامتی کی علامت ہیں۔ بوکاشی دیوتا ہی ہمارا رب کچھ ہیں کیونکہ برب دیوتا ان پر مہربان ہیں۔

”بابا یہ برب دیوتا کون ہیں.....؟“

”بیٹا! وہ ہمارے سب سے بڑے دیوتا ہیں۔ انہوں نے ”بھیرا کے چار پاک ہیرے“ بوکاشی یوتا کو عنایت کئے ہیں۔“

”بابا! یہ بھیرا کے چار ہیرے کیا چیز ہیں؟“ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔

اس بوڑھے شخص نے مجھے جو کچھ بتایا اس نے میری دھڑکنوں میں ہلاکی بے چینی بھردی۔ اس نے کہا کہ ”بھیرا کے چار ہیرے وہ چیز ہیں کہ جس کے پاس یہ ہوں ساری آسمانی طاقتیں اس کے اٹھ ہو جاتی ہیں۔ ساری زمینی قوتیں بھی اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ وہ خوش قسمت پھر اٹا کھاتا ہے۔ غیر معمولی، غیبی اور پُر اسرار طاقتیں اس کا ہتھیار بن جاتی ہیں۔ پھر کوئی طاقت اس کا

”دن نہ مارے۔“

”بابا! بھیڑا کے وہ چار ہیرے اس وقت کہاں ہیں.....؟ میرا مطلب ہے کہ وہ کسی محفوظ مقام پر ہیں نا!“ میں بولا۔

”ان ہیروں کا بوکاشی دیوتا کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہیں بہت ہی محفوظ مقام پر ہیں۔ وہاں تک کسی انسان کی رسائی اتنا آسان کام نہیں ہے۔“

ان بات کر کے بوڑھا شخص وہاں سے اٹھ گیا۔ بوکاشی دیوتا اور اس وادی کی سلامتی کی دعائیں کرتا وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میری اس بستی کے ایک دو اور آدمیوں سے ملاقات ہوئی وہ بھی بوکاشی دیوتا کی سلامتی کی دعائیں مانگتے نظر آتے تھے۔ ان کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوکاشی دیوتا کی سلطنت میں بہت خوش ہیں اور بوکاشی دیوتا کی زندگی کا سایہ وہ ہمیشہ اپنے سروں پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں بڑی عجیب کشش کا شکار ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہاں ہر چیز پریشان کرنے والی تھی۔ اب چار پراسرار ہیروں کے متعلق انکشاف ہو رہا تھا۔ میں عجیب الجھن میں

نہا۔ ایک طرف نیلگوں آگ تھی جو سینے میں لمبے لمبے فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک طرف میری سب سے بڑی خوشی والی بات تھی اور ایک طرف بوکاشی دیوتا کی ناقابل فہم پراسرار بستی تھی۔ میں اس ٹرائی اینگل میں بڑی طرح الجھن کر رہا تھا۔ میں شاید پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔ ایجنز برائت کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ ہر حیرت انگیز بات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔ مگر اس حیرت ناک وادی میں پہنچ کر جو حالات میرے ساتھ پیش آئے تھے انہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں خود کو بے بس و لاچار محسوس کرنے لگا تھا۔ بوکاشی دیوتا ایک ایسی پراسرار بستی کا نام تھا جو غیب کا علم جانتا تھا جو دلوں میں اٹھنے والے خیالات پڑھ لیتا تھا، جو میلوں دور بٹا حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا تھا۔ بوکاشی دیوتا کے متعلق یہ تمام باتیں اگر میں نے کسی اور سے کہی ہوتیں تو میں اس کی دماغی حالت پر شک کرتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ میں یہ سب ہوشربا واقعات منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ بوکاشی دیوتا نے میرے ساتھ پیش آنے والے تمام فحاش من وعین بیان کر دیئے تھے یہاں تک کہ جب بوگالے نے بھوری چٹانوں سے پار بھاگتے سائے اپنا عصا میرے سینے میں گھونپنا چاہا تھا اور میں اپنی جگہ ٹھک گیا تھا۔ میرا وہ ٹھکنا بھی بوکاشی دیوتا کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا تھا۔

یہ میں کس جہان میں پہنچ گیا تھا؟ میرے دل میرے دماغ میری سوچ پر بھی کسی کی حکمرانی

کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

ہمارے بوکاشی دیوتا بھی انہی طاقتوں سے مالا مال ہیں۔ کسی طرح کی مخالف قوت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ مہمان ہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جو چاہیں سن سکتے ہیں وہ ہر ایک کے دل کی بات تک جان لیتے ہیں۔ کئی کوس دور بھی کوئی واقعہ ہوتا ہے تو بوکاشی دیوتا یہاں بیٹھے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ کوئی چیز کوئی بات ان سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔“

”مگر بابا! جلی گوریلے.....؟“ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں جلی گوریلے.....“ بوڑھے شخص نے ایک ہنکارہ سا بھرا۔ ”جلی گوریلے بھیڑا کے وہ چار ہیرے..... بوکاشی دیوتا سے چھیننا چاہتے ہیں۔ یہ لڑائی تقریباً پچاس سال سے جاری ہے۔ وہ یہ چار ہیرے چھین کر اس جنگی دھرتی میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہیرے جس کے پاس ہوں گے ساری طاقت اس کے پاس ہوگی اور جنگی دھرتی کے تمام قبائل اس کے حکم کے پابند ہوں گے۔ ہیروں کا مالک جو کہے گا وہ اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کریں گے۔“

”مگر..... جلی گوریلے بوکاشی دیوتا کے حکم کے پابند نہیں.....؟ کیا وہ اس جنگی دھرتی سے باہر ہیں؟“ میں نے نکتہ اٹھایا۔

”جلی گوریلوں کا سردار ”ببا کو“ ایک ضدی اور خود پسند شخص ہے۔ وہ بوکاشی دیوتا کی حکومت ماننے کیلئے قطعی طور پر تیار نہیں۔ اس کے پاس ایسا ایک ہتھیار آچکا ہے جس کی مدد سے وہ بوکاشی دیوتا کی غیبی قوتوں کے آگے دیوار کھڑی کر چکا ہے۔ اگر یہ دیوار کھڑی نہ ہوتی تو بوکاشی دیوتا کب کے ببا کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بنا چکے ہوتے۔“

”وہ کیا ہتھیار ہے جس کی بدولت ببا کو بوکاشی دیوتا کے عتاب سے محفوظ ہے۔“ میں بے چینی سے بولا۔

”وہ ایک چاندی کی مورتی ہے جس پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ وہ غیر معمولی چاندی کی مورتی دیوتا کی غیبی طاقتوں کو روکے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بوکاشی دیوتا جلی گوریلوں کو غیب کی طاقت سے نہیں دیکھ پاتے اور جلی گوریلے آنا فنا بستی پر حملہ کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ جلی گوریلے تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اس لئے بوکاشی دیوتا نے دور دراز کی بستیوں سے بہادر نوجوانوں کو اکٹھا کیا ہے کہ وہ جلی وادی پر آخری اور فیصلہ کن وار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ برسوں سے چلے آ رہے اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہماری اس پراسرار وادی پر پھر سے کوئی شب

قائم ہو چکی تھی۔

میرے دل کے کسی کونے میں یہ موہوم سا احساس ضرور تھا کہ شاید بوکاشی دیوتا کی طاقت کے بارے میں میرا اندازہ کچھ غلط ہو یا مبالغہ آرائی پر مبنی ہو مگر اس وقت میری تمام امیدیں پر پانی پھر گیا جب میں محل میں واپس پہنچا اور مجھے رات کے آخری پہر کی آخری گھڑیوں میں بوکاشی دیوتا کے حضور طلب کر لیا گیا۔ میرے سینے کی نیلگوں آگ کا تعلق رینا کی موت سے تھا۔ میں اپنی اس معصوم بہن کو بھولا نہیں تھا۔ میں گلے میں پہنا ہوا اس کالا کٹ دن میں کئی بار دیکھتا تھا کئی بار چومتا تھا۔ اس حرکت سے سینے میں جلنے والی آگ مزید بھڑک اٹھتی تھی۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہو رہا تھا کہ مجھے طلب کر لیا گیا تھا۔ جب میں نشست گاہ میں پہنچا تو بوکاشی دیوتا اونچی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی جادوئی آنکھیں میرے دل کی دھڑکیں بے چین کئے دے رہی تھیں۔ اچانک اس کی گردن آواز بلند ہوئی وہی بے چین کر دینے والا لہجہ۔ ”جوان! تمہارے من میں جو غلط خیالات پُل رہے ہیں وہ تمہیں موت کی دہلیز پر پہنچا کر چھوڑیں گے۔“

”بب..... بوکاشی دیوتا! ام..... میرے دل میں کوئی غلط خیال نہیں.....“ میں اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے بولا۔

”کیا تم اس سرنے والی لڑکی کا بدلہ لینا نہیں چاہتے۔ یاد رکھو تمہارے دل کی کوئی دھڑکن بھی ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تم جتنا غلط سوچو گے اتنی ہی اپنے لئے مشکلات پیدا کرو گے۔ یاد رکھو جو ہمارے لئے خالص نہیں ہوتا اس کے لئے پریشانیوں کے درکھل جاتے ہیں۔ اس کے لئے اس دھرنی میں کہیں جائے پناہ نہیں رہتی۔“

میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ذہن پر جیسے غنودگی چھائی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا یہ سب کچھ خواب ہے محض ایک ڈراؤنا خواب۔ میں آنکھ کھولوں گا تو زمبابوے میں انکل مدٹر کے گھر بستر پر رہا ہوں گا..... یا آنکھ کھولوں گا تو پاکستان میں ہوں گا..... ماں کہہ رہی ہوگی۔ ”اٹھ نواز بیٹا! دیکھ دن کتنا چڑھ آیا ہے۔“ مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ سب خواب نہیں حقیقت تھا۔ جاگتی ہوئی آنکھوں کا حیرت ناک سچ تھا۔

”کیا تمہیں ہماری باتوں کا یقین نہیں آ رہا۔ کیا تمہیں یہ سب خواب کی مانند لگ رہا ہے؟“

بوکاشی دیوتا کے الفاظ کسی ہم کی طرح میرے سر پر پھٹے اور میں حیرتوں کے عمیق سمندر میں غرق ہوتا چلا گیا۔ میں خیالات سے تب چونکا جب ایک خوفناک بیل کے مشابہہ آواز میری سماعت

سے ٹکرائی۔ وہ کالی فوج کا ایک سپاہی تھا جسے دوسرے سپاہیوں نے جکڑ رکھا تھا اور وہ نہایت بھیانک آواز میں چلا رہا تھا اور بوکاشی دیوتا سے معافی کی درخواست کر رہا تھا۔ وہ بوکاشی دیوتا کے چرنوں میں اپنا ہاتھار گڑ رہا تھا مگر اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ بوکاشی دیوتا کے حکم سے اسے زر زوف کی طرف لے جایا جا رہا تھا کہ اچانک بدحواسی کے انداز میں اس نے کالی فوج کے ایک سپاہی کی نیام سے تلوار نکالی اور دوسرے ہی لمحے وہ بوکاشی دیوتا کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت ناچ رہی تھی۔ سب دم بخود کھڑے رہ گئے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سزا پانے والا کالی فوج کا سپاہی ایسی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرے گا۔ سب اپنی جگہ بت بن کر رہ گئے تھے۔ حملہ آور نے پہلا وار بوکاشی دیوتا کے داہنے پہلو پر کیا جبکہ دوسرا بھر پور وار سیدھا بوکاشی دیوتا کے سینے میں گیا۔ تلوار دستے تک بوکاشی دیوتا کے سینے میں داخل ہو گئی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں حیرت و حشم ہو کر رہ گئی۔ ہر زبان گنگ اور ہر نظر پتھرا گئی تھی۔ مگر دوسرا لمحہ اس سے بھی بڑھ کر حیرت لئے طلوع ہوا۔ بوکاشی دیوتا نے ایک جھٹکے سے حملہ آور کو پرے پھینکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تلوار کا دستہ دور جا گر تھا۔ یہ صرف تلوار کا دستہ تھا۔ دستے سے تلوار ناپید تھی..... تلوار کہاں گئی تھی.....؟ اچانک ایک جملہ میری سماعت میں گونجا۔

”تلوار اس کے جسم پر لگنے کے بعد پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔“ تو..... تو کیا..... یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا..... ہاں میں نے دیکھا تھا تلوار بوکاشی دیوتا کے جسم پر لگنے کے بعد پانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ حیرتوں میں ایک اور حیرت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ حملہ آور کو پیروں اور سر کے بالوں سے پکڑ کر ششے نما اس مرتبان میں پھینک دیا گیا جسے زر زوف کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ وہ اس مرتبان میں بری طرح چلا رہا تھا اپنا سر ششے کے مرتبان کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ پھر ایک منظر میں نے دیکھا اور میرا دل حلق میں آ گیا۔ مرتبان کے چلی طرف سے ایک ڈھکن کھول دیا گیا کالی فوج کے سپاہی کے کالے چہرے پے یکا یک بے انتہا پسینہ اُٹ آیا تھا۔ مرتبان کے چلی طرف سے نیلا زہرناک محلول ”زوف“ بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ کالی فوج کا سپاہی مرتبان میں اچھل کود کرنے لگ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ذبح ہوئے بکرے کی طرح چلا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاؤں کا گوشت ہڈیوں سے علیحدہ ہو گیا۔ پھر زر زوف ہڈیوں تک پہنچ گیا۔ یہ ایک سُست اور اذیت ناک عمل تھا۔

سزا پانے والے کا چہرہ یوں تھا کہ جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وہ چہرہ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی حرارت سے عاری نظر آنے لگا تھا۔ زوف جب گھٹنوں تک پہنچا تو سزا

فرق ہوتا چلا گیا۔ میں خیالات سے تب چونکا جب ایک خوفناک بیل کے مشابہہ آواز میری سماعت

کرہ ارض پر ہونا پید ہو چکی تھی میں دھیرے دھیرے اپنا سینہ سہلانے لگا۔

کالی فوج کے سپاہی مجھے لے کر ایک اور سرنگ نما راستے سے آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے انہوں میں مشعلیں تھام رکھی تھیں۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ چلنے کے بعد ہم ایک کھلی احاطہ نما جگہ پر پہنچ گئے۔

یہاں چاروں طرف جا بجا مشعلیں روشن تھیں۔ ایک عجیب سی بدبو نے میرا استقبال کیا تھا۔ مانس لیتے ہوئے میرے سینے میں کثافت ہی کثافت گھل گئی۔ ایک ستون سے پرلی طرف ہوئے تو یرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ ایک پانی کا وسیع جوہڑ تھا۔ جوہڑ کے اوپر بلند چھت تھی اور چھت پر جا بجا دیے کی زنجیروں سے کچھ لٹک رہا تھا۔ وہ کیا چیز تھی میں صحیح طور پر دیکھ نہیں پایا تھا۔ جوہڑ میں دنیا جہان کی غلاظت تیر رہی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر یکدم پانی میں حرکت سی پیدا ہوئی اور دائرے سے کوئی چیز سطح آب پر آگئی۔ وہ بوکاشی دیوتا تھا جو اپنے غیر معمولی وجود اور غیر معمولی طاقت کے ساتھ س غلط پانی میں جاپ کرنے میں مصروف تھا۔ جوہڑ کے اس پانی میں فضلہ، گوہر، کوڑا کرکٹ، کھوپڑیاں، انسانی ڈھانچے، انسانی امتزیاں، بھیڑے اور جہاں بھر کی غلاظتیں تیر رہی تھیں۔ بوکاشی دیوتا اپنے مخصوص لباس میں ہی ملہوں تھا۔ اس کے چہرے پر خود ہنوز برقرار تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح سطح آب پر آنکھیں بند کئے کھڑا رہا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہی آنکھیں جن میں سحر کے طوفان اٹھتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ تیرتا کنارے سے الگا اور پھر تالاب سے باہر آگیا۔ چھت کے کسی حصے سے صبح کے اجالے کی روشنی اندر آرہی تھی۔ بوکاشی دیوتا کو میں اپنے بالکل قریب کھڑے دیکھ رہا تھا۔ اس کی غیر معمولی جسامت دیکھ کر بندہ دنگ رہ جاتا تھا۔ جوہڑ کی غلاظت جا بجا اس کے لباس سے چپک گئی تھی۔ وہ بھاری لہجے میں بولا۔ ”ہاں جوان! تمہارا دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا یا تمہیں اپنی طاقت کے کچھ اور کمالات دکھائیں۔“ خود میں سے جھانکتی ہوئی دو جادوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ بول سکا۔

بونا کاشی دوبارہ گویا ہوا۔ ”یہ دیکھو!“ وہ چھت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ ان لوگوں کے سر ملے رہے ہیں جنہوں نے ہمارے حکم سے سر تابلی کی تھی یا جن لوگوں کے سروں کی ہمیں ضرورت تھی ہم نے وہ یہاں سجا دیئے۔ تمہیں یہ سب دکھانے کا مقصد یہ ہے کہ تم اپنے دل کا میل صاف کر لو۔ بہادر دل ہمارے کمزوری ہیں شاید اسی بناء پر ہم تمہیں معاف کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر یاد رکھو اب تمہاری کوئی بھی غلطی قابل معافی نہیں ہوگی۔“

پانے والے کی رہی سہی مزامت بھی دم توڑ گئی۔ وہ نیم جاں سا ہو کر زوف میں ڈھے گیا۔ میرے سمیت وہاں کھڑے تمام بندوں کے چہرے پسینے سے تر ہو گئے تھے۔ بوکاشی دیوتا رعونت سے اپنی مسند پر جا بیٹھا تھا۔ اس نے تالی بجائی اور دوسرے ہی لمحے ایک دوسرے قیدی کو حاضر کیا گیا۔ وہ جلی قبیلے کا گور یا تھا۔ سزا پانے والے کالی فوج کے سپاہی کا تصور یہ تھا کہ وہ اس جلی گوریلے کو چپکے چپکے خوراک مہیا کرتا رہا تھا حالانکہ بوکاشی دیوتا اسے بھوک کی سزا دے چکا تھا۔ غیب کے علم سے بوکاشی دیوتا کو کالی فوج کے سپاہی کی حکم عدولی کا پتہ چل گیا اور پھر دونوں کو یہاں حاضر کر لیا گیا۔ کالی فوج کا سپاہی اپنی سزا پا چکا تھا۔ اس کا نصف سے زیادہ دھڑ زوف میں تحلیل ہو چکا تھا اب شاید جلی گوریلے کی باری تھی۔ کالی فوج کے سپاہی اسے زنجیروں میں جکڑ کر لائے تھے پھر بوکاشی دیوتا کے حکم سے اسے زر زوف کی دوسری اور سب سے اذیت ناک سزا کیلئے زمین میں سیکنڈوں فٹ نیچے بنے قبر نما کمرے کی طرف لے جایا گیا۔ بوکاشی دیوتا کے حکم سے مجھے بھی ساتھ نیچے بھیج دیا گیا۔ وہ ایک سرنگ نما راستہ تھا جو نیچے ہی نیچے چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں میں کالی فوج کے سپاہیوں کی معیت میں نیچے جا رہا تھا مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ دل پے جیسے بہت سا بوجھ آ رہا تھا۔ بہت زیادہ گہرائی اترنے کے بعد ہم آٹھ فٹ مربع کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ میرے جیسا بندہ بمشکل وہاں سر اٹھا سکتا تھا۔ جلی گوریلے کو کمرے میں پھینک کر اس کی زنجیریں کھول دی گئیں۔ کمرے میں دو ڈرم رکھے تھے ایک ڈرم چھوٹا جبکہ دوسرا نسبتاً بڑا تھا۔ دو ڈرموں میں زوف موجود تھا۔ میرا کھڑے کھڑے وہاں دل گھبرانے لگا۔ کالی فوج کے سپاہی جلی گوریلے کو وہاں پھینک کر واپس پلٹ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ جب ہم سرنگ نما راستے سے باہر نکلے تو ایک سپاہی نے سرنگ کے دہانے پر پے گول منول پتھر کو لڑھکا دیا اور وہ پتھر ڈھلوانی غار میں لڑھکتا چلا گیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے غار کا دھانا اوپر سے کھلا تھا جوں جوں نیچے کو جاتا تھا تنگ ہوتا جاتا تھا۔ کچھ دیر پتھر لڑھکنے کی آواز آتی رہی پھر معدوم ہو گئی۔ پتھر موت کا دروازہ بن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ جلی گوریلہ محاورتا نہیں حقیقتاً زندہ دوڑ رہا ہو چکا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا جب میں اس قبر نما کمرے میں تھا تو کیسے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ اب جلی گوریلہ وہاں قید تھا۔ شاید وہ ہمیشہ کیلئے وہاں قید ہو چکا تھا۔ وہاں کھانے کیلئے کچھ نہیں رکھا گیا تھا۔ زمین سے اتنی نیچے شدید گھٹن کی وجہ سے پیاس بھی بندے کو بہت جلدی لگ جاتی ہے۔ یکا یک میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اب مجھے یاد آیا تھا کہ وہاں اس زمین دوڑ کمرے میں زوف کے ڈرم بھر کے کیوں رکھے گئے تھے۔ یوں لگا جیسے کسی نے میرا سانس مٹھی میں قید کر لیا ہے۔ میں سانس لینا چاہ رہا تھا مگر جیسے اس

دل ہلکا پھلکا تھا۔ دماغ پر بھی کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ گزرے وقت کی ہلکی سی تلخی پر وہ بصارت پر نمودار ہوئی تو میں نے فوراً اپنا خیال ادھر سے کھینچ لیا اور جلدی سے خوابگاہ سے باہر نکل آیا۔ غلام گردشوں اور راہدار یوں سے چلتا ہوا میں ایک باغیچے میں نکل آیا۔ ہر طرف خوبصورت پھول لہلہا رہے تھے۔ مگر میرے لئے سب بے رنگ سا تھا۔ میں انہی پھولاریوں کے درمیان چلتا رہا۔ باغیچے کے دوسرے سرے پر ایک لائن میں قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ قیام گاہوں میں بنگلی گلیاں مڑ رہی تھیں۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی میں میری نگاہ اٹھی اور جم کر رہ گئی۔ وہاں انکل مدثر، انکل ہیری کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ میں تقریباً بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور بے اختیار انکل مدثر سے لپٹ گیا۔ اتنے آنسو بے اختیار میری آنکھوں میں پتہ نہیں کہاں سے آ گئے۔ میں بچوں کی طرح روتا جا رہا تھا انکل مدثر میرے بڑے تھے۔ انہیں اپنے سامنے دیکھ کر میں خود بے قابو نہ رکھ سکا تھا۔ انکل مدثر نے بمشکل مجھے دلاسا دیا اور بولے۔ ”علی بیٹا! تم جب سے پڑاؤ سے گئے تھے میں دن رات تمہاری سلامتی کی دعائیں کرتا رہتا تھا۔ مجھے ہر وقت تمہاری فکر لاحق رہتی تھی۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہاری ہر جگہ حفاظت کی۔“ بات کر کے انکل میرا ہاتھ پکڑ کر باغیچے میں ایک سنگی بیٹھ پڑے جا بیٹھے۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ ”علی بیٹا! تمہیں اب فکر مند یا رنجیدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ جم کٹی کی کھیتی ریتا کے قاتل تم نہیں ہو۔ وہ تمہارے بارے میں جو مرضی کہتے رہیں میں سب جانتا ہوں اور اس کے بعد سب سے بڑی خوشخبری یہ کہ شاہنواز رابعہ کو آزاد کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔ اس کی یہ شرط ہے کہ ہم لوگ بھی جلی گوریلوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوں۔ فتح کی صورت میں دیوتا بوکاشی انعام کے طور پر جم کٹی اور شاہنواز کو اس گمشدہ خزانے تک پہنچا دیں گے۔ خزانہ ملتے ہی رابعہ کو بھی آزادی مل جائے گی۔ جم کٹی، شاہنواز کو خزانہ مل جائے گا اور ہمیں ہماری رابعہ واپس مل جائے گی۔“ انکل مدثر باتیں کرتے ہوئے کافی پُر جوش ہو رہے تھے۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر بے حد ترس آ رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ شاہنواز اور جم کٹی نے رابعہ کے بدلے ہی بوکاشی دیوتا سے خزانہ مانگا ہے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی بیٹی سونے کے تول کے بدلے بیٹی جا رہی ہے۔ شاید انکل ہیری نے انکل مدثر کو اس متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ انکل مدثر باتیں کرتے ہوئے مجھے اپنی قیام گاہ کی طرف لے جانے لگے۔ وہ بولے۔ ”علی نواز! رابعہ سے مل لو۔۔۔۔۔۔ وہ تمہاری طرف سے کافی پریشان تھی۔۔۔۔۔۔“

یکدم رابعہ کا نام سن کر میرے دل کی دھڑکن انتہا کو پہنچ گئی۔ جیجان سے دھیرے دھیرے سارا

تالاب کے اوپر اونچی چھت پے لوہے کی زنجیروں کے ساتھ جھولتی ہوئی ناقابل شناخت چیز انسانی سر تھے۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ کچھ گل سڑ چکے تھے، کچھ تازہ تھے اور شناخت کے قابل تھے۔ ان سروں سے قطرہ قطرہ خون رس کرتا تالاب میں گر رہا تھا۔ انہی سروں میں سے کوئی سر مکی کا تھا۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ شاید کوئی سر میری پیاری گزریا سی بہن ریتا کا تھا۔ یکا یک ایک طوفان سادل میں اٹھا۔ رگ رگ میں جیسے ایک آگ سی دوڑ گئی۔ اندرونی جیجان سے میرا چہرہ تمنا اٹھا پھر اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں لپکا اور رگوں میں بہتی آتش سرد ہوتی چلی گئی۔ میں نے دل میں پلٹنے والے طوفان کو دل کے پاتال میں دفن کر دیا اور چہرے پے مسکراہٹ سجالی۔ بوکاشی دیوتا دل کی زبان پڑھ لیتا تھا۔ میں اپنے لئے یہاں کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ زرزوف کی دونوں سزائیں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا۔

میں جب وہاں سے لوٹا تو بزار رنجیدہ اور ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔ میرے اعصاب خنک کر کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ واپسی کے وقت بوکاشی دیوتا نے مجھے حکم دیا تھا کہ جلی وادی میں ہونے والے معرکے کیلئے میں بھرپور تیاری کروں۔ تیاری کس بد نصیب سے ہونا تھی، میں شکستہ و رنجیدہ اپنی خوابگاہ میں جا پڑا۔ دوپہر سخت پریشانی اور کشمکش میں گزر گئے۔ میرے دل میں بار بار بوکاشی دیوتا اور بوگا لے کے لئے انتقام کے جذبات اٹھ رہے تھے جنہیں میں بار بار سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بڑا اعصاب شکن اور تکلیف دہ عمل تھا۔ مجھے اس لمحے محسوس ہوا کہ دل میں اٹھنے والے خیالات و جذبات کو دباننا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ انسان آگ اور برف کے ساتھ سمندر بھی پار کر لیتا ہے مگر بات نہیں بنتی۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ میں ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سخت اور جان توڑ کشمکش کے بعد یوں محسوس ہوا کہ چند لمحے تک میں نے خود کو نہ سنبھالا تو میرے دماغ کی نس پھٹ جائے گی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا مسہری سے اٹھ بیٹھا۔ لیزانے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ میں نے جھٹک کر اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور حوض کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بمشکل وضو کیا اور اپنے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ آج بہت عرصے بعد میں نے نماز پڑھی تھی۔ شاید آخری دفعہ کیمبرو کے جنگل میں صبح کی نماز میں نے ادا کی تھی۔ جب رابعہ کی طرف سے ناامید ہو کر میں واپس جانا چاہ رہا تھا۔

اب نماز پڑھتے ہوئے میں اپنے رب کی طرف پورا متوجہ تھا۔ میں سجدے میں گر کر بہت دیر روتا رہا اور شاید سجدے کی حالت میں ہی سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو پھر سے اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میرا

دیکھ لو.....

”تم چشمے کی بات کرتی ہو۔ میری آنکھیں بند بھی ہوں تو تمہیں ہر لمحہ دیکھتی رہتی ہیں۔ تمہاری صورت ایک منٹ کیلئے بھی تو نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔“ وہ میری بات سن کر جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچ لیا۔

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”رابعہ! تم کب تک اپنے دل میں چھپے پیار کو چھپاتی پھرو گی۔“

”کک..... کیا مطلب تمہارا.....؟“ وہ ایک دم ہی خوفزدہ نظر آنے لگی۔

”یہی کہ کب تک مجھے سولی پر لٹکائے رکھو گی..... میرے صبر کا امتحان لیتی رہو گی۔“

”علی نواز! ایک بار پھر سے تم غلط سمت جا رہے ہو.....“ رابعہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”رابعہ! میرے پاس رستہ ہی صرف ایک ہے۔ غلط سمت جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا.....“

”علی نواز! تم میرے بچپن کے بہت اچھے دوست ہو۔ یوں کرو گے تو پھر دوستی بھی جاتی رہے

گی..... میں تمہیں پہلے بھی کئی دفعہ بتا چکی ہوں کہ.....“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”رابعہ! اپنے آپ سے جھوٹ مت بولو.....“

”میں کسی سے کوئی جھوٹ نہیں بول رہی.....“

”تم مجھ سے پیار کرتی ہو.....“

”میں صرف شاہنواز کو چاہتی ہوں۔ وہی میرا پہلا اور آخری پیار ہے۔ آخر یہ بات کس دن

تمہاری سمجھ میں آئے گی..... کیوں مجھے رلاتے ہو..... کیوں مجھے کانٹوں پر گھسیٹتے ہو۔“ آخری فقرہ

کہتے ہوئے اس کا لہجہ رندہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا انکل مدثر دوسرے کمرے سے برآمد

ہوئے اور خوشگوار لہجے میں بولا۔ ”بیٹی! علی نواز کے لئے کھانے کو کچھ لاؤ۔“ انکل کی بات سن کر رابعہ

نے فوراً اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور وہ کچھ لانے کے لئے مڑنے ہی لگی تھی کہ میں بول پڑا۔

”نہیں انکل اس کی ضرورت نہیں۔ میرا پیٹ بھر گیا ہے۔“

”ارے کچھ تو کھا لو، رابعہ نے شاہنواز کے لئے ایک میٹھی ڈش بنائی ہے بہت مزے کی

ہے.....“

”نہیں انکل.....! میٹھا ویسے بھی مجھے پسند نہیں..... پھر سہی.....“ میں نے کہا اور ایک کام کا

وجود لرز نے لگا۔ میں جب انکل مدثر اور ہیری کے ساتھ قیام گاہ میں داخل ہوا تو رابعہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ آنسوؤں سے تر تھا۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی سمندر کی نیلا ہٹ ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں کوئی چیز چھپاتے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے ہمارے قریب چلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم سے دیئے سے جلنے لگے تھے۔ اس کے حسین لب تھرائے اور سسکی کے مشابہہ آواز بلند ہوئی۔

”علی!..... کیسے ہو تم.....؟“ رابعہ دھیرے سے بولی۔

”رابعہ! قدرت نے ایک بار پھر ہمیں ملا دیا ہے۔ جب تم دریا میں مجھ سے ٹکھڑ گئی تھی تو مجھے

یوں لگا کہ اب میں کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھ سکوں گا..... مگر..... خدا کا شکر ہے کہ تم میرے سامنے

موجود ہو۔“ میں تمہیں کسی صورت کھونا نہیں چاہتا! رابعہ“ میں دل سوز لہجے میں بولا تو رابعہ مسکرانے لگی۔

”علی نواز! قدرت بھی انسان سے کیا کیا کھیل کھیلتی ہے..... کبھی منزل کے بالکل قریب لے

آتی ہے، کبھی بچ کر دور پھینکتی ہے اور منزل کا نشان تک بھلا دیتی ہے۔“ رابعہ مغموم سے کھوئے کھوئے

لہجے میں بولی۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ..... رابعہ.....؟ کبھی کبھار تو تم شاعروں والی باتیں شروع کر دیتی

ہو..... کچھ پہلے نہیں پڑتا.....“

”اچھی بات ہے پہلے نہیں پڑتا، نہیں تو تم میری جان کھا مارو.....“ وہ ایک دم سے شوخ لہجے

میں بولی۔ پھر ایک لمحے رکی بالوں کی ایک لمبی لٹ کان کے پیچھے اڑتے ہوئے بولی۔ ”ویسے تم ہو

بہت بونگے.....“ وہ مجھے چھیڑنے لگی۔ میں اس کی بات سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا پھر یکایک میرا

دھیان رابعہ کی کینٹی کی طرف چلا گیا۔ اس نے بالوں کی لٹ پیشانی سے ہٹا کر کان کے پیچھے اڑی تھی

اور کینٹی کے پاس زخم کی ایک لمبی لکیر کھینچی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ زخم شیر کے

بچے کا تھا اور مجھے بچاتے ہوئے رابعہ کو لگا تھا۔ اس زخم کو کم و بیش ایک ماہ گزر چکا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے

ابھی تازہ زخم لگا ہو۔ اس کے بے داغ شفاف چہرے پر سرنخی کی یہ باریک سی لائن اس کی خوبصورتی

میں کئی گنا اضافہ کر رہی تھی۔ یا شاید یہ زخم مجھے بچاتے ہوئے لگا تھا اس لئے مجھے خوبصورت دکھ رہا

تھا۔

”تمہیں بونگا لگتا ہوں۔ اسی لئے مجھ سے دور بھاگتی ہو۔“ دل کی بات میں زبان پر لے آیا۔

”دور کب بھاگتی ہوں..... تمہارے پاس تو بیٹھی ہوئی ہوں۔ نظر نہیں آرہی تو ابوکا چشمہ لگا

نوج کے کئی کئی سپاہیوں کو مقابلے میں ہرا دیتا۔

میرے بارے میں جم کئی اور شاہنواز کارویہ انگل مدثر کے سامنے بڑا دوستانہ سا ہوتا تھا۔ وہی لہجہ اکیلے میں دشمنوں والا بن جاتا۔ میں کوئی بات، کوئی منظر اور کوئی وعدہ بھولا نہیں تھا۔ رینا کی موت آج بھی پہلے دن کی طرح میرے سینے میں تازہ تھی یہ اور بات تھی میں نے اس پر خود فراموشی کا غلاف بڑھا دیا تھا۔ جونہی رینا کی موت کا منظر میرے حواس پر چھاتا، میں رابعہ کے پاس غم کھانے پہنچ جاتا۔ رابعہ کا لہجہ رابعہ کا رویہ پہلے دن کی طرح اٹل تھا وہ میری بڑی عزت کرتی تھی۔ مجھے احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھی، مگر محبت وہ صرف شاہنواز سے کرتی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیسی محبت تھی جو رابعہ کے دل سے نکلنے میں ہی نہیں آتی تھی۔ ایک دن جب میں رابعہ کے پاس پہنچا تو میرا من بھر گیا۔ آنسو آنکھوں سے جھر جھر بہہ نکلے۔ میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”رابعہ! تم مجھ سے پیار کرتی ہو یا نہیں.....“

”آخر تم یہ سوال کیوں پوچھتے رہتے ہو؟“ رابعہ بولی۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل کے کسی کونے میں میرے لئے پیار چھپا ہوا ہے۔“

”میں تمہیں ہزاروں دفعہ بتا چکی ہوں کہ میں شاہنواز سے پیار کرتی ہوں.....“

”میں نے تم سے شاہنواز کے متعلق نہیں پوچھا..... مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو یا نہیں؟“ میں اٹل لہجے میں بولا۔

”اچھا! تم یہی سننا چاہتے ہو تو لو آج سنو..... میں تم سے پیار نہیں کرتی..... اور اگر تمہارے دل میں کوئی شک ہے تو میں نکال دیتی ہوں۔ میں ہزار بار بھی جیوں گی تو صرف شاہنواز کو پانا چاہوں گی..... سناتم نے..... اب خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو.....“

”رابعہ! مگر تمہاری وہ گفتگو، تمہارا وہ رویہ، جب برب وادی میں سیلاب آیا تھا..... تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا..... اک بیٹھا بول بولا تھا..... تم نے..... تمہارے دل میں، میں نے اپنے لئے پیار کی ایک چھوٹی سی چنگاری پھوٹی دیکھی تھی..... وہ..... وہ..... سب کیا تھا؟..... کہہ دو..... وہ سب جھوٹ تھا۔“

میری بات سن کر رابعہ دھیرے سے مسکرائی اور براہ راست میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ”علی نواز! اگر تم اسے پیار سمجھتے ہو تو مجھے تمہاری سوچ پر حیرت ہو رہی ہے۔ علی نواز! تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ میں تمہاری دل و جان سے عزت کرتی ہوں اور اسی دوستی کے ناطے کرتی رہوں گی۔“

رابعہ نے نہایت حلیم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تو میرا دل دکھے گا.....“

بہانا کر کے وہاں سے چلا آیا۔ ابھی میں باغیچہ کر اس کر کے غلام گردش میں پہنچا تھا کہ میرا ناکرہ بوگالے سے ہو گیا۔ وہ اپنا مخصوص اعصاب نک نک کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ شاہنواز اور جم کئی بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی شاہنواز کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ کھل گئی۔ یہ مسکراہٹ زخموں پر نمک پاشی کے مترادف تھی۔

”کیسے ہو..... جو ان تم.....“ ”بوگالے بولا۔ میں خاموش رہا تو وہ پھر گویا ہوا۔“ میں نے تم سا ڈھیٹ اور مضبوط آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ تم بیچ کر یہاں بھی پہنچ گئے ہو۔ خیر بوکاشی دیوتا کا حکم مجھے نہ ملا ہوتا تو میں یہاں بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہ دیتا..... مگر زیادہ خوش ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جلی گوریلوں کی شکست کے بعد تمہاری میری جنگ پھر وہیں سے شروع ہوگی جہاں ہم نے ختم کی تھی۔ اپنے اس گرم لہو کو سرد مت ہونے دینا۔“ ”بوگالے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

میں خاموش تھا..... بالکل خاموش..... مجھے جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف رابعہ کا روکھا لہجہ..... سماعت میں گونج رہا تھا۔ غم میرے دل کے بہت اندر تک گھر کر گیا تھا۔ پر بت کے پار آنے سے پہلے جس خوشی نے میرے دل میں سر اٹھایا تھا وہ ناپید ہو چکی تھی۔ رابعہ کے نوکیلے جملوں نے اس خوشی کا سر پیکل کے کھکھ دیا تھا۔ میرا دل چھلنی ہو چکا تھا۔ اب اس چھلنی دل میں کسی اور کے نوکیلے اور طنزیہ جملوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

”علی نواز! تمہاری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ دیکھ لینا میدان جنگ میں تمہیں تمہاری ساری کوششوں کا صلہ مل جائے گا۔“ یہ شاہنواز تھا جو شاید مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ میں اس کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا اپنی خوابگاہ کی طرف چل دیا۔ اس رات میں جی بھر کے رویا اور گزرے ہوئے وقت کی سوغات کے ہر پھپھو لے کو پھوٹا رہا اور غم پیتا رہا۔ صبح اٹھا تو بھی رابعہ کا غم دل پرے سوار تھا۔ اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ رابعہ کا بے انتہا غم میری زندگی کی ضمانت بن گیا ہے۔ رابعہ کی سوچ نے میرے دل سے ہر ایسی سوچ نکال دی تھی جو مجھے دیوتا بوکاشی کے عتاب کا نشان بنا سکتی تھی۔

رابعہ کا غم ہی اتنا بھاری تھا کہ ہر ”غلط“ سوچ معدوم ہوتی چلی گئی تھی۔ میں اب رابعہ کا غم ہی دل اور سوچ میں لئے پھرتا تھا۔ اس دن کے بعد میں کھلے میدان میں ہونے والے مقابلوں میں حصہ لیتا رہا۔ مشقیں کرتا رہا اور بہت سخت ورزشیں کرتا رہا، یہاں میں رابعہ کے غم کو ہی ایندھن کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ میں نے مشقوں کے درمیان بڑے بڑے سوراخوں کے چھکے چھڑا دیے۔ میں نے اپنے جسم کو بے رحم اذیتوں کے سپرد کر دیا۔ نیلی سمندری آنکھیں میرے تصور میں ہوتیں اور میں کالی



باہر جا پڑا۔

باہر راہداری میں کچھ کنیریں جاری تھیں۔ کچھ کالی فوج کے جنگجو جا رہے تھے۔ ان سب نے پہلے حیرانگی سے میری طرف دیکھا اور پس منظر میں رابعہ کا لال بھبھکا چہرہ دیکھا تو بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ جنگجو قہقہے لگانے لگے اور کنیریں منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔ ان کے خیال سے میں رابعہ کے حسن کا نذرانہ چاہتا تھا مگر اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ جنگجو قہقہے لگاتے ہوئے میری پیٹھ تھپکنے لگے اور حوصلہ دیتے ہوئے بولے۔ ”جوان! پریشان مت ہو۔ نہیں مانتی تو۔۔۔۔۔ عشرت کدے میں چلے جاؤ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک بلبل نظر آئے گی۔ یہاں والا تجربہ وہاں نہیں دہرایا جائے گا۔“

میں اٹھ کے کھڑا ہو چکا تھا۔ میرا وجود ایسے طوفان کی زد میں تھا جو مجھے اڑاتے ہوئے اس جہاں سے کسی اور جہاں کی طرف لے جائے جا رہا تھا۔ میں وہاں سے جیسے کسی تند سیلابی ریلے میں بہتا ہوا اپنی خوابگاہ تک پہنچا۔ لیز اور پوہا شے خوابگاہ میں موجود تھیں۔ میں نے شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اس رات میں نے جی بھر کے ام الزبائث سے جی بہلایا۔ پوہا شے میرے کہنے پر جام پے جام مجھے دیئے جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں شدید الجھن کے آثار تھے۔ وہ میری زندگی کی سب سے اہمیت ناک رات تھی۔ پوہا شے تمام رات میرے سر ہانے بیٹھی رہی۔ اگلے دن دوپہر کے وقت میری آنکھ کھلی تو پوہا شے اس وقت بھی میرے سر ہانے بیٹھی تھی۔ میں یکسر بدلا ہوا علی نواز خان تھا۔ میری آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور پھر رات والی حماقت پر بھی میں جی بھر کے رویا۔ میں نے ایک حرام، رزیل چیز کو حلق سے نیچے اتارا تھا۔ یہ سب کس کی وجہ سے ہوا۔ رابعہ کی وجہ سے۔ ہاں اس سب کی تصور وار رابعہ ہی تھی، وہی تھی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی جب میں کھلے میدان میں پہنچا۔ کالی فوج کے کچھ جنگجو تلوار زنی کی مشقیں کر رہے تھے جبکہ کچھ دھوپ میں بیٹھے گیس ہانک رہے تھے۔ میں بھی دھوپ میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ یکا یک ایک جانب سے کالی فوج کا ایک سپاہی آیا اور میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ بالی تھا اس کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے جھک کر میرے دونوں ہاتھ چوم لئے اور بھیکے لہجے میں بولا۔ ”ایلی نیوز! ساسا کیسی ہے۔“ ساسا کہتے ہوئے اس کے حلق سے ایک بچکی سی بلند ہوئی تھی۔ میں اتنے دیوبند کل انسان کو اس طرح روتا اور کسی کے لئے ہلکتا دیکھ کر حیران ہوا۔ میں بالی کے اس سوال کے لئے خود کو بہت دن پہلے سے تیار کر چکا تھا۔ میں بولنا چاہتا تھا مگر گلے میں پھندا سا لگ گیا میں بمشکل کہہ سکا۔

تمہاری جان کو خطرہ ہوگا تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ تم میرے بہت اچھے دوست ہو اور اس سب کو تم پیار سمجھ لو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ علی نواز! یاد رکھو۔۔۔۔۔ اگر تم کبھی اس معاملے میں شاہنواز سے الجھ گئے تو میں صرف شاہنواز کے ساتھ ہوں گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں اسے کسی چھوٹی سی بھی مصیبت میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی۔ تم جب پچھلی دفعہ بھی زمبابوے آئے تھے یہی بات میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر تمہارے دماغ میں پتہ نہیں کیا فوٹور ہے۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے تو باہر ہے اگر میں تم سے ہنس کے بات کر لیتی ہوں۔ تمہاری عزت کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم میری نجی زندگی کو متاثر کرو۔۔۔۔۔ اگر میرے منہ سے ایسا کوئی لفظ، کوئی جملہ نکل بھی گیا تھا جس کا تم نے غلط مطلب لے لیا تو اس کے لئے میں تم سے معافی مانگتی ہوں اور تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

میں زخموں سے چور لہجے میں بولا۔ ”رابعہ! صرف ایک بات اور بتا دو۔۔۔۔۔ شاہنواز جیسے بندے سے۔۔۔۔۔“

میرا جملہ ادھورا رہ گیا رابعہ ایک دم سے مجھ پر پھٹ پڑی اور بولی۔ ”خبردار علی نواز۔۔۔۔۔ خبردار۔۔۔۔۔ شاہنواز کے متعلق کوئی غلط لفظ منہ سے مت نکالنا۔۔۔۔۔ وہ جیسا ہے۔۔۔۔۔ جس طرح کا ہے۔۔۔۔۔ جو جو کرتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے سب خبر ہے۔ مجھے سب پتہ ہے۔ وہ مجھے ہر عیب۔۔۔۔۔ ہر برائی سمیت قبول ہے۔“ رابعہ تیز لہجے میں جس وقت یہ گفتگو کر رہی تھی اس لمحے نشست گاہ میں شاہنواز داخل ہوا۔ اس کا چہرہ لال بھبھکا ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی میرا گریبان تھام لیا اور مجھے دھکیلتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جواباً میں نے بھی اسے دبوچ لیا۔ ہم دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ شاہنواز نہایت اونچی آواز میں اول فول بک رہا تھا اس کے جو لفظ میری سمجھ میں آ رہے تھے وہ یہ تھے۔ ”علی نواز! اب میں بہت دیر ہو چکی۔۔۔۔۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رابعہ پر بری نگاہ رکھنے والے کی میں آنکھیں نکال لیا کرتا ہوں۔“

”تم کیا آنکھیں نکالو گے۔۔۔۔۔ تمہاری تو اپنی بصارت گندی ہے۔۔۔۔۔ تم اپنی محبت بیچ کر بوکاشی دیوتا سے خزانہ پانا چاہتے ہو۔“ یکا یک رابعہ آگے بڑھی اور اس نے میرے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ شاید۔۔۔۔۔ آخری نذرانہ تھا۔۔۔۔۔ آخری لہجہ اور آخری الفاظ تھے۔ رابعہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔ تمہاری بچپن کی دوستی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ خبردار جو اپنی صورت آج کے بعد مجھے دکھائی۔“ رابعہ نے مجھے دھکا دیا اور میں نشست گاہ سے

برا بھلا کہہ لیتے ہیں۔ زبان میں جو کچھ آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ اماوس کی رات کو بوکاشی دیوتا کی تمام غیبی صلاحیتیں سوجاتی ہیں۔ بوکاشی دیوتا زیر زمین چلے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس رات بھی اپنے دل کی بھڑاس نہیں نکال پاتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کوئی بوکاشی دیوتا سے ان کی خبری کر دے گا اور اماوس کی رات ختم ہوتے ہی بوکاشی دیوتا انہیں زرزوف کی سزا دے دے گا۔“

میں نے جب پوچھا کہ ابھی تک دن چل رہا ہے اماوس کی رات نہیں چڑھی تو بالی بولا کہ صبح طلوع سے لے کر اماوس کی رات کے ختم ہونے تک یہ وقت چلتا ہے۔ اس وقت میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بہت کچھ وہ بڑے معنی خیز لمحے میں بولا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ بالی تم مجھ سے کھلے نام بات کر رہے ہو کیا معلوم میں بھی بوکاشی دیوتا کا خبر ہوں؟ تو اس سوال پر بالی ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔ ”نوجوان! یہاں ہر دوسرا بندہ بوکاشی کا خبر ہے۔ مجھے یہاں رہتے ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔ اتنی پہچان تو مجھے ہو چکی ہے کہ مخبر کون ہے اور دوست کون ہے۔ تم نے میرے لئے جو کام کیا ہے جو خوشخبری مجھے سنائی ہے اس کے بدلے تم میری خبری بھی کر دو تو مجھے کوئی غم نہیں۔ ساسا کے صحیح سلامت دینے کی خوشخبری ہی اتنی بڑی خبر ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں ہمیشہ تمہارا قرض دار رہوں گا۔“

وہ بار بار ساسا کی باتیں شروع کر دیتا۔ وہ ساسا کی باتیں کرتا تھکتا تھا۔ مجھے ساسا کی حالت کی یاد آنے لگی وہ بالی کے لئے کیسی دیوانی ہوئی پھرتی تھی۔ اس نے بالی کی باز بانی کے لئے درد کی لوکریں کھائی تھیں۔ وہ پورا ایک سال سردار رواڈو کے محل میں کنیز بن کر رہی تھی۔ بالی اور ساسا کی بت نگاہوں میں گھومی تو اپنے زخموں سے لہو رسنے لگا۔ میں جب وہاں سے اٹھا تو بہت بوجھل دل لے کر اٹھا۔ میں ایک بار پھر اپنی خوابگاہ میں جی بھر کے رویا۔ دل کے پھپھولے جل اٹھے اور ماں کی پیہر آنکھوں میں لہر اگنی میں ایک بچکی لے کر بولا۔ ”ماں! میں تجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ تم شاید ایک کہتی تھی کہ کوئی چیز بھی آخری نہیں ہوتی۔ تمہاری بات ٹھیک ہے ماں مگر میں اپنے دل کا کیا کروں میری شادی کہیں اور کر دے گی میں اپنی بیوی کو خوش نہیں رکھ سکوں گا۔ ماں..... میں رابعہ کو اپنے دل سے مٹانے کی ہر کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں مگر میں کیا کروں وہ میرے دل سے نکلتی ہی نہیں.....“

میں نیم غنودگی میں زیر لب بڑبڑا رہا تھا اور آنسوؤں کی لڑیاں پرورہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت لیزا نے مجھے آکر بتایا کہ باہر ہیری کرس نامی شخص آیا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ میں نے زت دے دی اور اٹھ کر اپنے سارے آنسو پونچھ ڈالے۔ دوسرے لمحے انکل ہیری میرے سامنے آئے تھے۔ وہ کوئی اہم بات مجھ سے کرنا چاہ رہے تھے۔ جلد ہی وہ اصل موضوع کی طرف آگئے

”بالی! ساسا بالکل ٹھیک ہے..... اور تمہیں بہت زیادہ یاد کرتی رہتی ہے تمہارا بچہ بھی کافی بڑا ہو چکا ہے۔“

میری بات سن کر بالی کی آنکھوں میں تشکر آمیز چمک نمودار ہوئی اور وہ بچوں کی طرح میرے گھٹنے سے چمٹتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ”ساسا! ٹھیک ہے..... وہ..... وہ مجھے یاد بھی کرتی ہے.....؟“

”ہاں..... اور وہ تمہیں ملنے کے لئے ہر لمحہ تڑپتی رہتی ہے۔“

بالی یوں تھا جیسے ابھی خوشی سے اس کا دم نکل جائے گا۔ وہ نگاہ اٹھا کر دور سنہری دھوپ میں چمکتی ہوئی سنہری لالہ لکھاں کو نکلنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک سرخی کی لہر دکھائی دینے لگی۔ پھر وہ سرخی لمحہ بہ لمحہ گہری ہونی لگی۔ آخر بالی نہایت گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”ساسا! میری جان تم فکر مت کرنا۔ میں یہ قید توڑ کے بہت جلد تم تک پہنچ جاؤں گا۔ پھر..... پھر ہم پہلے کی طرح پھول اور تکیوں کی باتیں کیا کریں گے۔ صبح اور شبنم کی باتیں کیا کریں گے..... پھر..... پھر میں پہلے کی طرح صبح سوئی کے پھول لا کر تمہارے بالوں میں لگایا کروں گا۔ تم سو کر اٹھا کرو گی اور حیران ہوا کرو گی..... ہاں میری جان..... وہ دن دور نہیں..... وہ دن آنے ہی والے ہیں۔“ بالی دوہرے دیکھتے ہوئے خیالوں میں کھویا ہوا یہ سب بڑا بڑا رہا تھا۔ وہ ساسا سے بے انتہا پیار کرتا تھا اسی کی زبانی پتہ چلا کہ اس نے ساسا کی یاد میں ایک ایک دن کانٹوں پر گھسیٹ کر گزارا ہے۔ وہ دن رات اس کے غم میں گھلتا رہتا ہے۔ کوئی رات ایسی نہیں گزری جب اس نے ساسا کی یاد میں آنسوؤں کی لڑیاں نہ بہائی ہوں۔ ساسا سے اس کی محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ میں نے جب ساسا اور اس کے بچے کا ذکر کیا تھا تو اس کی زبان پر ساسا کا نام ہی آیا تھا۔ کہنے کو تو میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ ساسا بالکل ٹھیک ہے مگر میرے دل میں ایک گرہ ہی پڑ گئی تھی۔ ساسا ہماری طرح سیلاب کی شوریدہ سرلہروں کی نذر ہو گئی تھی۔ اس نے ہماری طرح زندگی پائی تھی یا..... نہیں..... اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ہر لمحہ میرے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے ساسا خیریت سے ہو۔

بالی بہت دیر بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوکاشی دیوتا کے بارے میں اپنے دل میں بہت غصہ رکھتا ہے۔ جب میں نے اسے ٹوکا کہ وہ بوکاشی دیوتا کے بارے میں ایسے سخت الفاظ اپنی زبان پر رکھتا ہے تو وہ ہنس کر بولا کہ اماوس کی یہ ایک رات ہی تو ہمیں ملتی ہے۔ ہم اس ایک رات میں اپنے دل کی تمام بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اسنے دل میں بوکاشی دیوتا کو

اور بولے۔

”علی بیٹا! جو صورت حال اس وقت پیدا ہو چکی ہے اس کے بارے میں تم بخوبی جان چکے ہو۔ جم کیٹی اور شاہنواز کے منصوبے کے بارے میں، میں نے ابھی مدثر کو کچھ نہیں بتایا۔ مدثر بے چارہ یہی سمجھتا ہے کہ خزانہ پانے کے بعد رابعہ کو خلاصی مل جائے گی اور ہم لوگ آرام سے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ وہ یہ بالکل نہیں جانتا کہ رابعہ کو بوکاشی دیوتا کے حوالے کرنے کے عوض ہی یہ لوگ خزانہ پارہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بوکاشی دیوتا وعدہ خلافی بالکل نہیں کرتا۔ جم کیٹی اور شاہنواز کی بوکاشی دیوتا سے اندر خانے جو میٹنگ ہوئی ہے اس میں فیصلہ یہ ہوا ہے کہ رابعہ اگلے ہفتے تک محل میں پہنچ جائے گی اور جلی گوریلوں والے محرکے کے بعد بوکاشی دیوتا خزانہ جم کیٹی اور شاہنواز کے سپرد کر دیں گے۔ خزانہ سپرد کرنے کے بعد رابعہ بوکاشی دیوتا کی بیوی بن جائے گی۔“ انکل ہیری کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر رقت آمیز لہجے میں بولے۔ ”علی نواز! کسی طرح اپنی محبت اپنی رابعہ کو بچا لو۔ کسی بھی طریقے سے اسے یہاں سے لے کر بھاگ جاؤ۔“ انکل کی بات سن کر میرا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ میں بلکتے ہوئے بولا۔

”انکل..... انکل..... پر بت کے پار کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ آپ نے کہا تھا تمہیں اپنی زندگی اپنی رابعہ کو پانا ہے۔ تمہیں پر بت کے پار پہنچنا ہے۔“ انکل میں پر بت کے پار پہنچا..... ہاں..... میں وہاں زندگی سے مزین پانی کی تلاش میں پہنچا مگر انکل..... وہاں پانی تو ہے..... مگر..... مگر وہ پانی بڑا زہرناک ہے..... اس..... اس پانی میں موت کے بھنور ہیں۔ اس پانی میں محبت کی بجائے نفرت کی لہریں ہیں۔ رابعہ..... رابعہ مجھ سے پیار نہیں کرتی انکل۔“ میں انکل کے گلے لگ کر دھاڑیں مارنے لگ گیا تھا۔ ”میں..... میں ساری زندگی ایک سراب کے پیچھے بھاگتا رہا۔ انکل وہ..... وہ جس کے بغیر میں ادھورا ہوں، وہ کبھی میری تھی ہی نہیں.....“ میں روتا گیا اور یہ نہیں کیا کچھ بولتا گیا۔ انکل نے بمشکل مجھے چپ کر دیا اور یہ سمجھایا کہ ”علی! مت بھولو کہ شاہنواز خزانے کے عوض رابعہ کو بوکاشی کے سپرد کر رہا ہے۔ بہت جلد رابعہ اس سے تقف ہو جائے گی وہ..... وہ پھر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔ تمہیں آخری دم تک حوصلہ نہیں ہارنا۔ میں دیکھ رہا ہوں وہ دن دور نہیں جب رابعہ تم سے معافی کی خواستگار ہوگی۔“

انکل بیٹھے کافی دیر مجھے دلاسہ دیتے رہے پھر مجھے اپنے گلے لگاتے ہوئے بولے۔ ”علی بیٹا! میں ہر قدم تمہارے ساتھ ہوں۔ میں بظاہر اجم کیٹی اور شاہنواز کے ساتھ ہوں، مگر یقین مانو بیٹا میری

اری ہمدردیاں اور محبتیں تمہارے اور مدثر کے ساتھ ہیں۔ اب جلدی سے اپنا موڈ ٹھیک کر دو میں اصل نہیں لینے آیا تھا۔ مدثر نے اپنی قیام گاہ میں آج ایک میٹنگ رکھی ہے جہاں آئندہ آنے والے ن کے لئے پلاننگ کی جانی ہے۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے انکل ہیری کی طرف دیکھا اور انہوں نے معنی خیز انداز میں آنکھیں میچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جب ہم دونوں قیام گاہ میں پہنچے اس وقت شام کی آمد آمد تھی۔ مشعلیں روشن کی جا رہی تھیں رسارا ماحول جیسے گنگنا رہا تھا۔ ہر چہرہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ کینروں کے دبے دبے قبضے گونج رہے تھے۔ غلاموں کی سرگوشیاں ماحول میں گردش کر رہی تھیں۔ کالی فوج کے جوان ایک دوسرے کی ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ یہ سب اماؤس کی رات کا کرشمہ تھا۔ بوکاشی دیوتا زیر زمین جا چکا تھا اور اب اس سے محبت اور عقیدت جتانے والے لوگ بوکاشی دیوتا کی عدم موجودگی میں جشن منا رہے تھے۔ کیونکہ ان کے ذہن بالکل آزاد تھے وہ اپنی مرضی اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ سوچ سکتے تھے۔ اپنے دل کی بھڑاس اپنی زبان پر لا سکتے تھے۔ سنہرے چہروں والے انگریز بچے، نوجوان لڑکے، لیاں، بوڑھے، بوڑھیاں سیاہ فاموں میں ایسے چلتے پھرتے تھے جیسے کونکوں میں ہیرے دمک رہے۔ یہ سفید چمڑی والے لوگ یہاں کیسے آئے تھے؟ ان کا شجرہ نسب کیا تھا؟ اس بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔

جب میں قیام گاہ میں انکل ہیری کے ساتھ داخل ہوا تو پہلا منظر ہی میرے لئے ناقابل اشت تھا۔ رابعہ گرم شال اوڑھے شاہنواز کے ساتھ اس کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی ٹاپس آنکھوں سے نیلگوں شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ ٹھنک سی گئی۔ شاہنواز کی آنکھوں میں طنز آمیز شوخی تھی۔ جب ہم لوگ دوسرے کمرے میں میٹنگ کے لئے گئے تو رابعہ شاہنواز کے ساتھ بیٹھ گئی۔ انکل مدثر چند رسی باتوں کے بعد اصل موضوع کی بات آگئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم انجانے میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ ہم جنگی دنیا کا دھڑکنے والا ترین گروہوں کے درمیان آ گئے ہیں۔ ہمیں ایک کا ساتھ ہر صورت دینا ہے۔ اسی ہماری زندگی کی بقاء ہے۔ بوکاشی دیوتا پارٹی مضبوط بھی ہے اور حق پر بھی ہے۔ بھیزا کے چار اک ہیرے بوکاشی دیوتا پارٹی کے پاس ہیں۔ ان متبرک ہیروں کو جلی گوریلے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جلی گوریلوں کے پے در پے حملوں سے اس وادی میں چین و سکون ناپید ہو گیا ہے۔ بوکاشی دیوتا باغیہ کی جنگ لڑنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی رعایا کو پھر سے امن اور شانتی کے اژن کھٹولے پر سوار کرنا

طرف دیکھ رہی تھی کبھی اپنا عارض اس کے گھٹنے پر رکھ رہی تھی۔ میرے سینے میں ایسے تیرا تر رہے تھے جن میں نفرت کا زہر بجھا ہوا تھا۔

اچانک جم کیٹی کی بھاری آواز گونجی۔ ”کرئل مدثر! تمہارے اس بھتیجے کو ہم صرف تمہاری وجہ سے ابھی تک معاف کرتے چلے آ رہے ہیں اسے اپنی زبان میں سمجھا دو کہ ہم کون ہیں؟ ہماری طاقت ہماری پہنچ کہاں تک ہے؟ ہم سے نکلے گا تو آئندہ آنے والی کئی نسلوں کو دشمنی کا تاوان چکانا پڑے گا۔ اسے سمجھا دو..... یہ کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔“ جم کیٹی کا تند و تیز لہجہ سن کر انکل مدثر اسے دلاسہ دینے لگے اور میری طرف سے یقین دہانی کرانے لگے۔ اسی دوران شاہنواز اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تلوار کے دستے پہ ہاتھ رکھے ہوئے میرے پاس چلا آیا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”علی نواز! دل تو چاہتا ہے کہ تلوار سے تیری گردن اڑا دوں مگر.....“ اس نے فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا اسی دوران گوگی بھی میرے قریب چلا آیا اس کی آنکھوں سے بھی نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مجھے گھیرا ڈالا جا رہا ہے۔ جم کیٹی، شاہنواز اور گوگی کے ہاتھ تلواروں کے دستوں پر تھے اور کوئی لمحہ گزرتا تھا کہ وہ تلواریں نکال لیتے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا جم کیٹی میری گردن کو پیچھے سے دوپٹا ہوا بولا۔ ”ابھی تم جوزے ہو چوزوں والے کام کرو۔ شیر کی نقل اتارو گے تو بے موت مارے جاؤ گے۔“ اس کا لہجہ اس کا انداز اس کا رویہ مجھے تاؤ دلانے کے لئے کافی تھا۔ میں نے ہاتھ میں مضبوطی سے جم کیٹی کی کلائی تھامی اور زور سے اسے جھٹک دیا۔ وہ ساند کی مانند گردن اٹھائے عالم حیرت سے میری طرف تنکٹے لگا۔ میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”جم کیٹی! تو اتنا بھونکا اور میں ایک لفظ بھی نہیں بولا غور سے میری بات سن۔“ میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ رابعہ اور انکل ہیری حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے جیسے ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ میں ایسا لہجہ اپناؤں گا۔

میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ”جم کیٹی! تو میری پیاری بہن رینا کا قاتل ہے تو بووی کی گرل فرینڈ میگی کا قاتل ہے۔ اس طرح کے اور کئی معصوم لوگوں کا قاتل ہے۔ تو نے خزانے کی خاطر کتنی معصوم زندگیوں کو خاک میں ملا دیا۔ بھیڑا میں بنے بیشتر مجھے تیری کارہ گری کا ثبوت ہیں۔ تو ایک..... ایک سرلاتا رہا اور بوکاشی دیوتا کے حضور پیش کرتا رہا۔ تو جنگل میں شکار میلے منعقد کرتا رہا اور معصوم زندگیوں سے کھیلتا رہا۔ اب تو رابعہ کو بوکاشی دیوتا کے سپرد کر کے خزانہ حاصل کرنا چاہتا ہے اپنی مالا مال کی محنتوں کا صلہ پانا چاہتا ہے مگر یاد رکھ جم کیٹی میں تجھے ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ میں تیری

چاہتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں اس کا پورا پورا ساتھ دینا چاہئے۔ میری رائے تو یہی ہے آپ لوگ بھی اپنی اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

انکل مدثر کی رائے پر جم کیٹی، شاہنواز اور گوگی نے فوراً مثبت رد عمل کا اظہار کر دیا۔ انکل ہیری نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا اور مجھے بھی انکل ہیری کی بتلائی ہوئی پلاننگ کے تحت ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔

”کاش یہاں آتشیں اسلحہ استعمال ہو سکتا.....؟ ہم جلی گوریلوں کو اکیلے ہی فنا کے گھاٹ اتار دیتے۔“ گوگی چرس بھری سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ اس کی نیکی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی جو شاید آخری لڑائی کا نتیجہ تھی جب میری کک اسے لگی تھی اور وہ شراب کے منکے پر جا گرا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں انتقام کی سرخی تیر رہی تھی۔ گوگی کیا..... جم کیٹی اور شاہنواز کا بھی یہی حال تھا۔ شاہنواز کے کہے ہوئے الفاظ مجھے بھولے نہیں تھے اس نے کہا تھا۔ ”علی نواز! ہائی کمان کی طرف سے تمہاری موت کا پروانہ جاری ہو چکا ہے۔ اب تم ہم سے بچ نہیں پاؤ گے.....“

”کیوں آتشیں اسلحہ یہاں کیوں نہیں استعمال ہو سکتا؟“ یہ انکل مدثر تھے جو گوگی کے سوال پر بولے تھے۔

”ہماری اس سلسلے میں بوکاشی دیوتا سے ملاقات ہوئی تھی ان کا کہنا ہے کہ یہاں ایک گولی بھی نہیں چلنی چاہئے۔ آتشیں اسلحہ کا استعمال دیوتاؤں کی دھرتی میں ممنوع ہے۔ بوکاشی دیوتا کا کہنا ہے کہ میرے حکم سے اگر یہاں ایک گولی بھی چل گئی تو سب لوگ اور برب دیوتا میرے مخالف ہو جائیں گے۔ مجھ سے تمام غیبی طاقتیں چھن جائیں گی۔“ جم کیٹی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ اس نے مزید کہا کہ ”ساتھ لایا جانے والا اسلحہ بوکاشی دیوتا نے ضائع کروا دیا ہے۔ اب صرف تلواروں کی جنگ اور نیزوں کی لڑائی ہے۔“ آخری جملہ جم کیٹی نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔ میرے تن بدن میں اک آگ سی جل اٹھی میں نے بمشکل خود پے ضبط کیا۔ میں نے اپنا چہرہ جم کیٹی سے پھیر لیا پھر منظر میری نگاہوں سے نکل آیا وہ شاہنواز کا تھا۔ وہ رابعہ کا ہاتھ پکڑے سہلار ہا تھا اور ہلکا ہلکا طنزیہ مسکرا رہا تھا۔ رابعہ کے چہرے پہ بھی ایک بے نام سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے غور کیا تھا جب سے میں یہاں آیا تھا رابعہ شاہنواز سے زیادہ سے زیادہ پیار جتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی وہ شاہنواز کا ہاتھ محبت سے دبا رہی تھی، کبھی محبت بھری نگاہوں سے اس کی

ہنچے دیکھا تو عالم جوش میں ایسا داؤ کھیلا کہ جم کینٹی کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں جم کینٹی کے چنگل سے نکلا تو وہ پھر گیا اس نے اپنی تلوار کھینچ کر نیام سے باہر نکال لی۔ اس دوران میں بھی مسلح ہو چکا تھا۔ میں نے کالی فوج کے ایک سپاہی کی تلوار نیام سے نکال لی تھی۔ آنا فانا میدان کارزار گرم ہو گیا۔ ایک طرف میں اور بالی تھے جبکہ دوسری جانب جم کینٹی شاہنواز اور گوگی تھے۔ وہ ایسے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو انسانوں کا شکار کھیلتا تھا۔ کسی کی جان لینا ان کی روزمرہ کے معمولات میں شامل تھے۔ ہم دونوں بے جگری سے ان تینوں کا مقابلہ کر رہے تھے اسی دوران ہمارے تین دشمنوں میں چوتھے کا اضافہ ہو گیا۔

یہ کالی فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اس کی ناک ایک طرف کو مڑی ہوئی تھی۔ وہ دیوانہ وار تلوار چلاتا ہوا ”میدان جنگ“ میں داخلہ ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو اور کالی فوج کے سپاہی ان میں شامل ہو گئے۔ اب مقابلہ دو اور چھ کے درمیان ہو گیا تھا۔ دوسری طرف پلہ بھاری تھا مگر ہم دونوں بڑی بے جگری اور دھڑلے سے لڑ رہے تھے۔ اسی دوران لاکارہ مارتا ہوا ایک کالی فوج کا سپاہی ہم میں شامل ہو گیا۔ میں نے غور کیا تو وہ سردار روبان تھا۔ اس کی سیاہ رنگ صدری ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کے سیاہ رنگ دانتوں سے چھ چل رہا تھا کہ وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سردار روبان کے آنے سے ہمارا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی یہ لڑائی دو گروہوں کے درمیان ہو چکی تھی۔ ہماری جانب پچیس کے قریب جانباز تھے جبکہ مخالف سمت چالیس کے قریب۔ یہ لڑائی تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ اس لڑائی میں، میں نے شاہنواز اور گوگی کو شدید ضربیں لگائیں۔ شاہنواز کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا جبکہ بائیں ابرو پر گہرہ زخم آیا۔ جبکہ گوگی کا ایک کان تلوار کے وار سے کٹ گیا تھا۔ ممئی کا نامی گرامی غنڈہ اب کان کٹا ہوا چکا تھا۔

لڑائی زورور پڑتی جب سردار رواڈو موقع پر پہنچ گیا تھا اور اس نے یہ لڑائی ختم کرائی تھی۔ اس لڑائی میں دس کے قریب بندے زخمی ہوئے تھے جبکہ جان سے کوئی نہیں گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس لڑائی میں دو بڑے گروہ کیسے بن گئے تھے۔ اس کا تو ایک ہی مطلب بن رہا تھا کہ بوکاشی دیوتا کے سخت اور بے چلک قانون کی موجودگی کے باوجود یہاں گروہ بندی موجود ہے۔ اور اگر یہ ٹھیک تھا تو یقیناً یہاں بوکاشی دیوتا مخالف تحریک بھی موجود ہوگی۔ اس سوچ کے آتے ہی میرے سینے میں اٹھل پھٹھل ہونے لگی اور وجود میں جوش کی گرم لہریں ہلکورے لینے لگیں۔ سردار رواڈو نے لڑنے والے دونوں گروہوں کو سامنے بٹھا کر ایک لمبا لکچر دیا اور یہ بات سمجھائی کہ

لاش کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ کوئی گن بھی نہ پائے گا۔ تو یا تیرا یہ گینگ مجھ سے دشمنی کیا نبھائے گا۔ تو تو خود دوسروں کا سہارا لے کر چلنے والا ایک حقیر کیڑا ہے۔“

اچانک گوگی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے تلوار کا وار مجھ پر کرنا چاہا میں نے ہاتھ اپنے سر سے اونچا کر کے گوگی کی تلوار والی کلائی تھام لی۔ اسی لمحے شاہنواز نے اپنی تلوار نیام سے نکالنا چاہی مگر میری سیدھی ٹھوک اس زور سے اس کے سینے پہ لگی کہ وہ پتلی دیوار توڑتا ہوا باہر باغیچے میں جا پڑا۔ رابعہ چیخ مارتے ہوئے شاہنواز کی جانب لپکی۔ شاہنواز سخت طیش کے عالم میں اٹھ کر میری جانب بڑھنا چاہتا تھا کہ رابعہ نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے دوسری جانب کھینچنے لگی۔ ”چھوڑو شاہنواز..... جانے دو..... بروں کے ساتھ برا نہیں بن جاتے۔“

رابعہ نے یہ جملہ جان بوجھ کے اونچی آواز میں کہا تھا تا کہ آواز مجھ تک پہنچ جائے۔ ادھر گوگی کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی اور وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ ہم دونوں رونگ کرتے ہوئے ٹوٹی دیوار کے اوپر سے باغیچے میں پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں باغیچے میں کافی ہنگامہ لگ چکا تھا۔ سیاہ فام اور سفید فام کافی تعداد میں وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں نے گوگی کے چہرے پہ ایک مکار سید کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران جم کینٹی میرے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ آنا فانا گوگی اور شاہنواز بھی میرے سر پہ پہنچ گئے دونوں کے ہاتھوں میں اب دار تلواریں لہرا رہی تھیں۔ جم کینٹی کی پکڑ میں فولاد کی سی سختی تھی میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ گوگی اور شاہنواز کے تیور انتہائی خطرناک دکھ رہے تھے یوں لگتا تھا وہ مجھے مارنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اچانک ایک طرف سے رابعہ بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے شاہنواز کا بازو تھام لیا۔ وہ اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگی پتہ نہیں وہ ساتھ کیا کیا بولتی جا رہی تھی۔ وہ شاہنواز کو اپنے پیار کے واسطے دے رہی تھی وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی مگر شاہنواز کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بتا رہے تھے کہ وہ آج کسی صورت نہیں ملے گا۔ میں نے خود کو جم کینٹی کی گرفت سے چھڑانے کی آخری کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آنا فانا دونوں تلواریں انھیں چمکیں اور میرے سر کی جانب بڑھیں۔ دفاع کی ہر صورت معدوم ہو چکی تھی۔ تمناشایوں کی ایک ساتھ ”ہو“ بلند ہوئی پھر اچانک میری نگاہوں کے سامنے ایک سفید لمبی چمکدار لکیر سی تن گئی۔ ایک زوردار چھنکار کی آواز آئی اور ساتھ ہی سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ جو سفید لمبی لکیر سی میری نگاہوں میں چمکی تھی وہ بالی کی تلوار تھی جس نے میرے خون کی پیاسی دو تلواروں کا راستہ روکا تھا اور دونوں تلوار زونوں کو دھکیلتا ہوا دور لے گیا تھا۔ جب میں نے گوگی اور شاہنواز کو پیچھے

حوال پوچھتے ہیں۔ مہینے بھر کی کارگزاری سناتے ہیں اور چلتے پھرتے ایک دوسرے سے فرضی مقابلے کرتے ہوئے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ جولائی شاہی باغچے میں چند لمبے پہلے لڑی گئی تھی اس میں ہم لوگوں نے اپنے بہت سے معاملات نبٹا لئے ہیں۔ دوست میرے جاسوس بہت بڑے تھے۔ تمہارے پیچھے تھے مجھے تمہارے بارے میں ایک ایک بات کا علم ہو چکا ہے۔ میں تمہیں اپنے گروہ میں شامل ہونے کی پیشکش کرتا ہوں جو یقیناً تمہیں ہر صورت قبول کرنی ہوگی کیونکہ یہاں ن منحوس وادی اور منحوس دیوتا کی دسترس سے نکلنے کا واحد یہی حل ہے۔ مجھے معلوم پڑا ہے کہ تم سب بک خزانے کی تلاش میں یہاں پہنچے ہو۔ وہ سائنڈ جم کیٹی خزانے کے لئے دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ مگر بڑے دوست خزانہ اب کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ خزانہ بوکاشی دیوتا حاصل کر کے کب کا ہضم بھی کر چکا ہے۔ یہاں جوشان و شوکت اور مہلات کی فروانی نظر آرہی ہے اس خزانے کی ہی وجہ سے ہے۔ میرا بال ہے میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا ہوگا کیونکہ شاید تم.....“

”نہیں میرے دوست! میں اس دوڑ میں شامل نہیں ہوں.....“ میں دھیمے لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب..... تم خزانے کی تلاش میں..... نہیں آئے؟“

”نہیں دوست..... یہ تو قسمت کا پھیر ہے جو مجھے یہاں لے آیا ہے۔ مجھے خزانے یا دولت کے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں بالی کو یہ بتا کر اپنی بڑائی ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کو یہاں لینے کے لئے آیا تھا اور اپنی بہن کے قتل کا حساب چکانے کے لئے آیا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا تمہاری جم کیٹی سے لڑائی..... خزانے کی وجہ سے ہو رہی تھی.....“ بالی نے بی خاموشی توڑی۔

میں نے بالی کو پوری طرح یقین دلادیا کہ میں اس ارادے سے یہاں ہرگز نہیں آیا تھا۔ میں مابالی سے باتیں کر رہا تھا کہ بالی نے اچانک آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی شاید وہ وقت کا حساب لگانا رہا تھا۔ پھر دفعتاً وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور میرا بازو کھینچتے ہوئے بولا۔ ”علی نواز! اس پتھر پر بیٹھ جاؤ ماکالی فوج کا ایک سپاہی آئے گا اور تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ وہ ہمارے گروہ کا جنگجو ہوگا۔ وہ میں جہاں لے جائے وہاں چلے جانا وہاں تمہیں بہت سی معلومات سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ تم نے گروہ میں شامل ہو چکے ہو۔ تمہارا کام شروع ہو چکا ہے۔ تم جن سے ملنے جا رہے ہو وہ ہم سب سردار ہیں۔ ہم سب انہی کے حکم کے غلام ہیں۔ اب جلدی کرو وقت بہت کم ہے۔ صبح سورج نکلنے لگا۔ بوکاشی دیوتا کی طاقت کا منحوس سایہ اس دھرتی کی ہر ایک چیز کو اپنے حصار میں لے لے گا۔“ بالی

اس وقت اس دھرتی میں جنگی حالات نافذ ہیں۔ بوکاشی دیوتا کے حکم سے جلی گوریلوں پر فوج کشی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ ان حالات میں آپس میں لڑنا بڑا گھانے کا نقصان اور بوکاشی دیوتا کے غصے کو بڑھانے کا سبب بنے گا۔ اسی لئے ان نازک حالات میں دونوں گروہوں کی یہ ”غلطی“ میں معاف کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ جنگی مشقوں کی تیاریوں کو عروج کی شکل دے دی جائے۔“ اماؤس کی رات کو بوکاشی دیوتا کی غیر موجودگی میں سردار رواؤ و دیوتا کا قائم مقام ہوتا تھا۔ دھرتی میں اس کا حکم چلتا تھا۔ سردار رواؤ کی تقریر ختم ہوئی تو لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھلے میدان کی جانب جانے لگے جہاں جگہ جگہ لاؤ روشن تھے اور جنگی مشقیں کی جا رہی تھیں۔ میں ایک الاؤ کے پاس پہنچا تو وہاں بالی بیٹھا تھا۔ رسی علیک سلیک کے بعد میں وہاں بیٹھ گیا۔ اس کی کلانی بے مخالف سپاہی کا اپنی خود لگا تھا اور ایک گہرا زخم دے گیا تھا۔ بالی نے وہاں ایک موٹا کپڑا باندھ رکھا تھا۔ بالی کا چہرہ آگ کی روشنی میں تہمتا رہا تھا اور اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں کوئی کہانی سنا رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی بات کرتا وہ خود ہی بول پڑا۔ اس کی باتوں نے میری دھڑکنوں میں بے چینی کوٹ کوٹ کے بھر دی۔ اس نے سلسلہ کلام اس طرح سے شروع کیا۔

”علی نواز! میں جہاں تک تمہارے بارے میں جان چکا ہوں اس کے بعد مجھے تم کو یہ باتیں بتاتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں ہو رہی۔ علی نواز..... دیوتا بوکاشی کے نہایت ظالمانہ اور سخت قانون کے باوجود یہاں اس کالی فوج میں ”بوکاشی مخالف“ تحریک موجود ہے۔ یہ گروہ چند نوجوان جنگجوؤں پر مشتمل ہے اور اس گروہ کا سردار میں ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب جنگجو تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر لڑے ہیں وہ سب میرے گروہ کے جانباز ہیں۔“

”میں یہ بات ہرگز نہیں مانتا کہ یہاں کوئی بوکاشی دیوتا مخالف گروہ موجود ہے اور تم اس گروہ کے سردار ہو۔“ میں بالی کے سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”دوست میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تم یقیناً یہ سوچ رہے ہو گے کہ بوکاشی دیوتا دلوں کے حال تک جان لیتا ہے۔ پھر ایسا گروہ اس عجیب و غریب وادی میں پرورش کیسے پاسکتا ہے۔“

”ہاں..... یقیناً..... بوکاشی دیوتا کی نظر سے یہ تحریک کیسے چھپی رہ سکتی ہے؟“ میں حیرانگی سے بولا۔

”میرے دوست! میرے گروہ کے سب جنگجو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ وہ دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت اور کینہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ سب بوکاشی دیوتا کو دھوکے میں رکھنے کے لئے ہیں۔ جونہی اماؤس کی رات شروع ہوتی ہے۔ یہی ”جانی دشمن“ مخصوص اشاروں کی مدد سے ایک دوسرے کا

”مگر کیا..... سردار.....؟“ میں سردار روبان کے غم زدہ چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

”مگر اس دھرتی کے منحوس فرمانروا کی ظلمت کا سایہ میرے بچے پر پڑ گیا اور وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔“ سردار روبان ہنسیکے لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو کالے رنگ کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آئے۔ البتہ اس کی سرخ رنگ آنکھیں کسی گزرے بہت بڑے سانے کی کہانی سنارہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں سردار روبان سے مزید کوئی تفصیل پوچھتا مطلوبہ جگہ آگئی اور سردار روبان مجھے وہاں چھوڑ کے نمناک آنکھوں سے واپس پلٹ گیا۔ میں حیران پریشان نشست گاہ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے شدید جھٹکا لگا کہ میں ایک بار پھر بیلہ کے کمرے میں کھڑا تھا۔ وہی بیلہ جو شاید بوکاشی دیوتا کی بیوی تھی۔ میری بیلہ سے آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب میری شاہنواز پارٹی سے لڑائی ہو رہی تھی اور بیلہ وہاں پہنچی تھی۔ وہ میری بہادری سے متاثر ہوئی تھی اور مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی تھی۔ وہ چند منٹ مجھ سے گفتگو کرتی رہی تھی پھر اوپر کھٹکا ہونے پر اس نے مجھے واپس بھیج دیا تھا۔ آج میں دوبارہ اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتے لہجے سے میرا استقبال کیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آ رہی تھی۔ وہ نشست گاہ میں چہل قدمی کرتے ہوئے بولی۔

”ایلی نیوز! ہم لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہے۔ بہت سی تفصیلات تمہیں بالی سے معلوم ہوگئی ہوں گی۔ باقی میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ ایک ایک بات غور سے سننا کیونکہ یہ باتیں تمہیں سمجھنی بہت ضروری ہیں۔ بوکاشی دیوتا بدی کی ایک طاقت کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو اس دھرتی پر موجود انسانوں کے دل اور دماغوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ بدی کی یہ غلیظ طاقت بے کسوں اور مجبوروں کا لبو چاٹتی ہے۔ ان کی عزتوں کو ہوس کے بستر پر سلاتی ہے۔ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ وہ آزاد ذہن سے جینا چاہتا ہے، آزاد زندگی میں سانس لینا چاہتا ہے۔ مگر بوکاشی دیوتا کی غیبی طاقت نے ہر ذہن ہر سوچ کو جکڑ رکھا ہے۔ اس دھرتی میں کوئی اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں۔

ایلی نیوز! یہاں کا ہر باسی موت سے بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ تم پوچھو گے کہ کس طرح۔ تو وہ اس طرح کے جب آدمی کومن میں اٹھنے والی سوچ کے برعکس سوچنا پڑے دل میں پلنے والے خیالات کو ختم کر کے چہرے پر مسکراہٹ سجانی پڑے تو کیا بنتی ہے۔ آدمی کئی دفعہ مرتا ہے مگر مرنے کے بھی نہیں مرتا۔ تمہیں میرا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی ہوگی کیونکہ تم بھی تو سبھی لوگوں کی طرح اسی کیفیت کا شکار ہو۔ یہاں کا ہر باشندہ چہرے پر بوکاشی کے لئے مسکراہٹ سجائے رکھتا ہے۔ وہ ہر وقت بوکاشی دیوتا کے گن گاتا ہے اس کی تعریفیں کرتا ہے۔ اس کو اپنا سب کچھ مانتا ہے۔ اس کے حضور

اٹھا اور سامنے آتے ہوئے ایک کالی جنگجو کے سر پر تلوار کا بھرپور وار کیا جو اس نے کمال پھرتی سے اپنی تلوار پر روکا۔ بالی کچھ بولا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ اس کے جواب میں کالی جنگجو جو بولا وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دونوں تلوار چلاتے ہوئے دور نکل گئے اور میں وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ مجھے فوراً بالی کی کبھی ہوئی بات یاد آئی اور میں اس پتھر کی سمت دوڑتا چلا گیا۔ جلد ہی میں اس پتھر پر بیٹھا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہاں ایک کالی جنگجو آ موجود ہوا۔ میں نے غور کیا تو وہ سردار روبان تھا۔ تو..... تو کیا سردار روبان بھی..... بالی گینگ کا ساتھی تھا۔ آتے ہی اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے لگ کر چل پڑا۔ سردار روبان کے بارے میں یہ جان کر کہ وہ بھی بوکاشی مخالف گروہ میں شامل ہے، میرا دل انجانی خوشی سے بھر گیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلتے لگا۔ جلد ہی ہم محل میں داخل ہو گئے۔ مختلف راہدار یوں سے گزرتے ہوئے سردار روبان نے مجھے بتایا کہ ”علی نواز! ہمارے گروہ میں شامل ہونا تمہیں مبارک ہو۔ تمہارا کام ابھی سے شروع ہو چکا ہے۔ یہ رات..... اس رات کا ایک ایک بل ہمارے لئے بہت قیمتی ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ سورج طلوع ہوتے ہی بوکاشی دیوتا کی ہراساں طاقتوں کا منحوس سایہ اس دھرتی کو پھر سے اپنی پلیٹ میں لے لے گا۔ ہم لوگوں نے دن چڑھنے سے پہلے پہلے بہت سے کام نبھائے ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب بوکاشی دیوتا اپنی منحوس شکلیوں سمیت نکلے گاٹھ اتر جائے گا۔“

”سردار روبان! مجھے ابھی تک یقین نہیں ہو پا رہا کہ تم..... بوکاشی دیوتا مخالف گروہ میں شامل ہو۔“

”علی نواز! تمہاری اور سب باتیں تو سرداروں والی ہیں مگر اس معاملے میں تم مات کھا گئے۔ تم میرے بارے میں اتنا بھی نہ جان پائے کہ میں کیا ہوں۔ میں کیوں تمہیں ہر جگہ بچاتا رہا اور تمہارے آگے ڈھال بنتا رہا۔“ سردار روبان معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ تو یکا یک جھماکا سا ہوا اور جیسے سب کچھ مجھ پر کھٹکا چلا گیا۔ سردار روبان نے جنگل میں خزیروں کے قاتلانہ وار سے مجھے بچایا تھا..... سردار روبان نے سزا خانہ میں بوگالے کے خون دار سے مجھے بچانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ خود زخمی ہو گیا تھا۔

”علی نواز! ایک بات تو یہ کہ میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں تمہاری شکل میں مجھے اپنے بیٹے کی شکل نظر آتی ہے..... وہ بھی بالکل تمہاری ہی طرح اونچا لمبا جوان تھا..... میں..... میں اسے اپنے قبیلے کا سردار بنانا چاہتا تھا مگر.....“

ب ایک کر کے مرنا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ تھوڑے عرصے میں پورے قبیلے میں ایک بھی جوان نہ رہا۔ دن نکلنے لگے کسی نوجوان کو دورہ پڑتا اور سورج ڈوبنے سے پہلے وہ اپنی جان ہار جاتا۔ جب ب نوجوان ختم ہو گئے تو بوڑھوں کے مشورے سے بوڑھے، بچے، عورتوں اور نوجوان لڑکیوں نے اس سے بھاگنے میں عافیت جانی۔ یہ سب لڑے پڑے لوگ کئی دنوں کے اذیت ناک سفر کے بعد اہل سمندر پر اترے اور گرتے پڑتے اس منحوس بستی میں آپہنچے۔ نوجوان اور خوب لڑکیاں دیکھ کر ہاشی دیوتا کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے ان مجبور اور لاچار لوگوں کو اپنی بستی میں پناہ دے دی۔ ندر پار سے آنے والا انگریز قبیلہ پہلے تو بہت خوش ہوا مگر تھوڑے عرصے میں ہی ان کی ساری خوشی ب ہو گئی۔ بوکاشی دیوتا نے آہستہ آہستہ اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔

وہ ہر رات ایک نوجوان انگریز لڑکی کے ساتھ گزارنے لگا۔ انگریز قبیلے کے لوگ کچھ بھی بن کر سکتے تھے۔ وہ اتنے عرصے میں بوکاشی دیوتا کی غیر معمولی طاقت سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ بوڑھے آنکھوں کے سامنے ان کی عزتیں تار تار ہوتی رہیں مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکلا، دل سے آہ نہ لگی، دماغ سے کوئی غلط سوچ نہ نکلی۔ کیونکہ سوچوں اور جذبات پر پہرہ تھا۔

ایک پراسرار بیماری کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھاگنے والے انگریز قبیلے کے لوگ ایک مصیبت سے نکل کر دوسری بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ وہ بے چارے یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں مگر ان نکل پار ہے۔ اس بستی کے بڑے بوڑھے تو دبے دبے لفظوں میں یہ بھی کہتے ہیں کہ سمندر پار اس برے میں پراسرار بیماری بھیجنے والا بھی بوکاشی دیوتا تھا۔ بوکاشی دیوتا کی غیبی طاقت نے وہاں موت بازار گرم کیا اور ان بچے کچھے لوگوں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا۔

”اے محترم خاتون! میں معافی چاہتے ہوئے ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔ آپ..... بوکاشی تا کی بیوی ہیں..... میرا مطلب ہے.....“

”ایلی نیوز! میری کہانی بڑی طویل ہے مگر میں مختصر الفاظ میں بتاتی ہوں کہ میں بوکاشی دیوتا کی ب سے بڑی دشمن ہوں۔ مگر مقدر کے کھیل نے مجھے اس کی بیوی بنا دیا۔ میں نے بھی تقدیر کے پیھر تسلیم کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیا۔“ بیلہ کی خوبصورت آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے آنسو لہرا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا..... اور سپاہیانہ لہجے میں بولی۔ ”ایلی نیوز! تمہاری امت میں امید کی آخری کرن ہمارے پاس موجود ہے اور اس امید پر ہم سب بہت پر یقین ہیں۔ نوجوان دیوتا کو شکست دینے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ صرف ایک ہی راستہ ہے جس کے ذریعے

اپنا ماتھا رگڑتا ہے۔ مگر حقیقت اس سے مختلف ہے۔ بوکاشی کے گن گانے والا اس کی تعریفیں کرنے والا اس کے قدموں میں سر رگڑنے والا اماؤس کی رات کو اپنے گھر میں بند ہو کر اپنا غصہ نکالتا ہے۔ بوکاشی کو گالیاں دیتا ہے اس کی موت کے لئے عبادت کرتا ہے۔ برب دیوتا سے رو رو کر سب کی آزادی کی دعا مانگتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے چل رہا ہے مگر کسی کی دعا قبول نہیں ہو رہی۔ بوکاشی دیوتا کو ہتھیار سے مارنا ناممکن ہے۔ یہ کوشش کئی بار ہو چکی ہے اور ہر بار حملہ آور ناکامی کے سبب زرزوف کی سرکاکا مستحق ٹھہرا ہے۔“

”تو پھر ایسا کون سا طریقہ ہے جس کے سبب ہم لوگ بوکاشی دیوتا پر قابو پا سکتے ہیں۔“ میں کافی دیر بعد اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بولا۔

”صرف ایک رستہ ہے..... صرف ایک.....“ ”بیلہ انگلی کھڑی کر کے پراسوج لہجے میں بولی۔“

”کون سا رستہ.....؟“

”بھیڑا کے چار ہیرے جلی گوریلوں کو واپس مل جائیں۔“

”جلی گوریلوں کو واپس مل جائیں.....؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا.....“ میں حیرت سے بولا۔

”ایلی نیوز! بھیڑا کے وہ چار ہیرے جو اس وقت بوکاشی دیوتا کے قبضے میں ہیں اصل میں.....“

وہ چاروں ہیرے جلی گوریلوں کے ہیں۔ آج سے بہت سال پہلے جب جلی وادی میں ایک بہت خوفناک سیلاب آیا تھا تو ساری بستی اجڑ گئی تھی۔ سیلاب کے بعد وہاں ہر طرف موت ناجیتی نظر آتی تھی۔ اس بربادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بوکاشی اپنے سر پھرے جنگجوؤں کے ساتھ وہاں پہنچا اور بھیڑا کے چار متبرک ہیرے لے اڑا۔ جلی گوریلوں نے بوکاشی کا تعاقب کیا مگر ناکام رہے۔ بوکاشی ہیروں کے ساتھ اپنی بستی میں پہنچا۔ اس دن سے لے کر آج تک جلی گوریلوں نے بہت کوشش کی، بہت حملے کئے تاکہ وہ اپنے ہیرے واپس لے سکیں مگر وہ ناکام رہے۔ ان ہیروں کی بدولت اس دھرتی کے تمام باشندے بوکاشی دیوتا کے حکم کے غلام ہیں۔ وہ اس کا ہر حکم ماننے کے پابند ہیں۔“

”یہ سفید چمڑی والے انگریز یہاں پر کیسے موجود ہیں۔ یہ لوگ تو اس جنگلی دھرتی کے نہیں لگتے؟“ میں نے بیلہ سے وضاحت چاہی۔

”ہاں یہ لوگ اس جنگلی دھرتی کے نہیں..... ان لوگوں کی بد قسمتی گھیر کر ان لوگوں کو یہاں لے آئی۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے سمندر پار کسی نامعلوم جزیرے سے یہ انگریز قبیلے کے لوگ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس جزیرے پر ایک عجیب بیماری نے حملہ کیا تھا۔ قبیلے کے تمام نوجوان





کھڑی عورت کوئی اور نہیں ساسا تھی..... ساسا..... وہی ساسا جو بالی کی دربار بیوی تھی..... جو اپنے خاوند کی یاد میں اپنا سبز چھلنی کئے ہوئے دن رات کی بچی میں پستی رہی تھی۔ میں نے ساسا کو بمشکل پہچانا تھا۔ وہ بالکل بدلی ہوئی ساسا تھی۔ اس کے ہونٹوں کی سرخی چھن گئی تھی اس کے بال پر اگندہ اور حالت بالکل دیوانوں کی سی تھی۔ میں اونچی آواز میں پکارا۔ ”ساسا..... ساسا..... دیکھو..... ادھر دیکھو..... یہ میں ہوں..... علی نواز.....“

ساسا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ یوں لگا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور میں نے ساسا کا بازو تھام لیا۔ میں چیخ چیخ کر اسے پکارنے لگا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میرا دل غم کے تالاب میں ڈوب گیا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ بولتا تھوڑی دیر پہلے سردار روبان سے ہمکلام ہونے والا قیدی بول اٹھا۔

”بے چاری کا بچہ سیلاب میں بہہ کر مر گیا۔ اس وقت سے دیوانی ہو گئی ہے۔“ قیدی کی بات بجلی بن کر میرے دماغ پر گری اور میں سلاخ کے ساتھ اپنا سر ٹکا کر رہ گیا۔ میری خاموشی سردار روبان نے توڑی وہ میرے قریب ہو کر بولا۔ ”علی نواز! جلدی کرو وقت بہت کم ہے۔“ اس نے مجھے ہٹو کا دیا اور میں کسی خود کار عمل کے تحت مڑا اور اس کے پیچھے چلتا چلا گیا۔ ساسا کے معصوم بچے کی شبیہ میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ میں نے اس کے بچے کو صرف ایک مرتبہ دور سے دیکھا تھا اور آج تک اس کی شکل میری نگاہوں میں تھی۔ وہ بڑا پیارا اور گول منٹل سا بچہ تھا۔

سرنگ بہت سے موڑ مڑنے کے بعد آخر اختتام پذیر ہو گئی۔ ہم محل کے پچھواڑے کھلے میدان سے پار اس جگہ سے باہر نکلے جہاں پہاڑ کی کھوہ میں دو چراغ ہمہ وقت جلتے رہتے تھے۔ سردار روبان ان چراغوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”علی نواز! تم جانتے ہو یہ دو چراغ کیسے ہیں؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا تو روبان بولا۔ ”علی نواز! بوکاشی دیوتا کی بے حس اور ظلم کی انتہا کا اندازہ تم اس بات سے لگاؤ کہ یہ دونوں چراغ اصل میں دو انسانی کھوپڑیاں ہیں۔ بڑی کھوپڑی مرد کی اور چھوٹی کھوپڑی عورت کی ہے۔ یہ چراغ اس وقت تک روشن ہیں جب تک بھیڑا کے چاروں ہیرے بوکاشی کے پاس موجود ہیں۔ گویا یہ چراغ بوکاشی کی زندگی کے ضامن ہیں۔ ان چراغوں میں انسانی چربی جلتی ہے۔ جب تک یہ چراغ روشن رہیں گے بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اترتے رہیں گے۔“

سردار روبان باتیں کر رہا تھا اور میرا ذہن حیرتوں کے سمندر عبور کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں مہذب

دنیا سے بچھڑ کر یہ کس جہان میں پہنچ گیا تھا؟ جہاں انسان کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جہاں انسانی دل و دماغ بے خوف کے پہرے تھے۔ جہاں غم پینا ہی نہیں اپنی سوچ میں سے بھی ختم کرنا پڑتا تھا۔ جہاں ایک فرد واحد کے حکم پر انسان، انسان کو کاٹنا چلا جاتا تھا۔

میں سردار روبان کے ساتھ ایک ترچھا موڑ مڑ کر ڈھلوان سے اترتا چلا گیا۔ رات کے اس پہر ہر طرف گہما گہمی تھی۔ لوگوں کے چہرے بے خوشی کھیلتی تھی۔

ان کی مسکراہٹوں میں نغے گونجتے تھے۔ ایک جگہ ایک پڑاؤ میں کالی فوج کا ایک سپاہی شراب کے نشے میں دھت چلچ پکار کر رہا تھا۔ ایک سپاہی اسے سنہالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بولتا چلا جا رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ ”بوکاشی دیوتا بہت بڑا فراڈ ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بوکاشی دل کا حال جانتا ہے۔

غیب کی باتوں کا علم رکھتا ہے وہ لوگ بکواس کرتے ہیں، بوکاشی کچھ نہیں جانتا بس ایک خوف ہے جو لوگوں کے دل و دماغ بے حکمرانی کرتا ہے۔ میں دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں بوکاشی کو دن شروع ہونے سے دن ڈوبنے تک گالیاں نکالتا ہوں۔ میں دل ہی دل میں ہزاروں بار اسے قتل کرتا ہوں۔ اس کے منہ پر تھوکتا ہوں مگر اسے آج تک معلوم نہیں ہوا۔ دیوتاؤں کی قسم لوگو! بوکاشی جھوٹ اور بکواس ہے۔ اس کی پیروی کرنا پھوڑ دو۔ برب دیوتا کا نام لے کر اس لعنت کو ہمیشہ کے لئے یہاں سے ختم کر دو۔“ وہ ہذیبانی انداز میں پیٹھا جا رہا تھا۔ اس کے آس پاس موجود لوگوں کے چہروں پر انتہا درجے کا خوف پایا جاتا تھا۔ اس کا ایک ساتھی اس کو چپ کروانے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ سردار روبان نفوس کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بے چارہ بھی گیا..... دن چڑھتے ہی اسے زرزوف کی سزا سنادی جائے گی۔“

”نہیں سردار..... اسے کوئی سزا نہیں سنائی جائے گی.....“ میں اٹل لہجے میں بولا تو سردار روبان نہایت حیرانگی میں میری طرف دیکھنے لگا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ وہ بولا۔

”ہاں سردار! بوکاشی دیوتا کے ظلم کی رات کو سویرا ملنے والا ہے۔ مجھے تم بس جلدی سے محترم دبا سار تک لے جاؤ۔“ میں جس لمحے یہ بات کر رہا تھا میری نگاہ بوگالے سے ٹکرائی جو گھوڑے پر دار ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ محل کی جانب تھا اور اس کی آنکھوں میں ابھو اتر رہا تھا۔

سردار روبان کی نگاہ بھی اس طرف اٹھ گئی تھی وہ قدرے پریشان ہو کر میرا ہاتھ کھینچنے لگا ہم جلد ایک نیلے کا کلاؤ کاٹ کر بستی کے چوراہے میں پہنچ گئے۔ سردار روبان ایک طرف اشارہ کر کے فوراً

آخری پہر کے دم توڑتے لمحوں کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اچھا..... تو پھر تو نہیں ملے گا..... اپنا ناس کروا کے جائے گا..... نہیں ملے گا.....؟“

”ہاں میں ایسے واپس نہیں جاؤں گا..... کسی صورت نہیں جاؤں گا۔“

”اچھا..... اچھا پھر اپنا کان ادھر لا.....“ زو باسار ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ سرگوشی سے بولا۔

لیکا یک میری دھڑکنوں میں انتہا کی بے چینی آگئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے

بڑھا اور کان زو باسار کے منہ کے قریب کر دیا۔ میں ہمتاں گوش تھا۔ زو باسار کی سرسراتی آواز میری

سماعت میں گونجی۔ ”ان ہیروں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ظلم کی چکی چلتی رہے گی۔ وقت کا پہیہ گھومتا

رہے گا۔ اس منحوس طلسم کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ نہ تو..... نہ میں..... نہ اور کوئی۔ ہم لوگ بھی ایک دن

اس کے ظلم کی بھیئت چڑھ جائیں گے۔ ہمارا گوشت بھی مچھلیاں کھائیں گی مسیحا نہیں آیا..... مسیحا نہیں

آیا..... مسیحا کبھی نہیں آئے گا..... تو..... تو خود کو مسیحا سمجھتا ہے جا..... جادو ہو جا..... تیری لاش

بھڑیئے نوچیں گے..... چلا جا یہاں سے۔“ زو باسار نے مجھے دھکا دیا اور میں الٹ کر گرا۔ میری

آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی۔ میں دوبارہ اٹھ کے بیٹھا اور گلو گرائل لہجے میں بولا۔

”نہیں..... محترم زو باسار..... میں ایسے نہیں جاؤں گا جب تک آپ مجھے نہیں بتائیں گے

میں نہیں جاؤں گا“ مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا اور میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ شکستہ و ریختہ

پنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ زو باسار نے ایک سوکھی شاخ اٹھائی اور میرے سر پر دے ماری۔ خون کا

یک نورہ ابلا اور میرا چہرہ تر بہتر ہو گیا۔ میں پھر بھی کہہ رہا تھا ”محترم زو باسار! آپ کو بتانا پڑے گا.....

آپ کو ہیروں کے متعلق بتانا پڑے گا..... نہیں تو..... جتنا خون ہے گا جتنے قتل ہوں گے، جتنا ظلم ہو گا اس

ل آپ برابر کے شریک ہوں گے۔“ میری باتوں کا جیسے زو باسار پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا وہ اپنے

یلے کپلے دانتوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ میں رو رہا تھا چیخ رہا تھا اور بول رہا تھا۔ اسی دوران سردار

دبان نے مجھے پیچھے سے آکر تھام لیا۔ وہ مجھے کھینچ کر گھوڑے پر سوار کر رہا تھا جب کہ میں اس سے اپنا

پ چھڑا رہا تھا۔ پھر سردار وروبان کی میرے کان میں کہی ہوئی بات نے مجھے چپ کرادیا۔ اس نے

ہمارا کام اس کی رات ختم ہو چکی ہے دن چڑھ گیا ہے۔ نقارہ بجتے ہی بوکاشی دیوتا کی طلسمی طاقت اس

لڑتی کو اپنے جال میں جکڑ لے گی۔ اسی لئے فوراً یہاں سے نکل چلو۔

دن چڑھ آیا تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ میں بستی کے چوراہے سے ناکام اور

رادو واپس لوٹا تھا۔ امید کی آخری کرن بھی بجھ گئی تھی۔ مجھ پر عجیب طرح کی ناامیدی کی جھنجھلاہٹ

وہاں سے غائب ہو گیا۔ ایک بہت بڑے درخت کے نیچے ایک مفلوک الحال شخص ایک نہایت غلیظ اور

پھٹی پرانی چادر لئے لیٹا تھا۔ اس کی لابی داڑھی کھجڑی اور سر کے لمبے بال پراگندہ ہو رہے تھے۔ اس

کے منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں۔ وہ ناگوں تک میلی چادر اوڑھے یوں لیٹا تھا جیسے اسے سردی لگ رہی

ہو۔ میں بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور بیلہ کے کہنے کے مطابق میں نے محترم زو باسار کے قدم تھام

لئے۔ میری اس حرکت سے وہ یوں اچھل کے بیٹھا جیسے بجلی کے ننگے تاروں نے اس کے پاؤں چھو

لئے ہوں۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تو میں اس کے قریب ہوا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نہایت لجاجت سے بولا۔

”محترم زو باسار..... میں..... میں آگیا ہوں۔ آگیا ہوں میں..... بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں.....

کتنی غناک آنکھیں پتھرا گئیں..... جبر کی رات طویل ہو گئی..... امن کا سورج طلوع نہیں

ہوا..... لگا ہیں انتظار کی سولی پر لٹک گئیں، مگر وقت کا مسیحا نہیں آیا..... میں..... میں امن کی ڈور تھامنے آیا

ہوں۔ میں مسکرا ہٹوں کو واپس لانے کیلئے آیا ہوں۔“

زو باسار نے ایک طویل چیخ ماری اور بادلوں کی سی گرجدار آواز میں بولا۔ ”چلا جا..... چلا جا

یہاں سے..... مارا جائے گا..... سمندر کی مچھلیاں تیرا گوشت کھائیں گی۔ وہ تیرا بھی خون پی جائے

گا..... جا..... جا..... جا.....“ زو باسار مجھے دھکے دینے لگا۔ وہ مجھے دھکے دیتا ہوا کافی دور تک لے

گیا۔ بستی میں چلنے پھرنے والے لوگ یہ منہ خیز منظر دیکھ کر لطف اندوز ہونے لگے۔ کالی فوج کا ایک

سپاہی آگے بڑھ کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کیوں پاگل سے لچکتے ہو..... ابھی یہ تیرا سر پھاڑ ڈالے

گا..... یا تجھے جان سے مار دے گا۔ جاؤ اپنا رستہ لو..... اسی دھرتی پر مشکل وقت آن پڑا ہے ابھی نہیں

جوانوں کی سخت ضرورت ہے۔“ سپاہی کی بات پر سب لوگ قہقہے لگانے لگے، کچھ لوگ کھڑے تماشا

دیکھتے رہے اور بہت سوں نے اپنی راہ لی۔

میں مسلسل زو باسار سے جو گفتگو رہا۔ میں اسے قائل کرنے کی کوشش میں رہا کہ وہ مجھے ہیروں

کی بابت بتا دے اور وہ عظیم راز بتا دے جس کے ذریعے ہیروں حاصل کئے جاسکتے تھے۔ مگر میری

تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ بیلہ کے پلان کا قلعہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔

زو باسار مسلسل مجھے وہاں سے چلے جانے کے لئے کہہ رہا تھا جبکہ میں اپنے موقف پر ڈٹا ہوا

تھا۔

”محترم زو باسار! آپ جب تک مجھے نہیں بتائیں گے کہ ہیروں کہاں ہیں اور وہ کیسے حاصل

کئے جاسکتے ہیں میں یہاں سے نہیں ٹلوں گا چاہے آپ مجھے جان سے مار ڈالیں۔“ میں اماؤں کے

کوئی اور اس طلسمی درندے کو معاف کر سکتا تھا..... مگر میرے لئے پانی سر سے گزر چکا تھا۔ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہت دور جا چکا تھا۔ میں نے رابعہ کی بے وفائی کے کرب کو بوکاشی کے انتقام میں ڈھال لیا تھا۔

وہ بڑا ہی چمکیلا دن تھا۔ ہوا مشرق سے مغرب فرارے بھر رہی تھی۔ آج اس وادی کے سب سے بڑے میدان میں کالی فوج کا سب سے بڑا اجتماع ہو رہا تھا۔ بوکاشی دیوتا اپنی نشست پر جلوہ افروز تھا۔ اس کے سامنے جنگجو انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس وادی کا کوئی انسان ایسا نہیں بچا تھا جو اس وقت اس میدان میں موجود نہ ہو۔ مرد و زن سے میدان کھچا کھچا بھرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک جگہ آنکھوں میں جلتی ہوئی سرخی لئے کھڑا تھا۔

بوکاشی دیوتا کی پراسرار آواز بلند ہو رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں پتہ چلا ہے ہماری غیر موجودگی میں یہاں آپس میں مارا ماری ہوئی ہے۔ ذمہ دار لوگ ہماری نگاہوں میں ہیں اور انہیں اپنے کئے کی سزا مل کے رہے گی۔ ان کی سزا کے لئے یہ موقع بہتر نہیں..... ابھی اس وادی میں جنگی حالات نافذ ہیں جو نبی ہم جلی گوریلوں سے فارغ ہوں گے تو اپنی فوج میں سے کالی بھیڑوں کو نکال باہر کریں گے۔“

بوکاشی مزید بولا۔ ”میرے ساتھیو بڑے عرصے سے جس وقت کا ہمیں انتظار تھا وہ آج پہنچا ہے۔ ہمارے بہادر بالکل تیار ہیں۔ اب وہ وقت دور نہیں جب جلی وادی میں کالی فوج کا جھنڈا پھڑ پھڑا رہا ہوگا۔ میں اپنے جوانوں کو آج ایک خوشخبری سنانے والا ہوں۔“ بوکاشی خاموش ہوا تو ہر طرف سے آوازیں اور جوشیلے نعرے بلند ہونے لگے۔ اتنا شور مچا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دکاشی کا لمبا ہاتھ بلند ہوا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی بوکاشی بولا۔

”آج میں نے تمہارے لئے ایک نئی ملکہ جن لی ہے اور اس نئی ملکہ سے شادی کرتے ہی تمہارا یہ دیوتا ہمیشہ کے لئے امر ہو جائے گا۔“ بوکاشی کی بات ختم ہوتے ہی شور محشر برپا ہو گیا۔ بیٹیاں لکارے اور آوازے بلند ہونے لگے۔ لوگ اچھل اچھل کر بوکاشی کو مبارک باد دینے لگے۔ میری آنکھوں سے جیسے لہو ٹپکنے لگا تھا۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا کہ مجھے کو چیرتا ہوا کوئی میرے پاس پہنچا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کو پرے ہٹاتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا۔ جلد ہی ہم دونوں میدان سے باہر بستی کے ایک بڑے میں کھڑے تھے۔ مجھے مجھے سے باہر لانے والی پو باشہ تھی۔ اس نے اپنا چہرہ نقاب میں بیٹھ رکھا تھا۔ بستی میں پہنچتے ہی اس نے نقاب الٹ دیا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سو جی ہوئی

چھا گئی جیسے ظلم کی طاقت جیت گئی اور امن کا پیچھی ہار گیا ہو۔ وہاں سے ناکام لوٹنے سے بہت سے خواب چکنا چور ہو گئے تھے جس میں بوکاشی دیوتا کو اذیت ناک موت مارنا بھی تھا۔ بوکاشی دیوتا رینا کا قاتل تھا وہ میگی کا قاتل تھا۔ وہ اور بہت سے معصوم انسانوں کا قاتل تھا۔ اس کی طاقت کے سامنے سب سرنگوں تھے۔ بوکاشی کے سحر کا طلسم توڑنے سے میں رابعہ کی زندگی بچا سکتا تھا۔ وہی رابعہ جس کی زندگی کی خاطر میں پوری دنیا سے ٹکرا سکتا تھا، وہی رابعہ جس نے مجھے ہمیشہ کانٹوں پر گھسیٹا تھا، میری روح پر اتنے زخم لگائے تھے کہ میں گنتے سے قاصر تھا۔ میں اس کی یاد میں پل پل جیتا تھا پل پل موت کے بھنور میں ڈوبا تھا۔ ہاں وہی رابعہ جس نے چند دن پہلے مجھے دھتکار دیا تھا۔ شاہنواز کی میرے ساتھ ہونے والی لڑائی میں شاہنواز کا ساتھ دیا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیسا پیارا تھا یہ کیسی خود فریبی تھی۔ یہ کیسا سراب تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ جتنا کچھ رابعہ اب تک مجھ سے کر چکی تھی اس کے بعد بھی رابعہ کے لئے میری تڑپ ہنوز برقرار تھی۔ بس اس تڑپ کا رخ بدل گیا۔ ان تین چار دنوں میں میں بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ مجھے رابعہ کو جنگیوں کے اس گھیرے سے نکالنا تھا۔ اس عجیب و غریب وادی سے بہت دور لے جانا تھا۔ مجھے اس کی زندگی بچانا تھی مگر بستی کے چوراہے سے ناکام لوٹنے سے سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔

ناکامی حسرت نے میرے وجود میں آگ لگا دی تھی۔ اماؤں کی رات ختم ہو چکی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا میں اپنی ناکامیوں اور پریشانیوں کو دبانے کی کوشش کروں گا تو میرا وجود پھٹ جائے گا۔ میں اپنے غم کو چھپانے سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤں گا۔ میں نے دیکھا تھا نقارہ بجنے سے پہلے سردار روبان، بیلہ، بالی اور بہت سے سپاہیوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ حسب سابق میں بھی محترم زو با سار سے وہ کچھ اگلوانے میں ناکام ہو چکا ہوں جس کے افشاں ہونے سے اس دھرتی کے در ماندہ لوگوں کی آزادی وابستہ تھی۔ نقارہ بجنے سے پہلے سب چہرے بے چارگی کی تصویر تھے۔ جو نبی نقارہ بجا ہر چہرے ہر دل میں بوکاشی کے خوف کی مسکراہٹ اتر گئی۔ بیلہ گینگ کے سب کارندے برسوں سے چلی آتی روٹین کے مطابق اپنا آپ ڈھال چکے تھے مگر میرے لئے اس صورت حال میں سب کچھ ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

رینا کی موت کا ذمہ دار میرے سامنے موجود تھا۔ زندگی سے پیاری بستی رابعہ سے چند دنوں میں شادی رچانے والا میرے سامنے موجود تھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا وہ بوکاشی تھا..... وہ خونخوار درندہ جس کی نحوست نے بستیوں کی بستیاں خون کے سمندر میں ڈبو دی تھیں۔ کوئی اور چپ رہ سکتا تھا.....

اس نے نمناک آنکھوں سے بڑے غور سے میری جانب دیکھا۔ اس سے پہلے کبھی بھی اس نے مجھے اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں تیرتی کہانی پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بوپاشے آگے بڑھی اس نے میرے دونوں ہاتھ تھامے اور اپنی آبدیدہ آنکھوں سے لگائے۔ وہ ایک ہنسی لیتے ہوئے بولی۔ ”آقا! میں آپ سے شروع دن سے بے تحاشا پیار کرتی آئی ہوں۔ میری آنکھوں نے آج تک آپ کے سوا کوئی خواب دیکھا ہی نہیں۔ مجھے علم ہے کہ میرا آپ کا ملاپ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ رابعہ کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ میرے آقا! میرے پاس وقت بہت کم ہے میں صرف اپنے پیار کا حق ادا کرنے آئی ہوں ہو سکتا ہے یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہو۔“ میں بوپاشے کی طرف حیرت سے دیکھتا چلا گیا۔

وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ ”آقا! بوکاشی دیوتا رابعہ سے شادی رچا رہا ہے۔ وہ اگر رابعہ سے شادی کر لے گا تو اس کی طلسمی طاقت دوگنی ہو جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ رابعہ کی پیدائش اماؤس کی رات کی ہے اور اس کے پیر کی انگلیوں کی چٹائی طرف چاند کی شکل بنی ہوئی ہے اور رابعہ اس جنگلی دنیا کی باسی نہیں ہے۔ میرے آقا! بوکاشی رابعہ کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اگر رابعہ اس شادی کے لئے انکار کر دے تو بوکاشی کسی طریقے سے بھی اسے اپنی دلہن نہیں بنا سکتا۔ میرے آقا! اپنے پیار کو برباد ہونے سے بچالو۔ رابعہ اگر بوکاشی کی دلہن بن گئی تو اس کی زندگی صرف گیارہ ماہ ہوگی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو بوپاشے؟“ میں حیرت آمیز غم ناک لہجے میں بولا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”ہاں میرے آقا! یہ بالکل سچ ہے مگر اس بارے میں چند لوگ جانتے ہیں کہ بوکاشی ہر پورن ماشی کی رات کو ایک لڑکی سے شادی کرتا ہے اور اس کی بیویوں کی تعداد ہمیشہ بارہ ہی کیوں رہتی ہے۔“

”ہاں اس بارے میں تو میں نے بھی سن رکھا ہے مگر یہ میں بھی نہیں جانتا کہ بوکاشی کے شادی کرنے کے باوجود بیویوں کی تعداد بارہ ہی کیوں رہتی ہے؟“

بوپاشے انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”میرے آقا جس دن بوکاشی نئی بیوی سے بیاہ رچاتا ہے اسی رات آخری والی بیوی کو قتل کر کے اس کا سر بھیڑا کی چھت سے لٹکا دیا جاتا ہے۔ جب اس کی کھوپڑی ننگی ہو جاتی ہے تو اس کو اتار کر درمیان سے کاٹ لیا جاتا ہے اور پھر میرے آقا پتہ ہے اس

آدھ کٹی کھوپڑی کا کیا کیا جاتا ہے.....؟“

میرا سوالیہ انداز دیکھ کر بوپاشے بولی۔ ”اس آدھ کٹی کھوپڑی میں انسانی چربی کے تیل کا چراغ روشن کیا جاتا ہے اور وہ چراغ پھر بستی سے پرے پہاڑ کی اس کھوہ میں جلتا رہتا ہے اسی چراغ کے ساتھ بھیڑا میں سے ایک آدمی کی کھوپڑی کا چراغ بنا کر بھی روشن کیا جاتا ہے۔ پہاڑ کی کھوہ میں جلتے ہوئے وہ دو چراغ آپ نے کئی مرتبہ دیکھے ہوں گے کوئی نہیں جانتا کہ ان دو چراغوں میں سے ایک چراغ ملکہ کی کھوپڑی کا ہوتا ہے۔ ایسا برسوں سے ہو رہا ہے۔ بوکاشی ہر پورن ماشی کی رات شادی بھی رچاتا ہے اور بیویوں کی تعداد بارہ سے بڑھتی بھی نہیں۔ یہاں کے سیدھے سادے باشندے یہی سمجھتے ہیں کہ جب بھی دیوتا شادی رچاتا ہے ایک ملکہ خوبصورت سا پرندہ بن کر اڑ جاتی ہے اور آنے والی دلہن کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے۔“

”بوپاشے! تم بھی تو یہاں کی ہی باسی ہو.....؟“ میں سوالیہ لہجے میں بولا۔

”نہیں میرے آقا! میں جلی قبیلے کی رہنے والی ہوں۔ بوکاشی کی بیوی بیلہ میری بہن اور بستی کے چوراہے پر پڑا نیم دیوانہ بوڑھا میرا باپ ہے۔“ بوپاشے کی بات سن کر میں بت بن کر رہ گیا وہ مزید بولی۔ ”میرے آقا! میرا باپ جلی قبیلے کا بہت ذہین اور بہادر سردار تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سرداری میں بھی بڑی خوبصورت مزرے والی زندگی گزار رہا تھا۔ ہر بندہ ہر سردار اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ خوشی اور مسکراہٹ ہر وقت اس کے چہرے پر چھائی رہتی تھی۔ پھر ایک دن ساری خوشیوں ساری مسکراہٹوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ پانی آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ بھیڑا کے چار مقدس ہیرے جو ہماری وادی کی شان تھے، جس کی وجہ سے تمام جنگلی دنیا کے قبیلے ہماری عزت کرتے تھے، ہمیں اپنا بڑا مانتے تھے وہ ہیرے ہم سے چھین گئے۔ ساری وادی تاریکی میں ڈوب گئی۔ ہر چہرہ سیاہی اور دل غم کے تالاب میں ڈوب گیا۔ میرے باپ سے بستی کا یہ حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے فیصلہ کیا اور قسم کھالی کہ وہ چوری ہونے والے چار مقدس ہیرے بوکاشی سے واپس لائے گا۔

ہم دونوں بہنیں اس وقت چھوٹی تھیں ہمیں معلوم ہی نہیں تھا ہمارا باپ کس مشن پر روانہ ہونے جا رہا ہے۔ میری ماں میرے باپ سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ اس سے ایک دن تو کیا ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دن آج بھی میری نگاہ میں روشن ہے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار تھا اور میری ماں گھوڑے کی لگام تھامے کھڑی تھی۔ وہ اسے روک رہی تھی وہ اس کے پیر پکڑ رہی تھی۔ اپنے ال نوج رہی تھی۔

کلبا رہے تھے۔ میں طوفانی انداز میں دوڑتا ہوا مجھے میں پہنچا تھا۔ ایک بے نام آتش تھی جو رگ رگ میں پھیل گئی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ میں مجھے کو چیرتا ہوا ایک جانب بڑھنے لگا اس طرف میں نے آخری دفعہ رابعہ کو دیکھا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو رابعہ نہیں تھی۔ میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ایک مہربان ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رابعہ تھی اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے بولنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لمحے میں کئی مناظر کئی جہان میری نگاہوں میں روشن ہو گئے۔ اس نے نازک ہاتھ سے میری کلائی تھامی اور ایک نسبتاً پرسکون جگہ پر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ نہایت نحیف اور لرزیدہ لہجے میں بولی۔

”علی نواز! اس دن کے رویے پر مجھے معاف کر دو۔ مجھے تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ میں شاہنواز کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔ علی نواز میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ تم شاہنواز سے الجھو گے تو مجھے ہمیشہ اس کا طرفدار پاؤ گے۔ علی نواز میں تمہیں اپنا اچھا دوست سمجھتی ہوں اور ہمیشہ سمجھتی رہوں گی۔ تم مجھ سے نہیں بولو گے۔ مجھ سے نفرت کرو گے، مگر یاد رکھو میرے دل میں تمہاری وہی قدر رہے گی۔ میں تمہیں ہمیشہ اسی طرح دوست کی نگاہ سے دیکھوں گی۔ پلیر خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ یہ شاید میری تم سے آخری ملاقات ہو۔ کیونکہ میں..... بوکاشی کی دلہن بننے جا رہی ہوں۔“

ایک زنانے کا پتھر رابعہ کے گال پر پڑا اور میں طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو۔ تم..... تم بوکاشی کی دلہن.....“ میری بات منہ میں رہ گئی۔ رابعہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک بازو سے میرا پہلو تھام لیا۔ اس طرح کرتے ہوئے وہ ساری کی ساری میرے ساتھ آگئی تھی۔ ایک حرارت پورے وجود سے پھوٹ نکلی تھی۔ وہ اس لمحے میرے ہی جسم کا حصہ تھی پر میری نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ وہ ہیکے لہجے میں بولی۔

”علی نواز! میری بات سن لو، کہیں تمہیں بعد میں افسوس نہ ہو۔ بوکاشی دیوتا میری شادی کے عوض شاہنواز کو وہ خزانہ دینے پر رضامند ہو گئے ہیں جس کی خاطر ہم لوگوں نے اتنا لمبا سفر اختیار کیا تھا۔“

میں عالم حیرت میں ٹکنکی باندھے رابعہ کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

”ہاں علی نواز! میں شاہنواز کے ساتھ اسی دولت کی تلاش میں ان جنگلوں میں آئی تھی۔“

مگر اسے تو رکنا ہی نہیں تھا۔ اسے تو اپنی قسم نبھانے کے لئے آگے بڑھنا تھا۔ سو وہ روتی تڑپتی ماں کو چھوڑ کر اس وادی کی طرف بڑھ گیا۔ میری ماں میرے باپ کی جدائی میں دس دن بھی نہ نکال سکی اور مر گئی۔ ہم دونوں ہمیشہ اس دنیا میں تنہا رہ گئیں۔ وقت گزرتا رہا اور ہم بڑی ہو گئیں۔ گزرے وقت کی تلخ یادیں ہم دونوں کی آنکھوں میں تازہ تھیں۔ میں بیلہ سے بڑی تھی۔ ایک دن میں نے بیلہ کو ساتھ لیا اور اس وادی میں پہنچ گئی۔ ہمیں اس وادی میں رہتے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تو میری اور بیلہ کی جدائی ہو گئی۔ سردار روڈو کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ مجھے برب وادی میں لے گیا۔ بہت عرصہ وہ مجھ سے اپنا دل بہلاتا رہا پھر اس نے مجھے کینروں میں شامل کر دیا۔ پورا ایک سال میں باپ اور بہن کی یاد میں روتی رہی۔ پھر ایک دن تم اس وادی میں آنے لگے۔ میں نے کئی دفعہ اپنے جسم کا نذرانہ تمہیں پیش کرنا چاہا مگر تم اپنا دامن بچا گئے۔ وہیں سے میں تم پر فدا ہو گئی۔“ یہ بات کہتے ہوئے میرے ہاتھوں پر پوباشے کی پکڑ بڑھ گئی تھی۔ وہ آنکھوں کے دھمونی گرا کر بولی۔ ”میرے آقا! میں یہاں پہنچی تو مجھے خبر ملی کہ بیلہ بوکاشی کی نظر میں آگئی تھی اور اس نے بیلہ سے شادی کر لی ہے۔ میری بہن اب بس تین مہینوں کی مہمان ہے۔“

اس کے بعد اسے بھی قتل کر دیا جائے گا اور اس کی کھوپڑی بوکاش کے اس کا چراغ بھاڑ کی کھوہ میں روشن کر دیا جائے گا۔ مگر..... نہیں..... میرے آقا..... آپ کو بیلہ کو بچانا ہے۔ آپ نے رابعہ..... اپنی زندگی کو بچانا ہے۔ مجھے علم ہے یہ جگہ چھوڑے ہی مجھے پکڑ لیا جائے گا اور موت کی نیند سلا دیا جائے گا مگر..... مگر میرے آقا میرا دل گواہی دے رہا ہے آپ زندہ رہیں گے..... آپ زندہ رہیں گے..... دیوتاؤں کا سایہ آپ کے سر پر ہے۔ آپ عورتوں کی عزتوں سے نہیں کھیلتے اسی لئے..... اسی لئے بوکاشی کے اتنے آدمی مارنے کے باوجود زندہ ہیں۔ میرے آقا..... برب دیوتا آپ سے بہت بڑا کام لینا چاہتے ہیں۔ ایسا کام جو آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ اچھا..... میں جا رہی ہوں آقا..... ان روتی آنکھوں کو بھول نہ جانا میرے آقا..... اس دل کی تڑپ کو یاد رکھنا میرے آقا..... وقت بہت کم ہے..... اس سے پہلے کہ رابعہ بوکاشی کی دلہن بن جائے اسے جا کر بچا لو..... اسے جا کر روک لو.....“ برستی آنکھوں سے پوباشے نے یہ الفاظ کہے ایک بھر پور نگاہ میری طرف اٹھائی اور ایک طرف کو دوڑتی چلی گئی۔

میرے وجود میں توڑ پھوڑ شروع ہو چکی تھی ایک خوفناک جنگ تھی جس کا آغاز ہو چکا تھا وہ آتش فشاں پھٹ چکا تھا جو نہیں پھٹنا چاہیے تھا وہ زہریلا لاوا ابھہ نکلا تھا جس میں اندیشوں کے سانپ

شاہنواز میری سب سے بڑی کمزوری ہے اور دولت شاہنواز کی کمزوری۔ میں شاہنواز کو یہ دولت دلانے کے لئے اس کے ساتھ آئی تھی۔ اس خزانے کی تلاش کے ساتھ میرے پیار کی کہانی جڑی ہوئی ہے اور اب میرے پیار کی کہانی کو ایک نیا موڑ ملنے والا ہے۔“

میں رابعہ کی بات کاٹ کر چیختے ہوئے بولا۔ ”رابعہ! میری بات غور سے سنو! بوکاشی دیوتا وہ سارا خزانہ حاصل کر کے اپنے محلات تعمیر کر چکا ہے اور اگر تمہارے شادی کرنے سے خزانہ شاہنواز کو مل بھی جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکو گی یہ شادی نہیں خودکشی ہے۔ بوکاشی کی دلہن بننے والی کی عمر صرف گیارہ ماہ ہوتی ہے اس کے بعد اس کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے اور اس کی کھوپڑی کاٹ کر چراغ جلا دیا جاتا ہے اور میں تمہیں یہ خودکشی نہیں کرنے دوں گا۔“

”علی نواز!.....“

”بکواس بند کرو اپنی..... تم یہ سب جھوٹ بول رہی ہو..... تم مجھے چاہتی ہو..... تمہارے دل میں میرا پیار ہے..... تم صرف میری ہواور میں اپنی زندگی کو کسی صورت موت کے منہ میں نہیں دھکیلوں گا۔“ میں ہذیبائی انداز میں چلا اٹھا۔

”علی نواز! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے.....؟“ رابعہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

”رابعہ!..... تم بوکاشی دیوتا سے شادی نہیں کرو گی..... تم کسی صورت بوکاشی دیوتا سے شادی نہیں کرو گی..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ میں چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک علیحدہ مجمع اکٹھا ہو گیا۔ لوگ حیرانگی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں گونجدار لہجے میں چیخ چیخ کر رابعہ کو یہ یاد کر رہا تھا کہ وہ کسی صورت بھی بوکاشی کی دلہن نہیں بنے گی۔ میں بوکاشی اور اس کے طلسم کی موجودگی سے بے خبر نہیں تھا مگر پتہ نہیں یہ کیسی خود فریبی تھی جو اس کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ میں نے لمبی تلوار کھینچ کر نیام میں سے باہر نکال لی تھی اور مجھے کو پڑے ہٹانے لگ گیا تھا۔ میں تلوار کو ہاتھ میں تولتے ہوئے رابعہ کے سامنے ہوا اور رابعہ سے فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”رابعہ! یہ تمہاری اور میری آخری اور فیصلہ کن بات چیت ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک میں نے جس لڑکی کے خواب دیکھے ہیں، جس کا عکس آنکھوں میں سجایا ہے، جس کی دھڑکنوں کو اپنے سینے پر محسوس کیا ہے اور جس کی چاہت دل میں سجا کر اور کچھ چاہا ہی نہیں ہے وہ لڑکی تم ہو..... رابعہ میری زندگی کے اٹھارہ سال تمہارے پیار کی نذر ہوئے ہیں۔ میں آج ان کر بناک لمحوں کا عوض تم سے مانگتا ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میرے لئے تھوڑی سی بھی محبت ہوگی۔ کسی کونے میں تھوڑا سا

احساس کا جذبہ چھپا ہوگا تو تم بوکاشی دیوتا سے شادی کرنے سے انکار کر دو گی اور اگر تم نے بوکاشی دیوتا سے شادی کر لی تو سمجھنا میں تمہارے لئے مر گیا۔ بچپن کی محبت نوجوانی کی دوستی سب کچھ ختم ہو گیا۔ تم سے بات تو کیا میں تمہاری طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھوں گا۔“

رابعہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں میں بھی جیسے بھونچال آیا ہوا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھا تو ایک اور چوٹ ماری، میں حلق کے بل چیخا۔ ”رابعہ! تم مجھ سے پیار کرتی ہو..... میرا دل گواہی دیتا ہے تم مجھ سے پیار کرتی ہو..... تمہیں میری قسم..... تم بوکاشی سے شادی سے انکار کر دینا..... وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ میں بات کرتا ہوا رابعہ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے بازو تھام لئے تھے۔ دفعتاً ایک زور کا دھکا لگا اور میں الٹ کر دور جا گرا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے بوگا لے اپنا مخصوص اعصا تھامے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ اوٹھے اور سامنے کے ٹوٹے دانتوں سے خلا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غم و غصے کی بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تو ایک وزنی پیر میرے سینے پر آ گیا۔ میری آنکھوں میں خونی دھندلاند آئی تھی۔ اس دھند کی اوٹ سے مجھے گوگی کا منہ چہرہ دکھائی دیا تھا۔ وہ میرے سر پر سوار تھا اور اس کا پیر میرے سینے پر تھا۔ گرتے وقت تلوار میرے ہاتھ سے چھوڑ کر دور جا گری تھی۔ میرے سینے میں قہر کے بادل گرے اور میں آنکھوں میں بھڑکتی آگ لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بوگا لے نے رابعہ کا بازو تھام رکھا تھا اور بے پناہ طیش کے عالم میں میری طرف دیکھ رہا تھا..... میں شاید پہلے بھی بتا چکا ہوں میرے لئے پانی سر سے گزر چکا تھا۔ میں ہر متوقع خطرے کی حد پھلانگ چکا تھا۔ بوگا لے، کالی فوج اور بوکاشی دیوتا میرے لئے سب برابر ہو چکے تھے۔ بوکاشی دیوتا کے طلسم کا خوف میں نے خود سے اتار کر پھینک دیا تھا۔

آگ میں چھلانگ لگائی تھی تو پھر موت سے ڈرنا کیسا تھا۔ میں نے اٹھتے ہی گوگی کا ایک وار بجا کر اسے دبوچ لیا تھا۔ اس دوران کالی فوج کے تین سپاہی بیک وقت مجھ سے بھڑ گئے تھے۔ میں نہتا تھا جب کہ میرے مد مقابل تلواریں سونتے ہوئے تھے۔ مجھے ایک تلوار کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس سارے مجمعے میں، میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بوکاشی کا طلسم ہر ذہن کو جکڑے ہوئے تھا۔ میں تلوار زونوں کے ساتھ ہاتھوں سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ پھر معاً ایک تلوار مجھے سے اچھلتی ہوئی میری جانب آئی جسے میں نے ہوا میں ہی دبوچ لیا۔ تلوار پھینکنے والے انکل ہیری کرس تھے۔ میں نے تلوار مضبوطی سے تھامی اور مد مقابل دشمنوں پر قیامت بن کے ٹوٹ پڑا۔ میری تلوار آسانی بجلی کی طرح

چمک رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے کالی فوج کے دو سپاہیوں کو موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ لڑتے ہوئے اچانک گوگی نے میرے پیچھے سے وار کیا۔ اس کا وار خالی گیا اور اس کی تلوار میرا دایا پہلو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ میں زخمی شیر کی طرح پلٹا اور ایک جھٹکے سے ممبئی کے ہندو غنڈے کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس دوران کالی فوج کے سپاہیوں کی ایک صف میرے مد مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ بوگالے طیش کے عالم میں آگے بڑھا۔ اس نے اپنا اعصاب میرے سر پر مارنا چاہا۔ کالی فوج کے سپاہیوں کی صف دیکھ کر وہ بہادر بننے چلا تھا۔ وہ سمجھتا تھا اتنی زیادہ فوج دیکھ کر میں ہمت ہار جاؤں گا اور ہتھیار پھینک دوں گا مگر میرے سینے میں جو آگ جلی تھی وہ بوکاشی دیوتا کی سلطنت کو خاستر کرنے سے پہلے بجھنے والی نہیں تھی۔ میں نے بوگالے کے اعصاب کا وار تلوار پر روکا اور پھر میری تلوار کا بھرپور وار بوگالے کے اعصاب پر اس طرح سے پڑا کہ اعصاب ہوا میں کئی فلا بازیاں کھاتا ہوا ایک کالی فوج کے سپاہی کے سینے سے پار ہو گیا۔ بوگالے کے حیران ہونے سے پہلے پہلے میں بوگالے کا دایا ہاتھ کلائی سے کاٹ چکا تھا۔ بوگالے بے پناہ حیرت لئے میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ اسی دوران کالی فوج کے سپاہیوں کی پوری صف مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔ میں خون سے رنگین تلوار لئے پیچھے ہٹا میری نگاہ مجھے میں دائیں طرف اٹھ آگئی۔ میں نے تلوار ہاتھ میں بلند کی اور مجھے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک زوردار لٹکارہ مارا اور جیسے ایک منٹ کے مختصر وقفے میں میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اتنے بڑے مجھے میں چار کے قریب سپاہی برآمد ہوئے۔ یہ بیلے کے کارندے اور بالی کے ساتھی تھے۔

آٹا فانا ایک خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ خونی تلواریں نکرانے لگیں اور لٹکارے بلند ہونے لگے۔ اسی دوران میں نے اس کشت و خون میں انکل بہری کرس کو داخل ہوتے دیکھا۔ انکل مدثر بھی ان کے پیچھے تھے۔ یکا یک میرا خون سیروں بڑھ گیا۔ چلتی تلوار میں اور بھی تیزی آگئی میرا خیال تھا بالی یہ منظر دیکھ کر اپنی پوری فوج کے ساتھ ہمارے ساتھ آ شامل ہو گا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یہ امید مایوسی میں ڈوب گئی۔ میرے ساتھ لڑنے والے وقفے وقفے سے کٹنے لگے۔ میری مایوس نگاہوں نے انکل بہری کرس کے سینے میں تلوار اترتی دیکھی۔ وہ محبوب چہرہ میری آنکھوں کے سامنے خون میں نہا گیا۔ میں نے اپنے بوڑھے انکل مدثر کا بازو کٹتے دیکھا۔ ان کے کمزور وجود کو زمین پر لوٹنے دیکھا۔ میرے سینے میں پہاڑ جتنا دل نہیں تھا میرا وجود ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں ڈولتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور انکل بہری کے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انکل بہری کا چہرہ بالکل پرسکون تھا۔ آنکھوں پے لگا چشمہ ہنوز برقرار تھا۔ ساری عمر جنگوں کی خاک چھاننے والا خونی

درندوں کے پیچھے بھاگنے والا جنگجو شکاری دلیرانہ موت مر چکا تھا۔ میں نے انکل مدثر کا بازو کاٹنے والے جنگلی کی ٹانگ بھی گھٹنے کے پاس سے کاٹ ڈالی تھی۔ مجھے آج سب کو مار ڈالنا تھا یا خود مر جانا تھا۔ تیسرا سہ آج میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ سارے مجھے کا رخ میری طرف ہو چکا تھا۔ بوکاشی دیوتا اپنے محل میں جا چکا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو مجھے زندہ پکڑ کر لانے کا حکم دیا تھا۔ جب تک مجھ سے تلوار چلتی رہی میں چلاتا رہا اور طیش کے عالم میں چیخ و پکار کرتا رہا۔ آخر کالی فوج کے جنگجوؤں کی ایک بڑی ٹولی نے مجھے دبوچ لیا، ان کی پکڑ میں جانے سے پہلے پہلے میں نے دونوں جیوں کو جہنم واصل کر دیا۔ مجھے اتنا لوہا پہنایا گیا کہ میری گردن جھک گئی۔ مجھے گھینٹے ہوئے بوکاشی دیوتا کے رو برو پہنچا دیا گیا۔ میں بوکاشی کے قدموں میں گرا ہوا تھا اور وہ اونچی مسند پر بیٹھا جادوئی خونخوار آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آہن میں غرق تھا۔ صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو پورے جسم میں سے نظر آتی تھیں۔ کتنے لمحے قیامت کی سی خاموشی کے گزر گئے پھر بوکاشی کی بے چین کر دینے والی بڑاسرار آواز گونجی۔

”اے بوکاشی دیوتا کے باغی! تو کیا سمجھتا تھا جو کچھ تو کر رہا ہے اس کی ہمیں کچھ خبر نہیں۔ ہم نے تمہیں پہلے دن بتا دیا تھا کہ ہم انسان کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ انسان کی سوچوں پے ہمارے طلسم کا چہرہ ہے۔ تو یہ سب کچھ جانتا تھا پھر تو نے ایسا کیوں کیا؟ یاد رکھ اے باغی سپاہی تیری ہر سوچ ہر حرکت ہماری نظر میں تھی۔ ہم تمہیں ہمیشہ معاف کرتے چلے آئے مگر اب مہلت ختم ہو چکی ہے۔ ہم تمہاری وہ حالت بنائیں گے کہ دیوتاؤں کے من بھی کانپ جائیں گے۔“

میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ طرف کا پیالا چھٹک گیا اور میں حلق کے بل چیختا چلا گیا میرے منہ میں جو کچھ آیا کہتا چلا گیا۔ ”بوکاشی دیوتا..... تو دیوتا نہیں ہے گھوڑوں کے فضلے میں ریگنے والا گندا کیڑا ہے۔ تو میری بہن رینا کے قتل کا ذمہ دار ہے۔ میں تیری لاش کی ایسی حالت کروں گا کہ یہ دھرتی بھی تجھ جیسے غلیظ ناپاک وجود سے پناہ مانگے گی۔ بوکاشی! اس معصوم لڑکی سے اپنی گندی نگاہیں ہٹالے۔ یاد رکھ اگر تو نے اس سے شادی کی تو، تو مارا جائے گا۔ تیری لاش اس وادی کی گلیوں میں گھسیٹی جائے گی۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔“ بوکاشی طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور جیسے قیامت مجھ پر پوٹ پڑی۔ معلوم نہیں کہاں سے ڈھیروں ابلتا ہوا پانی مجھ پر آ پڑا۔ وہ بوکاشی کے طلسم کا کمال تھا یا اور کچھ تھا میرا تمام وجود جھلس کے رہ گیا۔ جلن کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی اور



مجھ پر جیسے غشی طاری ہوگئی۔

دنیا کی بدترین مسکراہٹیں تھیں۔ میں نے اپنی نگاہوں کے سامنے بہت سے لوگوں کو مرتے دیکھا تھا۔ موت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا حقیقت میں موت کا سامنا کرنا کیسا ہوتا ہے؟ میں نہیں جانتا تھا۔ میرے جسم کے ہر روئیں سے پسینہ دھاروں کی صورت بہہ نکلا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جسم سے کوئی چیز نکل گئی ہے کم ہوگئی ہے۔ کسی چیز کے وجود سے چھن جانے کا احساس بڑا بھیانک تھا۔ میں نے پاؤں کی طرف نگاہ دوڑائی تو ایک طرف سے ڈھکن کھلا اور نیا مخلول زوف مرتبان کے اندر داخل ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جتنی سورتیں مجھے یاد تھیں ان سب کا ورد شروع کر دیا۔ ایک منٹ گزرا دو منٹ گزرے پھر پانچ منٹ گزر گئے پاؤں کو کسی چھین کا احساس نہیں ہوا۔ میرا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ جسم سے بہنے والے پسینے نے پاؤں کو بھگو دیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ زوف کا سلسلہ اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا ڈھکن بند ہو چکا تھا۔

کالی فوج کے سپاہی قہقہے لگا رہے تھے اور ہاتھ لہرا لہرا کر میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ جلد ہی مجھے مرتبان سے باہر نکال لیا گیا۔ بوکاشی دیوتا اپنی مخصوص آواز میں بولا۔ ”تو نے اس دھرتی کے چین و سکون کو تباہ کر دیا ہے، تو نے وہ کام کیا جو یہاں کوئی سوچنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا۔ تجھے موت اتنی جلدی نہیں ملے گی۔ میرے جسم کے ایک ایک حصے سے موت کو کشید کیا جائے گا۔ یہ دھرتی تیرے لئے اتنی خشک کر دی جائے گی کہ کہ تو میرے قدموں میں گر کے اپنی موت کیلئے بھیک مانگے گا مگر تجھے بھیک نہیں ملے گی۔“

میں زخموں سے چور خاموش نگاہوں سے بوکاشی کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں ایک آگ دہک رہی تھی۔ مجھ سے دو قدموں کی دوری پر بیٹھا شخص میری گڑیاسی بہن رینا کا قاتل تھا اور میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک رینا کے قتل کے ذمہ داروں کو کتے کی موت نہ مار دوں چین سے نہیں بیٹھوں گا، مگر رینا کے تمام قاتل ابھی زندہ تھے اور میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ میری تباہی و بربادی کے دن شاید شروع ہو چکے تھے۔ پتہ نہیں وہ میری کون سی بد قسمتی تھی جو مجھے اس منہ پر اسرار وادی میں کھینچ لائی تھی۔ مجھ پر مظالم کے پہاڑ ڈھادیے گئے۔ میرے جسم کے ریشے ریشے کو اذیت کی بے رحم آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ طلوع ہونے والا ہر نیا دن میرے لئے مصیبتوں میں اضافہ لئے ہوئے نکلتا۔ چند دن بعد ہی میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں بچا جس پر بوکاشی کے ظلم کے نشان نہ ہوں۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی میری رہی سہی مزاحمت بھی بالکل دم توڑ گئی تو ایک دن میرے نیم جان ”لاشے“ کو کوچ میدان میں رکھ دیا گیا۔ کسی کو میرے پاس جانے کی

وہ بڑے ہی کرہناک مناظر تھے۔ میں سو رہا تھا یا شاید جاگ رہا تھا مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ میرے سامنے ششے کا ایک لمبا مرتبان تھا ایسا مرتبان میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ مرتبان خالی نہیں تھا اس مرتبان میں پوباشے برہنہ حالت میں کھڑی تھی۔ صرف کھڑی نہیں تھی بلکہ اچھل کود کر رہی تھی اور پاس کھڑے کالی فوج کے سپاہیوں کے قہقہے اور بوکاشی دیوتا کے قہقہے آپس میں مدغم ہو رہے تھے۔ زہر ناک مخلول زوف پوباشے کے پیروں کو بوسہ دے چکا تھا۔ وہ اچھل کر خود کو اس مخلول سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی مگر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتی۔ اس کی مدہم چھین مرتبان سے باہر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ رینا کی موت کے بعد یہ منظر میرے لئے سب سے کرہناک تھا۔ وہ انکل ہیری کرس جیسی فوری آرام دہ موت نہیں تھی وہ لمحہ بہ لمحہ سرکتی خون چاٹتی اذیت ناک موت تھی۔ ایسا کرب پانے والے کے بس میں ہوتا وہ فوری موت کو گلے لگا لگے۔ پوباشے سر تا پا پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ منظر میری آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ پھول سی مسکراہٹ والا چہرہ جو ہزار ہا شدتوں کے ساتھ خاموشی سے مجھے چاہتا تھا اس لمحے موت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ آنکھیں ہوا اپنے گندہ باپ کو ڈھونڈنے نکلیں تھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ پوباشے کے بعد سردار روبان کی باری آئی۔ سردار روبان میرے ساتھ کالی فوج کے خلاف لڑتا ہوا شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے سے کٹ گیا تھا اب وہ ایک بازو کے ساتھ مرتبان میں کھڑا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں پھوٹ پھوٹ کے رو دوں مگر یہ کام بھی اب مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا رو رو کر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ بس ایک نیلگوں گولا تھا جو بیٹ میں گھوم رہا تھا۔ سردار روبان کی آخری ہچکی بھی آخر دم توڑ گئی۔ مجھے سردار کہنے والا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مجھے ایک لمبا غش آیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں مرتبان میں قید ہو چکا تھا۔ ڈھکن بند ہو چکا تھا اور موت کے سامنے لمحہ بہ لمحہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اس جنگل میں جب سے داخل ہوا تھا ایک سے بڑھ کر ایک خوفناک وقت مجھ پر گزرا تھا مگر جو لمحے میں اس وقت گزار رہا تھا وہ ہزار موتوں سے بھاری تھے۔ انکل ہیری مارے جا چکے تھے۔ انکل مدثر کا بازو کٹ چکا تھا۔ ان کا کچھ پتہ نہیں تھا وہ اس دنیا میں رہے بھی تھے یا نہیں..... رابعہ کی کچھ خبر نہیں تھی..... اور اب میں اس لمحے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ مرتبان سے باہر بوکاشی دیوتا کا منہ جس مجھے نظر آ رہا تھا۔ کالی فوج کے سپاہیوں کی مسکراہٹیں دکھ رہی تھیں وہ

اجازت نہیں تھی۔ میں بھوک اور پیاس سے تڑپتا رہا لیکن کوئی میرے قریب نہیں آیا۔ اگر کوئی جاندار میرے قریب آیا تو وہ راج گدھ تھے جو میرا بولہبان جسم نوچنے آئے تھے۔ کوئی گدھ میرے زخم پر لمبی چونچ مارتا تو ”بے جان“ وجود میں یکدم سے حرکت پیدا ہوتی۔ میں زندگی اور موت کے درمیان سفر کر کے شل ہو چکا تھا۔ میرے دل سے صرف ایک ہی دعا نکلتی تھی۔

”اے میرے خدا! مجھے موت دے دے۔ مجھے اپنے پاس بلا لے، تیری ہی پیدا کی ہوئی مخلوق نے مجھ پر مظالم کی انتہا کر دی۔“ مگر شاید رب کریم کو ابھی اور آزمائش منظور تھی۔ ایک دن میرے وجود کو اٹھا کر کل کے مہمان خانے میں لے جایا گیا۔ وہاں میرے سامنے کھانا ڈال دیا گیا۔ وہ کسی جنگلی پھل سے بنا ہوا سوپ سا تھا۔

ایک ہٹا کٹنا کالی فوج کا سپاہی میرے پاس کھڑا مجھے سوپ پلا رہا تھا اور میں پیاس سے اونٹ کی طرح غناغٹ وہ سوپ پئے جارہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا سوپ کا دریا بھی ہو تو میں پی جاؤں گا۔ پتہ نہیں ان لوگوں کو مجھ پر رحم کس وجہ سے آیا تھا۔ کئی دن بعد پانی اندر گیا تو جیسے جسم کا گوشہ گوشہ سیراب ہو گیا، مگر میں یہ بھلا بیٹھا تھا یہ بوکاشی دیوتا کی ظالم وادی ہے۔ یہاں کے قیدی سے صرف اذیت کی زبان بولی جاتی ہے۔ میں جب سوپ سے خوب سیراب ہو گیا تو مجھے بوکاشی دیوتا کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ اونچی مسند پر بیٹھا تھا۔ وہ میرا دشمن عظیم تھا۔ اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی میں اس سے انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ وہ جتنا میرے قریب تھا اتنا ہی زیادہ دور تھا۔ میرے اور اس کے درمیان طلسم کے ہزاروں پردے حائل تھے۔ بوکاشی کی پراسرار آواز گونجی۔

”تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ یہاں کے باسی ہمارے بارے میں غلط سوچ ذہن میں کیوں نہیں رکھتے؟ کیوں ہمارے لئے دلوں میں نیک جذبات رکھتے ہیں۔“ اتنی بات کر کے بوکاشی طنزیہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا میں آگے سے کچھ بولوں گا مگر میں خاموش رہا ایک نیلگوں آگ اپنے اندر اٹھیل رہا۔

”لگتا ہے دیوتاؤں کو تم پر رحم آگیا ہے۔“ بوکاشی نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”اب اسی عذاب سے تمہاری خلاصی ہونے والی ہے مگر مرنے سے پہلے یہ بات یاد رکھنا دیوتاؤں کی جس سرزمین پر تم جاؤ گے وہاں کبھی دیوتاؤں کی نافرمانی نہ کرنا۔“ بوکاشی نے اتنی بات کہی اور پردے کے پار غائب ہو گیا۔ کالی فوج کے سپاہی مجھے گھینٹے ہوئے زمین دوز غاروں کی طرف لے جانے لگے۔ میں کالی فوج کی ہر کالی میں اس غلیظ ترین تالاب کے قریب سے بھی گزرا جس میں دنیا جہاں کی غلاظتیں تیر رہی

نہیں اور جو تالاب بوکاشی دیوتا کے جاپ کرنے کی جگہ بھی تھی، اس تالاب کے اوپر انسانی سر لٹک رہے تھے اور اس تالاب سے پرے بھیڑا کے مجسے آویزاں تھے۔ پتھر کے وہ چہرے بوکاشی دیوتا کے ظلم و بربریت کے نشان تھے اور شاید چند دنوں بعد ان پتھر کے مجسوں میں ایک چہرہ میرا بھی ہونا تھا۔ ان مجسوں کے اوپر ایک جگہ چھوٹا سا روزن تھا جہاں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ سورج کی یہ آخری روشنی تھی جو میری آنکھوں میں جذب ہوئی تھی۔ میرے شکستہ و ریختہ جسم کو گھینٹے ہوئے آخر کار موت کے اس قید خانے کی طرف لے جایا گیا جس کا نام سن کر بڑے بڑے سورماؤں کی بھی گھگی بندھ جاتی تھی۔ وہی زمین دوز قید خانہ جس میں آدمی کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا جاتا تھا۔ کالی فوج کے سپاہی مجھے اس نیم اندھیرے قید خانے میں پھینک کر جب واپس جانے لگے تو مجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر میں کسی کا دامن تھام لیتا، کسی کا ہاتھ پکڑ لیتا۔

کالی فوج کے سپاہی چلے گئے ان سپاہیوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پتھر لڑھکنے کی منحوس آواز سنائی دی اور میں ہمیشہ کیلئے زمین میں زندہ دفن ہو گیا۔ وہ آٹھ فٹ مربع کا کمر تھا۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ میں اس میں کھڑا ہونا چاہتا تو بمشکل کھڑا ہو پاتا۔ میرے دائیں بائیں اوپر نیچے موت کی دیواریں تھیں کوئی چھوٹا سا روزن یا سوراخ نہیں تھا جہاں سے روشنی اندر آتی ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ سر کے اوپر چھت اگر ابھی تھوڑی دیر میں نہ ہوتی، میں نے نیلے امبر کا نظارہ دیکھا تو میری آنکھیں باہر کو ابل پڑیں گی زبان لٹک جائے گی اور میں اذیت ناک موت سے دوچار ہو جاؤں گا۔

ابھی ایک مصیبت کا حل نظر نہیں آیا تھا کہ دوسری اور بڑی مصیبت نے مجھے آگھیرا۔ پیاس کی شدت سے میرے حلق میں کانٹوں بھرا گولا پھنس گیا۔ اتنی شدید پیاس نے میرا گھیراؤ کیا کہ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ مجھے اب سمجھ آئی تھی کہ یہاں لانے سے پہلے میری اس عجیب و غریب سوپ سے تواضع کیوں کی گئی تھی۔ اس سوپ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے میرا حلق چھیل کے کھ دیا تھا۔ پیاس کو اس قدر بڑھا دیا تھا کہ دریا بھی ہوتا تو میں پی جاتا۔ مگر میرے ہمدردوں نے برے ساتھ بھلائی یہ کی تھی کہ پانی کی جگہ زوف کے دو ڈرم اس قبر میں رکھ دیئے تھے یہ دو ڈرم جن میں ایک چھوٹا جبکہ دوسرا نسبتاً بڑا تھا کو زوف سے لبالب بھر دیا گیا تھا۔ میں تقریباً ریگستا ہوا ان دو رموں کے پاس پہنچا۔ میرے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور حلق میں جیسے کسی نے دھکتے ہوئے کوئلے لکھ دیئے تھے۔ میرے ہونٹ پانی کے ایک گھونٹ کو ترس رہے تھے۔ میری زبان میرا حلق کسی تر چیز

لس اور پھر سے خود کو تیار کرنے لگا۔ جو کچھ سوچنا تھا میں نے سوچ لیا تھا جو کچھ پڑھنا تھا میں نے پڑھ لیا تھا۔ اب دوبارہ میں نے آنکھیں بند کرنا تھیں اور پھر نہیں کھولنا تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے اچانک میری آنکھوں میں ریت کے ذرے سے چھپنے لگے۔ ”اے میرے مالک..... میرے مولا..... یہ ساری کائنات تیری ہے یہاں کی ایک ایک چیز پے تیرا حکم چلتا ہے۔ درخت کے پتے کی حرکت تیری نظر سے اوجھل نہیں۔ کسی انسان کو تو نے غیب کا علم نہیں دیا تو جسے چاہے اس سے نوازتا ہے۔ پھر یہ ظالم انسان تو نے اپنے بندوں پر کیسا مسلط کر دیا ہے جو لوگوں کی سوچ پر بھی پہرے لگا دیتا ہے۔ اے میرے مالک کوئی اور دروازہ نہیں جس سے مدد ملے تو ہی سب کچھ ہے اور میں تیرے اس نبی کے مدد سے تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں جو میں کرنے لگا ہوں وہ حرام موت ہے مگر میں کیا کروں..... کہاں جاؤں.....“ دل میں گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور آنکھوں سے زار و زار آنسو جاری ہو گئے۔ پتہ نہیں یہ کیسے آنسو تھے جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اچانک ایک سوچ دل میں سائی اور میں نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر آنکھوں کے نیچے کر لیا آنسو گر رہے تھے اور ہاتھوں کو تر کر رہے تھے پہلے میں نے آنسوؤں سے اپنے ہونٹ تر کئے پھر کچھ آنسو حلق میں اٹھ لے لیے میں پیاس کی شدت کم کرنے کیلئے چھوڑنا نہیں چھوڑتا اپنے آنسو پی رہا تھا۔ میری سوچ ایک دم ہی بدل گئی تھی یا یہ اس دعا کر کر شہہ تھا جو میں نے ابھی مانگی تھی۔ میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ میں حرام موت کو گلے نہیں لگاؤں گا جہاں تک ہو سکا زندگی کی جنگ لڑوں گا پھر بھی موت ملی تو ہنسی خوشی گلے لگاؤں گا۔ مارشل آرٹ کی ٹریننگ میں یہ چیز شامل تھی کہ دوزانو بیٹھ کر آنکھیں اور سانس بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا ہے۔ میں یہاں دوزانو بیٹھ تو نہیں سکتا تھا بہر حال لیٹے لیٹے میں نے یہ عمل دوہرایا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی سوچ کو سلا کر بے خبری کے پاتال میں پھینک دیا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور دنیا سے جیسے میرا رابطہ کٹ گیا۔ یہ شاید دوسرے دن کی بات تھی۔ میری رہی سہی قوت بھی جواب دے گئی تھی۔ نگاہوں کو حرکت دیتے ہوئے بھی مشکل پیش آتی تھی۔ یوں لگتا تھا میری خدا کے حضور کی ہوئی دعا قبول ہی ہونے والی ہے۔ موت کا فرشتہ مجھے لے جانے کیلئے آنے ہی والا ہے مگر شاید اوپر کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ میری زندگی چند روز کیلئے اور بڑھ گئی تھی اسی روز شام کے وقت گڑگڑاہٹ سنائی دی اور موت کے پہرے ہٹ گئے۔ پھر ہٹا لیا گیا اور کالی فوج کے سپاہی مجھے اٹھانے کیلئے آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا چلو بوکاشی دیوتا کے حضور تیری حاضری ہے۔ بہت جلد میں بوکاشی کے قدموں میں پڑا ہوا تھا اور بوکاشی کہہ رہا تھا۔ ”تم کیا سمجھتے تھے ہم تجھے اتنی آسان موت مار

سے آشنا ہونا چاہتا تھا پانی..... پانی..... مگر پانی آج میرے لئے کہیں نہیں تھا۔ اس روئے زمین کا تین چوتھا ہی حصہ پانی پر محیط تھا مگر میرے لئے یہ عظیم نعمت ناپید ہو چکی تھی۔ میں اس مچھلی کی طرح تڑپنے لگا جسے کھلے سمندر سے نکال کر بے آب و گیاہ صحرا میں پھینک دیا گیا ہو۔ میں دیوار کے سہارے سے اٹھ کر بیٹھا تو ڈرموں میں موجود اذیت ناک موت مجھے نظر آ گئی۔ وہ خطرناک محلول زوف تھا جو انسانی گوشت کو چاٹ جاتا تھا۔ میرے میزبانوں نے میرے پینے کیلئے اس محلول کا انتظام کیا تھا۔ زمین دوز تہہ خانے میں رہنے کی اذیت معدوم ہو گئی تھی اور پیاس کی شدت ہر تکلیف پر حاوی ہو گئی تھی۔ چند ہی منٹوں میں میری حالت ایسی ہو گئی کہ میں زوف کو پینے کا سوچنے لگا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا زوف پینے کے بعد میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میری زبان میرا حلق میری انتڑیوں کا ملغوبہ بن کر میرے معدے میں گر جاتا تھا اور مجھے شدید ترین اذیت ناک موت سے دوچار ہو جانا تھا۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میرے ہاتھ زوف کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آخری وقت پر میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور زمین پر لیٹ کر تڑپنے لگا۔ یہ ایسی دردناک اور بیت ناک قید تھی جس سے موت بہت بہتر تھی۔ میں گھٹنے پیٹنے سے لگا کر تڑپ رہا تھا اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا۔ ایسا تقریباً ایک گھنٹہ رہا اس ایک گھنٹے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔ میں زہرناک محلول زوف پینے کے لئے بالکل سنجیدگی سے تیار ہو گیا۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لمحہ لمحہ اذیت ناک موت سے بہتر تھا میں ایک دفعہ ہی موت کو گلے لگا لوں۔ میں اس نتیجے پر ایک دم نہیں پہنچا تھا میں نے پورا ایک گھنٹہ ہر پہلو پر غور کیا تھا، تب جا کر یہ انتہائی قدم اٹھانے پر میں تیار ہوا تھا۔ میں سہارا لے کر پہلو کے بل زوف میں جھک گیا۔ ایک وقت تھا جب بوگا لے میرا چہرہ اس میں ڈبو کے مسخ کر دینا چاہتا تھا آج کیا عجیب وقت آن پڑا تھا کہ میں خود اپنا آپ اس محلول میں ڈبو رہا تھا۔ میں سوکھے ہونٹوں پے خشک زبان پھیر کر سوچنے لگا موت کا کون سا طریقہ زیادہ آسان اور فوری رہے گا۔ اگر میں زوف کو پینا تو فوری موت یقینی نہیں تھی اگر اپنا سر اس میں بہت تیزی سے ڈبو دیتا تو یہ طریقہ آسان تھا۔ آخر کار میں نے اسی طریقے پے عمل کرنے میں عافیت جانی۔ میں نے ڈرم کے کناروں کو بہت مضبوطی سے پکڑ لیا اور خود کو ڈھنی طور پر تیار کرنے لگا۔ میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کیں ہونٹوں کو بھیچا سر کو تیزی سے زوف کی طرف لے کر گیا مگر پھر رک گیا۔ میں نے آنکھیں کھول

دیوتا کے عتاب سے بچ بھی جاتے تو تمہیں ختم کرنے کا پورا پورا پروگرام بن چکا تھا۔ جلی گوریلوں کے ساتھ ہونے والی لڑائی میں تم ہماری تلواروں سے مارے جاتے اور نام جلی گوریلوں کا آتا۔ خیر اچھا ہوا ہم کو تمہاری ایسی حالت دیکھنے کو مل گئی۔“

اچانک شاہنواز بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور مجھ پر جھکتے ہوئے بولا۔ ”اتنی زیادہ خوشخبریوں میں ایک خوشخبری سنا تو ہم تمہیں بھول ہی گئے۔۔۔۔۔ مسرعلی نواز خاں! تم سمجھتے تھے ناں کہ رابعہ تم سے پیار کرتی ہے بلکہ تمہیں شاید شدید قسم کی غلط فہمی تھی۔ میں وہ غلط فہمی دور کرنے کیلئے آیا ہوں۔ رابعہ کبھی بھی تمہاری نہیں تھی۔ رابعہ ہمیشہ سے میری تھی اور میری رہے گی کیونکہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور میں اس کے بغیر۔ جس مقصد کیلئے ہم یہاں آئے تھے وہ پورا ہو چکا ہے۔ تم نے تو رابعہ کو اپنی قسم دی تھی اور اتنی کڑی شرط رکھی تھی کہ وہ بوکاشی سے ہرگز شادی نہیں کرے گی، مگر میرے دوست تم بہت بھولے ہو اتنا کچھ بیت جانے کے باوجود نہیں جان پائے کہ میں رابعہ کیلئے کتنا اہم ہوں۔ رابعہ میرے کہنے پر بوکاشی دیوتا سے شادی کر چکی ہے۔ وہ میرے پیار کے لئے ہر قدم اٹھانے کیلئے تیار ہے۔ اب وہ دن دور نہیں جب خزانہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔“

شاہنواز چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہا تھا اور میرے دماغ کے ایوانوں میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ برسوں کی تنکیاں لگا ہوں میں رقص کر رہی تھیں۔ زمانوں کے بے تہمت لمحے وجود کو چھلنی چھلنی کر رہے تھے۔ رابعہ میری بچپن کی بھولی تھی۔ ان گنت دن ہمارے اکٹھے گزرے تھے۔ کتنی ہی دوپہریں تھیں جن میں ہم لوگ کھیلتے کھیلتے غڈ ہال ہوئے تھے۔ برسوں پرانی وہ حسین ترین دوپہریں آج بھی وقت کے ماتھے پر نقش تھیں۔ وقت میرے لئے ٹھہرا ہوا تھا رابعہ میرے لئے آج بھی وہی معصوم سی گہری آنکھوں والی بچی تھی۔ میں نے اپنی اس دوست کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا تھا میں نے اس کی محبت میں اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کی جدائی مول لی تھی۔ میں اپنی گزری زندگی کے گم گشتہ لمحوں کی تلاش میں نکلا تھا، میں ان خوشبودار لمحوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا تھا مگر بڑی زوردار چوٹ پڑی تھی اور سب کچھ چکنا چور ہو گیا تھا سنہری دوپہر کا خاموش سہانا منظر جس میں جاسن کی چھاؤں میں کوئل کوکتی تھی۔ چڑیاں گنگنا تی تھیں ہماری ان سنی بولیاں گونجتی تھیں سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ نفرت کی کالی آندھی نے سارے منظر کو خس و خاشاک کی طرح بکھیر کے رکھ دیا تھا۔ وہ رابعہ جس کا نام میری ہر ہر دھڑکن پر لکھا ہوا تھا وہ پرانی ہو چکی تھی میں جس پستی میں گرا ہوا تھا اس کی ذمہ دار رابعہ تھی۔ میں رابعہ کو بچانے کیلئے خود موت کے منہ میں چلا گیا تھا مگر ہوا وہی تھا جو شاہنواز نے کہا تھا۔

دیں گے۔ نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ابھی تمہارے شریر کو اور بہت دکھ جھیلنے ہیں۔ ابھی ہماری بہت سے سزائیں تمہاری منتظر ہیں۔“

بوکاشی کے حکم پر میرے جسم پر گرم پانی انڈیل دیا گیا تمام جسم پر آبلے نمودار ہو گئے، بوکاشی قہقہہ مار کر بولا۔ ”فکر مت کرو تم ابھی مرو گے نہیں تم بس اب اس وادی کی گلیوں میں گندے کیڑے کی طرح ریگو گے تم نے ہمیں گھوڑے کی لید کا کیڑا کہا تھا ناں۔۔۔۔۔ اب دیکھو ہم تمہیں اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر بنا دیں گے۔“

بوکاشی دیوتا کے حکم پر مجھے بستی میں پھینکوا دیا گیا۔ میرا سارا جسم آبلوں کی زد میں تھا۔ نقاہت عروج پر تھی، میں گلی میں گھسٹا ہوا کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔ کچھ لوگ مجھے دیکھ کر قہقہے لگاتے فقرے چست کرتے اور کچھ لوگ افسوس کا اظہار کرتے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتا یا کھانے پینے کیلئے کچھ دیتا۔ میں کوڑا کرکٹ میں سے چیزیں تلاش کر کے کھاتا اور پھر زمین پر ریگتے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔

مجھے بستی کی گلیوں میں ریگتے ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ اس دوران میرا کرا شاہنواز اور جم کیٹی سے بھی ہوا تھا۔ ان دونوں کا رویہ بھی ان لوگوں جیسا تھا جو مجھ کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے تھے یا طنزیہ جملے چست کرتے تھے۔ شاہنواز یا جم کیٹی کے رویے کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا کیونکہ میں اس اسٹیج پر نہیں تھا جہاں کسی کی نفرت یا محبت اثر انداز ہوتی ہے۔ میری روح جیسے آسمان پر پرواز کر چکی تھی اور شکستہ حال جسم زمین پر ریگ رہا تھا۔ میرا احساس مر چکا تھا مگر ایک دن اس ”احساس“ پر اتنی گہری چوٹ پڑی کہ وجود کٹ کے رہ گیا۔

میں نیم جان سانبستی کے چوراہے پر اوندھاپڑا تھا بستی کے لڑکے بالے دور کھڑے مجھ ناچیز پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میرے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور چہرہ مٹی سے اٹا ہوا تھا اچانک کسی نے مجھے سیدھا کر دیا اور پھر ساتھ ہی قہقہوں کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے نگاہیں سکیڑ کے دیکھا تو وہاں شاہنواز جم کیٹی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان کا قہقہہ میرا منی سے اٹا ہوا منہ دیکھ کر بلند ہوا تھا۔ شاہنواز چیخ۔۔۔۔۔ چیخ کی آواز نکالتا ہوا میرے قریب بیٹھ گیا اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”بے چارے کی کیا حالت ہو گئی۔“

جم کیٹی بولا۔ ”اس کی ایسی حالت بوکاشی دیوتا نہ بناتا تو ہم بنا دیتے۔“ جم کیٹی کی اس بات پر بھرپور قہقہہ بلند ہوا۔ جم کیٹی میرے گریبان کو انگوٹھے اور انگلی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم بوکاشی

رابعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی سے نکل چکی تھی اس نے بوکاشی دیوتا سے شادی کر لی تھی۔

وہ رات میرے آنسو بہانے کی آخری رات تھی، جتنا میں رو سکتا تھا رو لیا۔ میرے آنسو خشک ہو گئے میرا دل پتھر ہو گیا۔ ساری رات بیت گئی۔ دن چڑھا اور وہ بھی بیت گیا۔ سیاہ رات پھر چھا گئی۔ میں کپڑوں کی اک بوسیدہ کٹھڑی کی صورت بستی کے چوراہے میں پڑا رہتا تھا میرے قریب سے گزرنے والے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے اور کہتے تھے اس پر بوکاشی دیوتا کا عذاب نازل ہوا ہے۔ اس نے بوکاشی دیوتا کی شان میں گستاخی کی تھی۔ شب و روز کی چکی چلتی رہی۔ وقت کا بے رحم پہرہ گھومتا رہا، کوڑا کرکٹ میں سے جو بچا کچھا ہوتا وہ کھا کر میں جسم سے زندگی کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ پتہ نہیں وہ کونسا جذبہ تھا جو مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک دن میں یوں ہی زندہ لاشے کی مانند پہلو کے بل پڑا ہوا تھا کہ ایک چھکڑا میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ چھکڑے میں سے ایک تو منہ جھٹی نکلا اور اس نے چھکڑے کے آگے جتے گھوڑے کھول دیئے۔ وہ چھکڑے کو گھسیٹتا ہوا میرے قریب لے آیا پھر اس نے چھکڑے کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور بانس اوپر اٹھا دیئے۔ خدا کی پناہ بے پناہ بدبو کا احساس میرے نچھو میں جاگا اور دوسرے ہی لمحے گھوڑوں کی لید سے بھرا ہوا چھکڑے کا پہاڑ میرے اوپر آ رہا۔ میں اس غلاظت میں بالکل غائب ہو گیا ہاتھ مار کے بمشکل میں نے سانس کی آمد و رفت کیلئے جگہ بنائی۔ پہلی آواز جو میری سماعت سے ٹکرائی چھکڑا بان کی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ”بوکاشی دیوتا کی شان میں گستاخی کرنے والے گندے کیڑے، دیکھ آج تولید میں ریگنے والا جانور بنا ہوا ہے۔“ حبشی خاموش ہوا تو ہر طرف قہقہوں کا طوفان برپا ہو گیا۔ میں نے دیکھا مجھ سے چند گز دور لیٹنا زو با سار بھی اٹھ کر ناچنے لگا اور قہقہے مارتے ہوئے الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں اس غلاظت سے باہر آ سکتا میں چار پہر اس غلاظت میں پڑا رہا۔

وہ شاید شام کا پہر تھا جب کسی نے مجھے ایک ہاتھ سے پکڑ کر لید سے باہر نکال لیا۔ میں نے ذوقی نگاہ سے دیکھا تو وہ انکل مدثر تھے۔ ان کا ایک بازو کندھے کے پاس سے غائب تھا وہ برسوں کے بیمار نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ انہوں نے مجھے صاف کیا اور میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر نہایت شکستہ لہجے میں کہنے لگے۔ ”میرے بیٹے! تیری یہ حالت صرف میری وجہ سے ہوئی ہے نہ میں تمہیں پاکستان سے بلاتا نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ مجھے معاف کر دینا میرے بیٹے۔“ مجھے معاف کر دینا۔ رابعہ نے شاہنواز کے کہنے پر بوکاشی دیوتا سے شادی کر لی ہے۔ شاہنواز کے ساتھ

ساتھ وہ بھی خزانے کے پیچھے دیوانی ہو گئی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے مگر وہ میری بات سنتی ہی کب ہے۔“

انکل مدثر بہت دیر بیٹھے میری دلجوئی کرتے ہوئے روتے رہے اور غم کے آنسو بہاتے رہے۔ وہ ایسا بد نصیب باپ تھا جو ہزار کوششوں کے باوجود اپنی بیٹی کو نہیں پاسکا تھا۔ اس بوڑھے شخص نے اپنی اکلوتی اولاد اپنی چاندی لڑکی کیلئے کیمبرو کے جنگل میں درود کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اس نے جم کینٹی اور شاہنواز جیسے بندوں کی ”غلامی“ اختیار کی تھی۔ وہ اپنا بازو کوٹا بیٹھا تھا وہ اپنی بیٹی کوٹا بیٹھا تھا اور اب میرا سر اپنی گود میں رکھے بلک بلک کر رو رہا تھا مگر میری آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ آنکھوں کے آنسو ناپید ہو چکے تھے اک بے نام جلن تھی جو نگاہوں کے پس منظر میں چھپی تھی بے قرار کرتی تھی۔ ان آنکھوں نے ایسے ایسے منظر دیکھے تھے کہ بصارت پتھر کی ہو گئی تھی۔ انہی آنکھوں نے ایک منظر اور دیکھا۔ انکل مدثر کو میری نگاہوں کے سامنے کھینچ کر زمین پر گرا لیا گیا اور چھ سات مشنڈے اس بوڑھے شخص کو روٹی کی طرح دھکنے لگے۔ جب انکل مدثر بالکل بے سدھ ہو گئے تو انہیں گھسیٹتے ہوئے بستی کے چوراہے میں پھینک دیا گیا۔ ان کا تصور یہ تھا کہ انہوں نے مجھے غلاظت میں سے باہر نکالا تھا۔ انہوں نے میرے جسم کو صاف کیا تھا پورے آٹھ پہر ان کا خونچکاں جسم بستی کے چوراہے میں پڑا رہا۔ پھر کل کے گھوڑا بان انہیں کبھی میں ڈال کر نا معلوم مقام پر لے گئے۔

جسم پر لگی غلاظت تو صاف ہو گئی تھی مگر اس کا کچھ اثر باقی تھا جسکی وجہ سے حشرات الارض میرے جسم پر ریگنے لگے تھے۔ وہ بڑی طوفانی شام تھی۔ ہر طرف آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔ بستی کے چوراہے میں جلنے والی شمعیں بجھ گئی تھیں۔ لوگ گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق جب وادی میں یوں تیز آندھی آتی تھی تو بڑے دیوتا بھیڑا کے چار تبرک ہیروں کے مالک دیوتا کی مدد کیلئے آسمانوں سے اتر آتے ہیں۔

میں آندھی کی شدت سے سے بچنے کیلئے ریگتا ہوا درخت کے نیچے چلا گیا۔ وہاں زو با سار حسب معمول موٹی چادر اوڑھے سو رہا تھا جبکہ ایک اور چادر اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ میں نے وہ فالتو چادر اٹھائی اور اوڑھ لی۔ اسی دوران ایک تیز رفتار کبھی بالکل میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد کبھی کا پچھلا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک مرمریں ہاتھ باہر آیا۔ وہ کوئی عورت تھی اس کا سارا جسم بڑی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی چادر اس طرح سے تھی کہ صرف ناک اور ہونٹ نظر آ رہے تھے۔ اتنے عریاں چہرے میں سے بھی حسن کی پلٹیں نکل رہی تھیں۔ اس

بگھی سوار حسینہ کے چادر میں سے باہر نکلے ہوئے مرمر میں ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے۔ لرزے ہاتھوں سے اس نے کھانا مجھے تھا دیا۔ اتنے میں میرے قریب لینا زو با سار بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کھانا لے کر ممنونیت بھری نظروں سے اس اجنبی حسینہ کی طرف دیکھا ساتھ ہی مجھے ایک بچی سی سنائی دی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مخالف سمت سے آیا اور حسینہ کے سر سے چادر اتر کر شانوں پر پھیل گئی۔ میرے سامنے بیٹھی حسینہ کوئی اور نہیں رابعہ تھی۔ بگھی میں جلتی مشعل کی روشنی میں اس کا تلخ چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر وہ مخصوص زیور آویزاں تھا جو صرف دیوتا بوکاشی کی بیویاں ہی پہن سکتی تھیں۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے برتن بگھی کے دروازے پر دے مارے۔ سارا کھانا بگھی کے پہننے کے پاس بکھر گیا۔ کچھ کھانا ایک برتن میں رہ گیا تھا۔ وہ میرے پاس آگئی اور کھانے کا لقمہ بنا کر میرے منہ میں ڈالنے لگی۔ آدھا لقمہ میرے منہ میں تھا اور آدھا باہر تھا کہ میں نے سب کچھ تھوک دیا۔ رابعہ کی آنکھوں میں بے تحاشہ آنسو اُٹھ آئے وہ رندھے لہجے میں بولی۔ ”علی نواز! یہ کھالو یہ میں تمہارے لئے بڑی مشکل سے لے کر آئی ہوں۔“ وہ بڑی دیرینہ منت سماجت کرتی رہی، روتی رہی اور ہاتھ جوڑ کر مجھے کھانا کھلانے کی ضد کرتی رہی مگر میں اپنے موقف سے ایک قدم نہیں ہلا۔ جب اس کی ضد عروج پر پہنچ گئی تو میں کھانے کے برتن اس کے ہاتھ سے لے کر دور پھینک دیئے اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ چند لمحے مجھے دبے دبے ہنسیوں کے ٹوٹے سنائی دیتے رہے پھر بگھی وہاں سے رخصت ہو گئی اور بگھی والی بھی۔

آندھی کے جھکڑ رات کے پچھلے پہر تک چلتے رہے۔ رابعہ میرے پاس آئی تھی وہ مجھے کھانا کھلانے آئی تھی مگر میں تو کسی رابعہ کو نہیں جانتا تھا۔ اس واقعے کا میرے ذہن پر رتی برابر اثر نہیں تھا۔ رابعہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری زندگی سے نکل چکی تھی۔ جس رابعہ سے میں پیار کرتا تھا، دیوانوں کی طرح ٹوٹ کر چاہتا تھا وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ اس کے لاشے کو تو میں اپنے ہاتھوں سے زرزوف کی قبر میں دفن کر کے آیا تھا۔

یہ اسی طوفانی رات کا ذکر ہے صبح ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ میں چادر اوڑھ لیتا تھا کہ زو با سار نے مجھے اٹھا بیٹھایا اور بڑی غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی مجھے یوں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک نعرہ بلند کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تجھے ڈھونڈ لیا..... ہاں..... ڈھونڈ لیا..... تجھے..... تو وہی ہے..... وہی ہے تو جو یہ کام کرے گا..... طاقت اور جوش تجھ میں بہت تھا..... میں دیکھنا چاہتا تھا..... تیرے اندر..... برداشت کتنی ہے..... اتنی اذیت برداشت کرنے

والے..... اپنی جان خود لے لیتے ہیں..... مگر..... مگر تو تو زندہ ہے..... تو نے اپنی جان نہیں لی..... تو زندہ ہے..... تو ہی یہ کام کرے گا..... باا..... تو ہی..... اٹھ جا..... تیار ہو جا..... کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا..... تو..... تو برداشت کی آخری حد کو چھو آیا ہے.....“ زو با سار پتہ نہیں اور بھی کیا کچھ بولتا رہا میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔

میں اس کی بے ربط دیوانہ گفتگو پر لعنت بھیج کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے مجھے دوبارہ اٹھا بیٹھایا اور نامکمل بے ربط باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس پر طیش آنے لگا میں نے سوچا کہ رینگتا ہوا اس بلا سے دور چلا جاؤں مگر اس ”بلا“ نے اچانک ایک ایسی بات کہی کہ میں سر تا پا چونک گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں تجھے بھیڑا کے ہیروں کے متعلق بتاؤں گا..... میں تجھے بتاؤں گا کہ بوکاشی دیوتا اصل میں کیا ہے..... بوکاشی دیوتا کی موت تیرے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے تیار ہو جا..... تو تیار ہو جا..... اٹھ کے بیٹھ دو دن کے اندر اندر اس وحشی جانور سے سب کی جان چھوٹ جائے گی۔ بس تو اٹھ کے بیٹھ اور اپنے ذہن کو بالکل صاف کر لے..... تجھے کچھ نہیں..... تو بالکل ٹھیک ہے.....“

اچانک یوں لگا کہ واقعی مجھے کچھ نہیں ہے میں بالکل تندرست اور توانا ہوں۔ ساری نقاہت جیسے اعصاب کی تھی ساری کمزوری جیسے مجھ پر پڑنے والے صدمے کی تھی۔ میں اٹھ کے بیٹھا تو زو با سار میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہنا شروع کیا تو جیسے میں حیرت کے گھٹے جنگل میں گم ہو کر رہ گیا۔ ایک ایک گرہ کھلتی گئی اور مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ میں بار بار چونکا اور بار بار میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس بات کا یقین کروں اور کس کو جھوٹ گردانوں۔ کہیں..... میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ بڑا خوبصورت اور سہانا خواب.....

جس رات یہ ساری باتیں ہوئیں اس سے اگلی رات میں اور بالی گھوڑوں پر سوار شال کی جانب بڑھ رہے تھے۔ دن کے وقت میں نے بالی کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا اور پھر بیلہ کی اجازت سے بالی میرے ساتھ جلی وادی کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک ویران کھنڈر آیا تو پہلے سے سوچے ہوئے منصوبے کے تحت بالی نے میرے سارے جسم پر کالا رنگ پھیر دیا۔ اب میں بھی کالی فوج کا سپاہی بن چکا تھا۔ بستی کے چوراہے کے جس درخت کے نیچے میں چادر اوڑھ لیتا رہتا تھا اب میری جگہ بالی کا ایک ساتھی لینا ہوا تھا اس نے سر سے پیر تک چادر اوڑھ رکھی تھی۔

گھوڑوں پر میرا اور بالی کا سفر تقریباً ایک رات جاری رہا۔ دو جگہ کالی فوج کی چوکی پر ہمیں روکا گیا مگر بالی نے بڑے اعتماد کے ساتھ انہیں بتایا کہ ہم بوکاشی دیوتا کے حکم سے جلی وادی کی جاسوسی

کیلے نکلے ہیں چونکہ دودن بعد جلی وادی کی طرف کالی فوج کی پیش قدمی ہونے والی ہے۔ اس لئے بوکاشی دیوتا نے یہ سب ضروری سمجھا ہے۔ دونوں جنگیوں پر ہمیں فوراً آگے جانے کی اجازت دے دی گئی کیونکہ یہ بات تو ہر کوئی جانتا تھا کہ بوکاشی دیوتا دلوں کے بھید جانتا ہے اس کی سوچ کو تو کوئی بھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔

صبح کی آمد آمد تھی جب ہم دونوں ہاتھ میں محترم زو باسار کا دیا ہوا کپڑا ہوا میں لہراتے ہوئے جلی وادی میں اترے۔ میرے ہاتھ میں بڑے پھل کی وزنی کٹار تھی جبکہ بالی دودھاری کلہاڑا تھا۔ ہوا تھا۔ جونہی ہم لوگ وادی میں داخل ہوئے بے شمار درختوں سے بہت سے جلی گوریلے کو در ہمارے سامنے آ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ حملہ آور ہوتے ایک عمر رسیدہ گوریلے نے میرے ہاتھ میں دبا ہوا کپڑا دیکھا تو حلق کے بل چلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں وہاں ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ سب لوگ خوشی سے دیوانہ وار چلا رہے تھے اور اچھل کود کر رہے تھے ان کے چہرے خوشی سے متمتع رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ جلی وادی کے سردار ببا کو کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ زردی مائل رنگت والا ایک بوڑھا شخص تھا اس کے جسم پر شیر کی کھال تھی، وہ ہم سے بڑے تپاک سے ملا۔ خوشی اس شخص کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی اس نے کوئی بات کی جو ایک ترجمان نے ہمیں بتائی۔ وہ ہمارے یہاں آنے پر بڑا خوش ہو رہا تھا اور دیوتاؤں کا شکر بجالا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جنگی پھلوں اور دودھ سے ہماری تواضع کی گئی اور آخر میں شراب پیش کی گئی جو میں نے معذرت سے لوٹا دی جبکہ بالی پورے دو جام غناغٹ پی گیا۔ کچھ عرصے سے بالی شراب زیادہ ہی پینے لگ گیا تھا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ بالی کو ساسا کے متعلق بتا دوں کیونکہ وہ سارے راستے بھی ساسا کی باتیں کرتا آ رہا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ ساسا اسی زمین پر سانس لے رہی ہے جہاں وہ شراب کے نشے میں دھست ہو کر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے وہ چلتا ہے تو ساسا اس کے قدموں کی آہٹ زندان کے اندر بیٹھی سنتی ہے۔ وہ بے چارہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ساسا بوکاشی دیوتا کے محل کے نیچے بنے زندان میں قید ہے۔ اگر اسے ساسا کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو جاتا مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا یہ ہم اور بہت سے اور لوگوں کی بہتری کیلئے تھا۔

ہم جلی وادی میں دو راتیں اور ایک پورا دن رہے۔ اس دوران وادی میں ساری منصوبہ بندی کر لی گئی۔ وہ رات کا پہلا پہر تھا جلی قبیلے کے سارے کے سارے لوگ وادی کے جنوبی حصے میں جمع تھے ان میں چھوٹے بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ ساری وادی خالی کر لی گئی تھی اور جگہ جگہ آگ کے

الاؤ روشن کر دیئے گئے تھے یہ ایسی آگ تھی جو تمام رات جلتی تھی۔ آٹھ گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد بستی کے بڑے سرداروں، سردار ببا کو اور ہم دونوں کے درمیان جو فیصلہ ہوا تھا اس کے مطابق ہم لوگوں نے ساری وادی خالی کر لی تھی گھروں کے پردے گرا دیئے تھے آگ روشن کر دی تھی اور بستی کے بڑے چوراہے پر موجود ”پراسرار“ چٹانوں پر ڈھیروں پانی انڈیل دیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں جلی گوریلے میدان جنگ سجاتے تھے۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھے۔ جنگ کی حالت میں صرف ایک صورت ہی ان کے منہ کی ہوتی تھی کہ وہ ان چٹانوں کے درمیان دشمن سے لڑیں۔ وہ چٹانیں گندھک کی طرح کے کسی مادے کی بنی ہوئی تھیں۔ پانی انڈیلنے ہی ان میں سے ایسے بخارات نکلتے تھے کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔ جلی گوریلے برسوں سے یہاں پر رہے تھے وہ ایسی گندھک والی ہوا کے عادی ہو چکے تھے جبکہ جلی وادی پر حملہ کرنے والے منتوں میں اپنا سانس کھو بیٹھتے تھے۔ ان چٹانوں کے درمیان لڑنا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا تھا اور وہ اپنے بہت سے فوجی مروا کر وہاں سے راہ فرار اختیار کرتے تھے۔ گویا یہ عجیب و غریب چٹانیں جن میں سے ہمہ وقت دھواں اٹھتا رہتا تھا جلی قبیلے کی زندگی کی ضامن تھیں۔

باہمی مشاورت سے ہم لوگ جلی وادی خالی کر چکے تھے اور صبح صادق اس وادی سے بار آور ہونے والی کالی فوج کے لئے پورا پورا انتظام کر چکے تھے۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہوتے ہی ہمیں یہاں سے کالی وادی کی طرف کوچ کر جانا تھا۔ پروگرام کے مطابق جس وقت بوکاشی دیوتا کی معیت میں کالی فوج نے یہاں پہنچنا تھا اس وقت تک ہم نے اس کالی دھرتی میں ہونا تھا جس کی تہہ میں بھیڑا کے چار مقدس ہیرے محفوظ تھے۔ ہیرے ہمارے ہاتھ میں آتے ہی بازی پلٹ جاتی تھی کیونکہ اس دھرتی کے قانون کے مطابق بھیڑا کے چار ہیرے جس کی ملکیت ہوں سب لوگ اس کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں۔ اپنے منصوبے کے تحت ہم لوگ اگر بوکاشی دیوتا اور اس کی کالی فوج کی غیر موجودگی میں ان ہیروں تک پہنچ جاتے تو بغیر جنگ کے ہی فتح ہماری ہوتی۔ ہیروں تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا مگر یہ ہمیں کرنا تھا بلکہ مجھے کرنا تھا۔ اس کام میں جان جانے کا اسی فیصد چانس تھا مگر مجھے بھلا اب جان کی فکر کہاں تھی۔ احساس میرے لئے مرچکا تھا میں تو زندہ چلتا پھرتا لا شہ تھا جس پر انتقام کا بھاری بوجھ تھا۔ مجھے رات کو رینا کی کرناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی انکل ہیری کرس کا لاشہ آنکھوں میں گھومتا تھا تو کبھی پوباشے کی وہ آخری نگاہ دماغ میں انگارے بھرتی تھی جو اس دکھوں کی ماری لڑکی کی موت کے مرتبان کے اندر سے اٹھی تھی۔ میں ان سب

مرنے والوں کو بھولا نہیں تھا۔ ایک ایک منظر میرے دماغ پر نقش تھا، ایک ایک خونی تحریر میرے دل پہ لکھی ہوئی تھی۔ میرا دل ایک ایسا دکھتا ہوا پتھر تھا جس کے نیچے انتقام کا لاوا ہلکورے لے رہا تھا، کوئی وقت گزرتا تھا کہ پتھر کو ککڑے ککڑے ہو جانا تھا اور انتقام کے لاوے نے پھٹ نکلنا تھا۔ بالی جلی وادی میں پہنچنے تک مجھ سے کئی دفعہ پوچھ چکا تھا کہ علی نواز تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے تم بالکل خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ بات چیت کیوں نہیں کرتے۔ تمہاری یہ خاموشی مجھے خوف اور الجھن میں مبتلا کر رہی ہے۔ بالی کے سوال پر بھی میں خاموشی ہی اختیار کئے رہتا تھا۔ میری نظریں تو اپنی منزل کی جانب تھیں۔ منزل جو مجھ سے ایک صبح کی دوری پر تھی۔ وہ..... صبح جس کی کوکھ میں شاید ہزاروں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔

کالی دھرتی سے جلی وادی تک پہنچنے کا ایک ہی رستہ تھا جس رستے کے ذریعے میں اور بالی یہاں پہنچے تھے۔ جبکہ جلی گوریلے ایک ایسے خفیہ رستے سے واقف تھے جو ایک کلاوہ کاٹنے ہوئے کالی وادی میں پہنچتا تھا۔ اس رستے کے بارے میں جلی گوریلوں کے علاوہ کوئی واقف نہیں تھا۔ یہی وہ رستہ تھا جس سے جلی گوریلے کالی فوج پر حملہ آور ہوئے تھے۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ہمارا بارہ سوفوس پر مشتمل قافلہ کالی وادی کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔ اس قافلے میں لڑنے والوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی باقی نفوس عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھے۔ موت کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ یہ ایک پل صراط تھا جس پر ہمارا یہ قافلہ چل نکلا تھا اگر کسی طرح ہمارا ناکرہ کالی فوج سے ہو جاتا تو موت یقینی تھی۔ بارہ سوفوس کے مقابلے میں کالی فوج کا دس ہزار جنگجوؤں کا عظیم لشکر ہمارے مقابل ہونا تھا۔

جس رستے پہ ہمارے گھوڑے دوڑ رہے تھے وہ بڑا ویران اور گھنا علاقہ تھا۔ اس راستے کے بائیں پہلو میں جنگلی جانوروں کے غول کے غول گھومتے نظر آرہے تھے۔ کبھی کوئی جانور راستے میں آ جاتا تو جلی گوریلوں کے شکار نے پر بھاگ نکلتا۔ ایک دو جنگلی بھینسوں کو جلی گوریلوں نے تلوار کے زخم بھی لگائے۔ بالی میرے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑاتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ بڑی فکر مندی تھی۔ وہ کئی دفعہ مجھ سے اس خدشے کا اظہار کر چکا تھا کہ جو کچھ محترم زوبا سار کہہ چکے ہیں اگر وہ غلط نکلا تو پھر کیا ہوگا؟ میں نے ہر دفعہ اسے دلاسا دیا اور سمجھایا کہ محترم زوبا سار نے جو کچھ مجھے تفصیلاً بتایا ہے وہ سب حقیقت ہے اور اس عجیب و غریب حقیقت کا میں خود گواہ ہوں۔

بارہ سومر دوزن کا یہ جنگی سامان سے لیس قافلہ بڑی تیزی سے کالی وادی کی طرف گامزن تھا۔

وہی کالی وادی جس میں ایک طویل عرصے سے جبر کی طلسمی سلطنت قائم تھی۔ آج اس شیطانی طاقت کو ختم کرنے کا وقت آگیا تھا۔ ایک طوفانی شب کے واقعات، مناظر اور چشم کشا باتیں ہی تھیں جنہوں نے میرے مردہ لاشے میں زندگی کی حرارت دوڑا دی تھی میرے ناتواں ہاتھوں میں بجلیاں اتار دی تھیں۔ یہ وہ طوفانی رات تھی جب میں نے رابعہ کے لائے ہوئے برتن دور پھینک دیئے تھے اور پھر زوبا سار نے اس طوفانی شب کا سویرا ہونے پہلے میرے سامنے سب کچھ اگل دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔

”دیوتا بوکاشی! دوسرے انسانوں کی طرح کا ایک عام انسان ہے۔ وہ کسی طلسمی اور غیبی طاقت کا مالک نہیں ہے۔ وہ بس ایک نہایت چالاک اور ہوشیار آدمی ہے۔ وہ عام جنگلیوں کی طرح بھیس بدل کر بستی بستی پھرتا ہے۔ اس کی مار جلی وادی سے لے کر کالی وادی اور برب وادی تک ہے۔ وہ غضب کا چہرہ شناس شخص ہے لوگوں کے چہروں، رویوں اور عادات کو پڑھتا ہے پھر دیوتا کی کرسی پر بیٹھ کر ”غیب کی باتیں“ بتاتا ہے کوئی آدمی نہیں جانتا کہ بوکاشی دیوتا کون ہے۔

لوگوں کے قریب آس پاس بیٹھا کوئی بھی بندہ بوکاشی دیوتا ہو سکتا ہے۔ بوکاشی دیوتا نے ہر طرف اپنے مہبت سے خمر چھوڑ رکھے ہیں جو ہر روز اسے طرح طرح کی خبریں لا کر دیتے ہیں اور بوکاشی دیوتا ان خبروں کو اپنی طلسمی طاقت کے رنگ میں رنگ کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو لوگ عیش عرش کراٹھتے ہیں۔ شروع شروع میں ایسے چند ایک واقعات نے ہی بستی کے لوگوں میں بوکاشی دیوتا کی دھاک بٹھا دی اور وہ غیبی طاقت کا دیوتا بن بیٹھا جو اپنے استھان پر بیٹھ کر میلوں دور پیش آنے والے واقعات کو دیکھ لیتا ہے۔“

محترم زوبا سار کی بتائی ہوئی باتوں نے بوکاشی دیوتا کی جھوٹی طلسمی طاقت کے برج الٹ دیئے تھے۔ اس کی مکارانہ غیبی طاقت کا پول کھول کے رکھ دیا تھا۔ اس عظیم انکشاف کے بعد میں ایک دم اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا اور ہاتھوں میں ہتھیار اٹھالیا تھا۔ اب یہ ہتھیار بوکاشی کی موت کے بعد ہی میرے ہاتھوں سے چھوٹنا تھا۔ بالی کو میری خاموش نظر آتی تھی مگر اس کے پیچھے چھپے ہوئے طوفان کو وہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ موت سے وہ بندہ ڈرتا ہے جس کے پاس کوئی چیز ہارنے کیلئے ہو۔ میرے پاس ہارنے کیلئے کچھ بچا ہی نہیں تھا بس ایک نیلگوں آگ تھی..... رابعہ کی نیلی آنکھوں جیسی جو میرے وجود اور ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے جسم سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔



ہمیں گھوڑے دوڑاتے ہوئے تقریباً پانچ گھنٹے ہو چلے تھے جب اچانک اگلے دستے کے سالاروں نے گھوڑے روک لئے۔ سارا قافلہ رک گیا، ہلکی ہلکی دھند تھی جو چار سو چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند کی اوٹ میں کچھ روشنیاں رقص کر رہی تھیں سب لوگ چونکے ہو چکے تھے۔ ہوا کے ایک تیز ریلے نے دھند کو دھکیلا تو منظر واضح ہو گیا۔ وہ واقع پیش آچکا تھا جس کی وجہ سے جلی سردار اور سردار ببا کو گھبرا رہے تھے۔ ہمارے سامنے ایک عظیم لشکر کھڑا تھا۔ حدنگاہ تک مشعلیں ہی مشعلیں نظر آرہی تھیں۔ ہم موت کو دھوکا دے کر کالی وادی میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر موت ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ کالی فوج کا عفریت موت کا ریلہ بن کے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ بڑے سردار بابوسی سے ایک دوسرے کا منہ تلکنے لگے۔ سردار ببا کو کا چہرہ بھی تاریکی میں ڈوب چکا تھا مگر میرے سینے میں جوش کے سمندر ہلکورے لے رہے تھے۔ میں نے آج اس سارے لشکر کو تہ تیغ کر دینا تھا یا خود موت کے گھاٹ اتر جانا تھا۔ تیسرا راستہ مجھے قبول نہیں تھا لیکن پھر جلدی ہی اصل صورت حال واضح ہوگئی۔ یہ کالی فوج نہیں تھی، میں جلی گوریلوں کے درمیان سے رستہ بناتا ہوا آگے بڑھا۔ میرے ہاتھ میں بڑے پھل کی وزنی کنار تھی۔ جوش و ولولے کی شدت سے میرا چہرہ ہمتا رہا تھا میں سردار ببا کو کے قریب ہوا اور حملے سے متعلق اس سے اجازت لینے لگا۔ سردار ببا کو کے چہرے پر شدید الجھن تھی۔ وہ کبھی دو سو گز دور کھڑے لشکر کی طرف دیکھ رہا تھا کبھی اپنے قافلے کے ایک طرف کھڑی عورتوں اور بچوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچتا مخالف لشکر سے ایک گھوڑا سوار دوڑتا ہوا سردار ببا کو کے پاس آیا۔ اس دوران میں گھوڑوں کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے سردار ببا کو سے دور ہو چکا تھا اس گھوڑا سوار نے سردار سے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت پاتے ہی وہ سردار کے قریب گھوڑا لے گیا اور کھسر پھسر کرنے لگے۔ یہ بات جیت شاید ایک منٹ تک جاری رہی اس کے تھوڑی دیر بعد وہ ویران علاقہ جنگجوؤں کے نعروں سے گونج اٹھا۔ دونوں طرف کے جنگو اپنی تلواریں اپنی ڈھالوں سے ٹکرا کر خوشی کا اظہار کرنے لگے تھوڑی دیر بعد ہی چار ہزار کے لگ بھگ وہ لشکر ہمارے قافلے سے آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر پہلے سے ہوئے چہرے مسکراہٹوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ پھر ایک سردار کے بتانے پر پتہ چلا کہ یہ عظیم لشکر پر بت پارے آنے والے بیلے قبیلے کا ہے۔ بیلے قبیلے کا نام سن کر میں چونک گیا۔ بیلے قبیلہ میری جان کا دشمن تھا۔ بیلے قبیلے کا سردار حزیرو میرا جانی دشمن تھا مگر اس جانی دشمن نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا اور مرتے وقت کہا تھا تم ایک اچھے دشمن ہو..... اور میں تمہیں بتاتا

ہوں کہ تم پر بت کے پار چھائی ظلمت کی دھند کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم ایسا کر گزرے تو دیوتا تم پر بہت خوش ہوں گے۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ بیلے قبیلے کا عظیم لشکر یہاں موجود تھا تو..... تو کیا یہ لشکر ہماری مدد کو آیا تھا۔

چند لمحوں بعد ہی اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ بیلے قبیلے کی اور ہماری منزل ایک ہی تھی وہ بھی بوکاشی دیوتا کی شیطانی سلطنت کو ختم کرنے نکلے تھے۔ سردار ببا کو کے حکم پر دونوں لشکروں کے سرداروں کی باہمی مشاورت ہوئی اور بہت سے اہم پہلوؤں پر غور ہوا۔ کوئی موقع ضائع کئے بغیر بیلے اور جلی قبیلے کا مشترکہ لشکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا ذب نمودار ہو چکی تھی جب جنگی ساز و سامان سے لیس لشکر کالی وادی میں داخل ہوا کسان بل جوت رہے تھے اور عورتیں مشینوں میں پانی بھر کے لارہی تھیں۔

ان کے علاوہ بستی میں اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند معصوم چھوٹے بچے لابی سنہری گھاس میں کھیل رہے تھے۔ بستی کی گلیوں میں اور باہر کھلے میدانوں میں کوئی جنگجو نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ چیز ہمارے لئے بہت زیادہ حوصلہ افزا تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کالی فوج جلی وادی کی طرف کوچ کر چکی ہوئی تھی۔ کالی فوج جلی وادی کو خالی دیکھ کر واپس بھی پلٹی تو وہ لشکر چھ گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا اور ہیرے تلاش کرنے کیلئے چھ گھنٹے بہت تھے۔ کالی وادی میں موجود مزاحمت کرنے والے سپاہیوں کیلئے ہمارے جنگجو کافی تھے۔ مجھے تو صرف ان ہیروں تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ میں لشکر میں سب سے آگے چل رہا تھا۔ بستی کی عورتیں اور کسان عجیب حیرانگی سے اس عظیم لشکر کو دیکھ رہے تھے۔ ببا کو کا حکم تھا کہ بستی کے کسی عام آدمی کو کچھ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ سب لوگ تو پہلے ہی اذیت کی چکی میں پس رہے تھے۔ میں سردار ببا کو کو لیتا ہوا اس چوراہے کے قریب پہنچا جہاں محترم زوبا سار درخت کے نیچے اپنی دنیا بسائے بیٹھا تھا۔ یہ زوبا سار کوئی اور نہیں تھا ببا کو کی حکومت کا ایک چھوٹا اور نہایت سمجھدار سردار تھا۔ سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور..... سردار ببا کو تو اسے اپنا بھائی کہتا تھا۔ بستی کے چوراہے میں اور کوئی نہیں تھا صرف درخت کے نیچے میلی کچیلی چادر اوڑھے محترم زوبا سار سو رہا تھا میں گھوڑے سے جست لیتا ہوا اترا اور میں نے چادر اٹھا دی۔ خدا کی پناہ محترم زوبا سار کا کٹا ہوا سر اس کے اپنے ہی قدموں میں پڑا ہوا تھا اس کی میلی کچیلی آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ بھیڑا کے چار مقدس ہیروں کی خاطر اپنی محبوب بیوی اور دو معصوم بچیاں چھوڑ کر

ہجرت کرنے والا شخص ہیروں کی حصول یابی کے بغیر ہی دنیا سے چلا گیا تھا۔ میں بے پناہ طیش کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ ٹھیک وہ وقت تھا جب ایک تیر میرے پاس کھڑے گھوڑ سوار کے سینے میں ترازو ہو گیا۔ وہ اچھل کر گھوڑے سے گرا اور تپنے لگا۔ میری نگاہ اس طرف اٹھی جہاں سے تیر آیا تھا۔ وہاں سیاہ دھول اٹھ رہی تھی۔ مجھے بے تحاشہ جینوں اور لٹکاروں کی آواز میرے کانوں میں پڑی میں جست لیتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا اور پھر سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ کالی فوج کا سیلاب ہر بند توڑ کر بہہ نکلا تھا۔ ہم نے کالی فوج سے ایک چال کھینی تھی اور ہماری چال الٹی پڑ گئی تھی۔ کالی فوج ہماری ترکیب سمجھ گئی تھی انہوں نے جلی وادی کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے کالی وادی میں ٹھہر کر ہی ہمارا انتظار کیا تھا۔ بوکاشی دیوتا نے کالی فوج کے لشکر کو بڑے اسٹیڈیم میں چھپا رکھا تھا۔ جب ہم پورے کے پورے بستی میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اسٹیڈیم سے نکل کر ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میرے سینے میں جلنے والی نیلگوں آگ فروز تر ہو گئی تھی۔ دگوں میں بہنے والا آتشیں لاوا شدید تر ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی فوج بستی میں داخل ہو گئی۔ ان کی قیادت کرنے والا بوکاشی دیوتا خود تھا۔ دونوں لشکروں کی صفیں آمنے سامنے آ رہی ہو گئیں اور بوکاشی دیوتا کی پر اسرار آواز بلند ہوئی۔

”بہت خوب لڑ کے.....“ اس کا اشارہ میری طرف تھا وہ بولا۔ ”تم تو بہت بہادر اور تیز رفتار نکلتے۔ اس پاگل بوڑھے سے ہیروں کے متعلق بھی پوچھ لیا اور جلی گوریلوں کا لشکر لے کر یہاں بھی پہنچ گئے۔ میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں مگر میں یہاں بڑے افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ تم نے ببا کو کے ساتھ بھلائی نہیں کی بلکہ اس کا بہت بڑا نقصان کر دیا ہے۔ جب تک یہ لوگ اپنی وادی میں تھے محفوظ تھے..... تم ان کو وہاں سے نکال لائے۔ سارے کے سارے یہاں ہماری وادی میں ہمیں قتل کرنے پہنچ گئے، مگر یاد رکھو لڑکے میں بڑے دیوتا کی قسم کھا کر کہتا ہوں تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا اور اگر بچ گیا تو میں اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لوں گا..... سمجھے تم..... بھیڑا کے چار ہیرے تو کیا تم ان کی پرچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکتے.....“

بوکاشی دیوتا کی بات ختم ہوئی تو ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی کے ہلکا سا کھانسنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ بوکاشی دیوتا کے جواب میں کوئی بولتا میں حلق کے بل چیخا۔ ”گھوڑے کی لید میں ریٹکے والے حقیر کیڑے..... میں اپنے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں آج ہزار پردوں میں بھی چھپ جائے تو میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔ تیری حمایت کرنے والے کا آج وہ حال ہوگا کہ وہ اس دھرتی میں پیدا ہونے اور تجھ جیسے حقیر اور غلیظ جانور کی حمایت کرنے پر روئے گا۔ بوکاشی

آج تیرے لئے کہیں امان نہیں ہے۔ تیری جھوٹی طاقت کا پول کھل گیا ہے۔ تیری طلسمی طاقت کو آج میں اس گھوڑے کے پاؤں میں روندنا ہوا لے جاؤں گا۔ تو نے غیبی طاقت کا دعویٰ کر کے اس دھرتی کے لوگوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ وہ بے چارے تیری مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے تھے مگر دیکھ بوکاشی میں نے تیرا قانون توڑ ڈالا ہے تیری طلسمی طاقت کو تہس نہس کر ڈالا ہے۔ اگر تو غیب کا علم رکھنے والا ہوا تو میں کبھی اس دھرتی سے باہر نہ جاسکتا، کبھی ہیروں کے متعلق محترم زو با سار سے نہ جان سکتا، بوکاشی تو غیب کا علم جانتا ہوتا تو کبھی محترم زو با سار کو پاگل نہ سمجھتا، تجھے علم ہی نہیں تھا کہ یہی زو با سار تیری موت کا سبب بنے گا۔ یاد رکھ بیڑا کے گندے تالاب میں تیرے والے کچھوے! میں تجھے ایسی موت سے دو چار کروں گا کہ تیری روح بھی مجھ سے پناہ مانگے گی۔“

حلق کے بل چیختے ہوئے جس وقت میں یہ باتیں بوکاشی دیوتا سے کر رہا تھا مجھ پر دیوانگی سوار تھی۔ آنکھوں کی پتلیوں کی جگہ جیسے دھکتے ہوئے انگارے دھرے تھے۔ میری جوشیلی اور ولولہ انگیز تقریر کے سبب سارے لشکر میں ہمت و جوانمردی کی ایک لہر پھیل گئی تھی۔ جلی قبیلے کے سرداروں کے چہرے بلند حوصلوں سے تتما اٹھے تھے۔ سردار بابا کو عجیب پیار بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس نگاہ کا مفہوم نہیں سمجھا۔

سردار ببا کو بلند آواز سے بولا۔ ”بھوکاشی! تجھ پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہو۔ تو نے اس دھرتی کی سانسوں تک کو قیدی بنالیا ہوا تھا..... تو اس دھرتی کا سب سے بڑا کمینہ چور ہے جس نے بھیڑا کے چار مقدس ہیرے چرا کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔ تو نے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا، جھوٹی طلسمی طاقت ظاہر کرنے کیلئے بھیڑا کے تالاب کے اوپر انسانوں کے سر لٹکائے۔ اے ظالم انسان تیرا یوم حساب آچکا ہے۔ ہم اپنے پورے قبیلے کے ساتھ یہاں تیری اس دھرتی میں موجود ہیں ہمارے پیچھے ہماری عورتیں بھی ساتھ ہیں۔ آج فیصلہ ہو جائے گا آج ہم رہیں گایا تو رہے گا.....“

ببا کو کی بات کا ثما ہوا بوکاشی دیوتا غرایا۔ ”ببا کو! بہت اچھا ہوا تو یہاں چلا آیا۔ میں اس بستی کو تیرے پورے قبیلے کا قبرستان بنا دوں گا۔ اس دھرتی کی پیاس تیرے جنگجوں کے لہو سے بجھے گی۔ آج ہر وہ زندگی ختم ہو جائے گی جو بوکاشی دیوتا سے بغاوت اختیار کرے گی۔ تم لوگوں نے میری طاقت کا اندازہ لگانے میں بہت بڑی غلط کی ہے۔ اب ذلت آمیز موت مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔“

بوکاشی نے اپنی فوج کو حکم دیا اور وہ ہتھیار تول کر صف بندی کرنے لگی۔ ببا کو نے بھی اپنی فوج کو صف آراء کر لیا۔

سورج کا تھاں مشرق سے اوپر چڑھ آیا تھا اور عجیب و غریب وادی میں ہونے والے بڑے معرکے کو حیرت سے تنک رہا تھا۔ بوکاشی دیوتا اپنی تمام تر فوج کے ساتھ ہراول دستے کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کالی فوج کے جنگجوؤں کا ایک سیلاب تھا۔ ان کی تلواریں، نیزے، بھالے، ڈھالیں، بلہم کٹاریں اور گرز سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

تیز چلتی ہوا میں ان کی صدیاں پھر پھڑپھڑا رہی تھیں۔ آج فیصلے کا دن تھا بوکاشی نے اشارہ کیا۔ کالی فوج نے اپنے گھوڑے دوڑا دیے۔ بباکو کے حکم پر ہم نے بھی گھوڑے دوڑائے۔ دونوں طرف کی فوجیں آپس میں ٹکرائیں اور ایک بڑا اور خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ تلواریں تلواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ حملہ آوروں کے جوشیلے نعرے اور لکارے بلند ہو رہے تھے۔ زنجیوں کی چینیں اور آہیں قیامت برپا کر رہی تھیں۔ سرکٹ کے گر رہے تھے بازو ہوا میں اچھل رہے تھے، خون کے فوارے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ میں ہراول دستے میں شامل تھا۔ میری تلوار پیام اجل سنا رہی تھی۔ میرے ساتھ چالیس کے قریب جانباز تھے۔ میں ان جیالوں کا سالار تھا۔ ہم لشکر کے بائیں پہلو سے ہوتے ہوئے لشکر کے قلب میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بوکاشی دیوتا لشکر کے قلب میں کھڑا ہدایات جاری کر رہا تھا۔ میرا ہدف بوکاشی دیوتا تھا۔ آج میرے اور اس کے درمیان ہزار دیواریں بھی حائل ہو جائیں تو مجھے ہر دیوار گراتے ہوئے اس تک پہنچ جانا تھا۔ ہم نے قلب میں گھسنے کیلئے ہلے مارا تو کالی فوج کی ایک پوری صف ہمارے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کے کھڑی ہو گئی۔ پوری صف ہمیں پیچھے کی طرف دھکیلتی گئی۔

میرے گھوڑا سوار پچھلے قدموں ہٹنے لگے۔ میں نے اپنے سپاہی پسپا ہوتے دیکھے تو تلوار بلند کی اور ایک پرجوش نعرہ مارتے ہوئے دشمن سے بھڑ گیا۔ میری تلوار صاعقہ بن گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں نے کالی فوج کے کئی جوانوں کو خون میں نہلا دیا۔ صف ٹوٹی تو میرے پیادے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور انہیں دھکیلتے ہوئے بہت دور تک لے گئے۔ ہر طرف موت کے لکارے اور خون کی بارش تھی۔ میں تلوار چلاتا ہوا لشکر کے بہت اندر تک گھس گیا تھا۔ کالی فوج کے جنگجو میرے آس پاس لکارے مار رہے تھے۔ میرے اندر کی کڑھن میری تلوار میں منتقل ہو گئی تھی اور وہ تلوار پیام اجل بن کر دشمن پر ٹوٹ رہی تھی۔ میں دشمن کو کاٹتا، مارتا، روندتا اور دھکیلتا چلا جا رہا تھا۔ میری تلوار دشمن کے کٹڑے کر رہی تھی جبکہ میری نگاہیں بوکاشی دیوتا کا تعاقب کر رہی تھیں مگر بوکاشی دیوتا اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا وہ کسی چھلاوے کی طرح روپوش ہو چکا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ بوکاشی کے غائب ہو جانے کے باوجود کالی فوج بھرپور انداز میں لڑ رہی تھی۔ اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں اپنا

گھوڑا موڑتا چلا گیا۔ میں نے سردار بباکو کے کان میں ایک بات کہی اور پھر میرا رخ بوکاشی دیوتا کے خاص محل کی طرف ہو گیا، جس پر دیوتاؤں کا کالا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ایک ٹیلے پر چڑھے ہوئے کالی فوج کے چار سپاہیوں سے ٹاکرا ہوا۔ میں نے پلک جھپکنے میں تین کوزمین چٹادی چوتھاٹھ جانے والا سوار محل کی جانب بھاگ اٹھا۔ میں کسی تند بگولے کی مانند اس کے پیچھے لپکا۔ میرا جسم میرا چہرہ خون سے نہا گیا تھا فرار ہونے والے گھوڑا سوار کو میں نے بہت جلد جالیا اور اسے تہ تیغ کر دیا۔

ادھر سردار بباکو نے نہایت دانشمندی کا ثبوت دیا وہ اپنے لشکر کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب جلی گوریلوں کی پیشین گوئی کی جانب تھیں اور ان کے سامنے کالی فوج کا عفریت تھا۔ جلی گوریلوں نے کالی فوج کے آگے اپنی طاقت کا بند باندھ تھا۔ اب محل کے اندر ریز زمین جب تک میں ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کرتا کالی فوج کا کوئی سپاہی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ محل میرے لئے نامانوس جگہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے اذیت ناک دن اس محل میں گزارے تھے۔ میں ایک خاص مقصد کیلئے برجی کے ساتھ بنے حجرے میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ بلندی سے چھلائیں لگاتے ہوئے کالی فوج کے بہت سے سپاہی میرے مقابلے پر آ گئے۔ وہ تعداد میں پندرہ کے قریب تھے ان کی قیادت کرنے والا وہی بڑے ناک والا سپاہی تھا جو ایک بار پہلے بھی میرے مقابل آچکا تھا۔ میں بڑی تیزی کے ساتھ حجرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا۔ کالی فوج کے سپاہی دیوانہ وار دروازے پر تلواریں برسانے لگے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد پچاس کے قریب ہو گئی کوئی لمحہ گزرتا تھا کہ دروازہ ٹوٹ جاتا اور دشمن مجھ پر بل پڑتا۔ ایک سپاہی وزنی گرز کھڑکی کی سلاخوں پر برسا رہا تھا۔ میں جس حجرے میں قید تھا وہاں مومی شمعیں جلانے کا تیل وافر مقدار میں مشکوں میں بھرا ہوا تھا۔ میں یہی تیل لینے کیلئے یہاں آیا تھا اور قید ہو کر رہ گیا تھا۔ گرز برسانے والے سپاہی کی ایک کاری ضرب کھڑکی پر پڑی اور کھڑکی کی چوکھٹ مجھ پر آ پڑی دشمن سپاہی اچھلتے ہوئے اندر داخل ہونے لگے۔ میں تلوار سونت کر ان کے مقابلے میں آ گیا۔

جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے صرف چار سپاہی میرے مقابل آ سکے تھے میں نے پلک جھپکنے میں دو کی گردنیں اڑا دیں۔ ان کی جگہ خالی ہوئی تو دو اور وہاں آ موجود ہوئے۔ میرے سینے میں جو آگ جل رہی تھی وہ آج ہر چیز کو جلا کر خاکستر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے دو اور سپاہیوں کو زخم لگایا اور تیسرے پر ایسی تلوار چلائی کہ اس کا سرا اچھلتا ہوا ٹوٹی کھڑکی کے پاس جا گرا۔ اتنی دیر میں حجرے کا دروازہ توڑ کر بہت سے سپاہی اندر داخل ہو گئے اب میں دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ میں نے

گوریلوں کو حکم دیا ان عورتوں کو لے کر محل کی بلند برجیوں پر چڑھ جاؤ..... اور دیکھو ان عورتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اتنی بات کر کے میں پلٹا ایک لمحے کیلئے میری نگاہ رابعہ سے ٹکرائی اور پھر میں باہر نکلتا چلا گیا۔ اب میرا رخ اس زنداں کی طرف تھا جہاں ساسا قید تھی۔ بہت جلد میں وہاں پہنچ گیا۔ پہرے دار کو قتل کر کے جب میں زنداں کا تالہ کھول چکا تو ساسا کو دیکھے بغیر میں بڑی تیزی سے واپس پلٹا میرا رخ اب بھیڑا کے تالاب کی جانب تھا وہی تالاب جس کی تہہ سے ایک سرنگ نما راستہ اس عجیب و پر اسرار جگہ کی طرف جاتا تھا جہاں بھیڑا کے چار مقدس ہیرے پڑے تھے۔ بوکاشی کے علاوہ وہاں آج تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔ تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر ایک نظر میں نے اس غلیظ ترین پانی کو دیکھا جس میں انسانی کھوپڑیاں، ہڈیاں، آنتیں، جانوروں کا فضلہ وغیرہ تیر رہا تھا پھر میری نگاہ میں مرنے والے اپنے تمام پیاروں کی شکلیں گھوم گئیں اور ان تمام بے کس انسانوں کے ستے ہوئے چہرے گھوم گئے جو نہ جانے کتنے عرصے سے اس وادی کے ظالم حاکم کا ظلم برداشت کر رہے تھے۔ بہت سی مانوس آوازیں میری ساعت میں گونج رہی تھیں۔ ”تم..... تم بربت کے پار..... اس پار چھائی ظلمت کی دھند کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم ایسا کر گزرے تو دیوتا تم پر بہت خوش ہوں گے۔ ظلم کی چکی میں پے ہوئے لوگ تمہیں دعائیں دیں گے۔“ یہ مرنے والے حینزو کے الفاظ تھے جس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ ”ایلی نیوز، دیوتا تم پر مہربان ہیں اور دیوتا تم سے کوئی بہت بڑا کام لینا چاہتے ہیں۔ سو وہ وقت اب آن پہنچا ہے۔“ یہ بیلہ کے الفاظ تھے جو اس نے اماوس کی رات کو اپنے محل کے اندر مجھ سے کہے تھے۔ پھر محترم زو با سار کے وہ الفاظ ساعت میں گونجنے لگے جو انہوں نے مجھ سے آخری ملاقات میں کہے تھے۔ ”تو تیار ہو جا..... اٹھ کے بیٹھ دو دن کے اندر اندر اس وحشی جانور سے سب کی جان چھوٹ جائے گی..... بس تو اٹھ کے بیٹھ اور اپنے ذہن کو بالکل صاف کر لے۔ تجھے کچھ نہیں تو بالکل ٹھیک ہے۔“

”ہاں..... ہاں.....“ میں جیسے حلق کے بل چینا۔ اس وحشی جانور سے اب سب کی جان چھوٹنے کا وقت آگیا ہے پھر ان سب گونجتی آوازوں میں ریٹا کی آخری کر بناک چیخ حاوی ہوتی چلی گئی۔ میں نے تلوار مضبوطی سے ہاتھ میں تھامی ایک طویل لمبا سانس کھینچا اور اس غلیظ ترین تالاب میں اترتا چلا گیا۔ بہت جلد میں تالاب کے پیندے سے جا لگا وہ کوئی بیس فٹ گہرا تالاب تھا۔ اب اس سرنگ نما راستے کو ڈھونڈنے کا مسئلہ تھا میں تالاب کے چاروں طرف گھومنے لگا جلد

دوسرے ہاتھ میں بھی مرنے والے ایک سپاہی کی تلوار اٹھالی تھی۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا جب بیرونی صدر دروازے پر شور بلند ہوا اور ساتھ ستر کے قریب جلی گوریلے میری مدد کو آن پہنچے۔ جلی گوریلوں کے پہنچنے ہی محل کے اندر میدان کارزار گرم ہو گیا۔ میں اندھا دھند دونوں تلواریں چلاتا ہوا حجرے سے باہر نکل آیا۔ جلی گوریلوں نے محل میں داخل ہوتے ہی کالی فوج کے سپاہیوں کی لاشیں بچھانا شروع کر دی تھیں۔ مجھے وقت کی اہمیت کا اندازہ بہت شدت سے تھا مجھے معلوم تھا میں جتنی دیر کروں گا کالی فوج جلی قبیلے کے اتنے ہی جوان قتل کر ڈالے گی۔ لڑتے ہوئے ایک ”یک صدی“ سردار میرے قریب ہوا تو میں نے پوچھا۔

”بوکاشی دیوتا اس وقت کہاں ہے؟“ وہ جوابا بولا۔ ”بوکاشی دیوتا اس وقت اپنے لشکر میں ہی موجود ہے۔ مجھے سردار ببا کو نے آپ کے پاس پیغام دے کر بھیجا ہے کہ جلد از جلد ہیروں تک پہنچنے کی کوشش کریں۔“ میں نے اس سردار کو حکم دیا کہ تم تیل کے ان مشکوں کو اپنے جانوروں کی مدد سے محل کی عقبی جانب لے جا کر لابی گھاس کو آگ لگا دو۔ ہوا مشرق سے مغرب کی طرف چل رہی تھی یہ وہی ہوا تھی جو ہمہ وقت اس عجیب و غریب وادی میں چلتی رہتی تھی مجھے پورا یقین تھا لابی گھاس کو آگ لگتے ہی محل کی عقبی حصہ کالی فوج کے حملے سے بالکل محفوظ ہو جائے گا۔ میں یہ ہدایات جاری کرتا ہوا جست لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور محل کی اندرونی جانب بڑھا۔ محل میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ بعض جلی گوریلے میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ میرا رخ بوکاشی دیوتا کی خواب گاہ کی جانب تھا۔ خواب گاہ کے دروازے پر ایک دیوہیکل سپاہی کھڑا پہرہ دے رہا تھا، میں نے کوئی موقع ضائع کئے بغیر اس پر وار کر دیا اس نے کمال مہارت سے وہ بچایا اور مجھ پر پل پڑا اس کی وزنی کنارتا بڑ توڑ برسنے لگی۔ اس کا ایک وار خالی جا کر لکڑی کی دلیتر میں پیوست ہوا تو میری بیک راؤنڈ ٹک نے اس کا جبر آؤڈ کے رکھ دیا اس سے پہلے کہ وہ زخمی حالت میں دوبارہ مجھ پر وار کرتا ایک جلی گوریلے نے اس کا سرتن سے جدا کر دیا۔ میں نے ایک زوردار ٹھوکر دروازے پر رسید کی تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندرونی جانب سے چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جب میں جلی گوریلوں کی معیت میں اندر داخل ہوا تو وہاں بوکاشی کی گیارہ عدد بیویاں موجود تھیں۔ بارہویں شاید بیلہ تھی جو وہاں موجود نہ تھی۔ گیارہ بیویوں میں ایک رابعہ بھی تھی رابعہ..... وہی رابعہ جس کی نیلگوں آنکھوں میں الفت کے جہاز ڈوبتے تھے وہی رابعہ جو کبھی میری تھی، میری محبت تھی مگر اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ایک پیار بھرا اوٹ تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ رابعہ کی غزالی آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ جھپکنا بھول گئی تھی۔ میں نے اس سے نظریں ہٹائیں اور جلی

ہی مجھے غار کا دھانڈل گیا۔ میرے دل کی کلی کھل اٹھی۔ میں نے ایک مخصوص جگہ ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تو ایک پتھر میکا کی انداز میں اپنی جگہ سے سرکتا چلا گیا۔ میں نے خود کو ایک سرنگ میں پایا۔ پتھر ایک بار پھر دیوار کے ساتھ برابر ہو چکا تھا تا لابلاب کا پانی سرنگ میں داخل ہونے سے قاصر تھا۔

میں اس سرنگ نما راستے میں داخل ہو گیا وہاں سیڑھیاں تھیں جو اوپر کو جاتی تھیں۔ چالیں کے قریب سیڑھیاں طے کر کے جب میں اوپر پہنچا تو ایک لمحے کیلئے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ بڑی عجیب و غریب جگہ تھی۔ ایک نامانوس سی بو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں ہر طرف ستون موجود تھے جو بلند چھت سے جا لگے تھے۔ ستونوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ اندھیری چھت پے جا بجا جالے لٹک رہے تھے کہیں قریب سے ہی چگادڑوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ ستونوں پر مشعلیں آویزاں تھیں۔ میں نے ایک ستون سے مشعل اکھاڑ لی۔ اب میرے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں برہنہ تلوار تھی۔ یہ وہ تلوار تھی جس نے آج سینکڑوں خالموں کا لہو چاٹا تھا مگر پھر بھی پیاسی تھی۔ میرے انتقام کی طرح۔ پیاسی۔ میری دھڑکنوں میں انتقام کے لاوے پھل رہے تھے اور آنکھوں میں نفرت کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ میری نگاہیں بھیڑا کے چار مقدس ہیروں کو تلاش کر رہی تھیں ایک اندھا موڑ مڑتے ہوئے اچانک مری نگاہ ایک جانب اٹھی اور جم کر رہ گئی۔ خدا کی پناہ وہاں۔۔۔۔۔ سینکڑوں کی تعداد میں مردوزن گھنٹوں گھنٹوں پانی میں کھڑے تھے۔ ان سب کی نگاہ جس جانب تھی وہاں ایک بلند چبوترہ تھا۔ سب لوگ بتوں کی طرح ساکت و جامد کھڑے تھے۔ سب لوگوں نے اپنے ہاتھ دعا کی صورت اٹھائے ہوئے تھے۔ مشعل کی روشنی ناکافی تھی میں کسی کا چہرہ بغور نہیں دیکھ پایا تھا۔

میں دبے پاؤ آگے ہوا اور مشعل کی روشنی آگے کر دی۔ کسی نے بھی اپنا رخ میری طرف نہیں پھیرا۔ میں بڑی سے بڑی کسی بھی مصیبت کا مقابلہ کرنے کیلئے بالکل تیار تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور تلوار کا دستہ ہتھیلی میں بیوست ہوتا چلا جا رہا تھا۔ معا ایک منظر میری آنکھوں نے دیکھا اور زمین آسمان نگاہوں میں گھوم گئے۔ رینا۔۔۔۔۔ میری پیاری بہن میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ دعا کی صورت اٹھے ہوئے تھے اور وہ خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر یوں لگتا تھا جیسے ان آنکھوں کے دیئے بجھے ہوئے ہیں۔ یہ کیسا ظلم کیسی فریب کاری تھی۔ رینا میری نگاہوں کے سامنے قتل ہوئی تھی۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں میں زندہ تھا۔ اگر قتل ہونے والی رینا تھی تو میرے سامنے کھڑی لڑکی کون تھی۔ میری آنکھوں میں بے تحاشا آنسو تھے۔ اتنے آنسو جتنے آسمان پر ستارے

تھے۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ میرا وجود زلزلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سکاری کی صورت میرے منہ سے بمشکل نکلا۔ ”رینا۔۔۔۔۔ رینا۔۔۔۔۔ میری بہن۔۔۔۔۔“ اور میں نے آگے بڑھ کے رینا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ کسی بت کی طرح مجھ پر ڈھے گئی میں اس کا وزن نہ سہار سکا اور ہم دونوں گھنٹوں گھنٹوں پانی میں گر گئے۔ اچانک ایک روح فرسا حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی اور میں دوبارہ اس تکلیف سے گزر گیا جو مجھے رینا کے قتل کے وقت اٹھانا پڑی تھی۔ جسے میں رینا سمجھ رہا تھا وہ رینا کا بت تھا۔ پتھر کی سی دھات سے بنا ہوا بت۔۔۔۔۔ اور جس پانی میں۔۔۔۔۔ میں گرا تھا۔ پانی نہیں تھا بلکہ خون کی رواں ندی تھی۔

میں نے رینا کا سر سینے سے لگا لیا اور دھاڑیں مار کے رونے لگا۔ میرے آس پاس کھڑے وہ لوگ زندہ انسان نہیں بلکہ ان کے بت تھے۔ میرے رونے کی آواز اس عجیب و غریب جگہ پر گونج رہی تھی اور پھیل رہی تھی۔ دور چگادڑوں کے چلانے میں بھی شدت آگئی تھی۔ یہ سینکڑوں پتھر کے بت خون کی رواں ندی میں کھڑے تھے اور نامعلوم کتنے عرصے سے کھڑے تھے۔ میں بہت کوشش کر کے خود کو چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ نہیں ہو سکا رونا تھا جو بچکیوں کی گود میں کھیلتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اچانک زنجیروں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور ایک مہربان ہاتھ میرے کندھے پر جم گیا۔ ایک نحیف آواز ابھری۔

”کیوں روتا ہے! بیٹا؟“

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک ضعیف العمر شخص زنجیروں سے بندھا کھڑا تھا۔ اس کی سفید داڑھی سینے تک چلی آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پتہ نہیں مجھے کیوں لگا جیسے یہ شخص میری مدد ضرور کرے گا۔ میں ہلکتے ہوئے بولا۔

”بابا۔۔۔۔۔ یہ میری بہن کا بت ہے۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے بابا۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ نہ بابا۔۔۔۔۔ یہ کیسی اندھیر گمراہی۔۔۔۔۔ کیسا گورکھ دھندہ ہے۔“ اس ضعیف العمر شخص کے نرم اور میٹھے لہجے اور ہاتھوں پیروں میں بیڑیوں نے مجھے حوصلہ بخشا تھا اور میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اس پر سوال داغ دیا تھا۔

وہ ضعیف العمر شخص جس کا نام ”بوکارڈ“ تھا کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو اڑائے تھے۔ وہ لرزتے لہجے میں بولا۔ ”بیٹا! پہلے مجھے تم یہ بتاؤ۔ تم کون ہو۔۔۔۔۔ اور یہاں تک کیسے پہنچے؟“

”بابا۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ بس میں آپ کو اتنا بتا دیتا ہوں۔۔۔۔۔ میں یہاں

پہاڑ توڑ دیئے ان کی سوچوں کو جکڑ لیا۔ پھر بات یہاں تک ختم نہیں ہوئی..... وہ آخری حدوں کو بھی چھونا چاہتا ہے اس کا خیال ہے کہ وہ انسان بنا سکتا ہے۔ اس خونی ندی میں جتنے بت کھڑے تھے نظر آرہے ہیں اسی وجہ سے ہیں۔ ایسا کئی سالوں سے چل رہا ہے۔ بوکاشی ایک زندگی ختم کرتا ہے اس کا سر لاتا ہے اسی طرح کامٹی کا دوسرا چہرہ بناتا ہے۔ پھر اصلی آنکھیں کھوپڑی سے علیحدہ کر کے اس پتھر کے بت میں لگواتا ہے اور ہر اماؤس کی رات اس خون کی بہتی ندی میں بیٹھ کر تمام رات جاپ کرتا ہے۔ ایسا کئی سالوں سے ہو رہا ہے۔ بوکاشی کا خیال ہے بہت جلد ایسا ہوگا کہ اس خون کی ندی میں گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے پتھر، مٹی اور گیندے کے سینک کے سفوف سے بنے ہوئے یہ بت بول اٹھیں گے۔ ان پتھر کے بتوں میں جان پڑ جائے گی۔ پھر یہ جیتے جاگتے انسان صرف بوکاشی کے بندے اور اس کے فرمانبردار ہوں گے۔ اس کے حکم سے بولیں گے اس کے حکم سے چلیں گے۔ اس کے حکم سے کھائیں گے اور اس کے حکم سے سوئیں گے۔

برب وادی اور اس محل کے ایک کونے میں بھی ان بتوں کے چہرے پڑے ہیں۔ بوکاشی کا خیال ہے ان چہروں پر سورج کی کرنیں پڑیں گی تو اس خونی ندی میں کھڑے ہوئے بتوں میں حرکت پیدا ہو جائے گی۔“ بوکارو نے چہرہ نیچے کیا اور ندامت کے آنسوؤں، ہچکیوں کے ساتھ ہہاتا چلا گیا۔

”بابا.....! آپ..... آپ اس سب کو روک بھی تو سکتے تھے۔“  
”نہیں..... نہیں..... بیٹا..... میں..... ایسا نہیں کر سکتا تھا..... پہلے میں دولت کے لالچ میں بوکاشی کا کام کرتا تھا۔ اور دولت کا لالچ صرف معذور بچی کیلئے تھا۔ وہ دونوں پاؤں سے محروم تھی ڈاکٹروں کا کہنا تھا تین لاکھ ڈالر لاؤ تو تمہاری بچی پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال تھا اتنی رقم اکٹھی کر کے گناہ کی اس دنیا سے نکل جاؤں گا مگر..... مجھے کیا خبر تھی کہ میں یہاں سے کبھی نہیں نکل پاؤں گا۔ بوکاشی نہایت شاطر اور تیز رفتار آدمی کا نام ہے۔ اس نے میری معذور بچی اس خفیہ جگہ پر لا بٹھائی۔ اگر میں بوکاشی کے حکم سے سرتابی کرتا تو میری نگاہوں کے سامنے میری بچی کی عزت کی دھجیاں اڑائی جاتی تھیں۔ بیٹا پہلے میں دولت کے حصول کیلئے بوکاشی کا کام کرتا تھا۔ پھر میری مجبوری بن گئی۔“

”بابا..... تم نے اپنی عزت اور جان بچانے کیلئے..... کئی انسانوں کی زندگیاں داؤ پر لگا دیں۔“ میں رنجیدہ لہجے میں بولا تو..... بوکارو پھر سے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا اور ہچکیوں کے درمیان بولا۔

سے بھیڑا کے چار مقدس ہیرے لینے آیا ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت آج میرا رستہ نہیں روک سکتی۔“  
فرط جذبات سے میری آواز کانپ رہی تھی۔

بوکارو نے حیرت آمیز رشک سے میری جانب دیکھا اور سپاہیانہ لہجے میں بولا۔ ”وہ چار ہیرے یہاں سے لے جاؤ گے؟..... اتنی ہمت ہے تم میں.....؟ آگ کے سمندر سے گزرنا پڑے گا تمہیں..... گزر سکو گے.....؟“

”آگ کے ہزار سمندر بھی مجھے آج پار کرنے پڑے تو میں ہیرے لئے بنا یہاں سے واپس نہیں جانے والا۔“ بوکارو گہری نظروں سے ایک ٹک میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کی گہری آنکھوں میں جیسے ولولے کروٹیں لے رہے تھے۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”شاباش لڑکے..... شاباش..... میں تمہارے جذبے، تمہاری بہادری سے خوش ہوا اور اسی بناء پر تمہیں وہ بات بتانے لگا ہوں جو آج تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ اس خبیث مردود بوکاشی پر بڑے دیوتا کا عذاب نازل ہو کر رہے گا۔ ہاں..... وہ وقت آن پہنچا ہے۔ انسان بنانے والے کا دیوتا ناس کر دیں گے۔“

”انسان بنانے والے کا..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا.....؟“ میں حیرت سے بولا۔  
”بیٹا! بوکاشی دیوتا اس دنیا کا سب سے ظالم، سفاک اور غلیظ ترین شخص ہے۔ یہ فحش اور جھوٹا شخص ہے۔ اس کے گل کی ساری جادوئی کارہ گری اور ظلم صرف شعبہ بازی ہے۔ ہاں..... بیٹا یہ صرف میرا تصور ہے۔ میں ہی اس سب کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے ہی زرزوف ایجاد کیا..... میں نے ہی اس گل کا نقشہ کھینچا..... دولت کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ بیٹا..... بوکاشی کے لباس اور آہنی خود سے لے کر گل کا کونا کونا میں نے تیار کیا ہے۔ بوکاشی کے خوابگاہ کی مصنوعی بارش، خوابناک ماحول، گل میں داخل ہونے والے ہر پہلے آدمی کا سر بھاری ہونا، نیند کی سی کیفیت، بوکاشی کے ہاتھ کے اشارے سے گرم پانی کا بے ادبی کرنے والے آدمی پر گرنا..... اور اس جیسے اور بہت سے کمالات میری ذہانت کی کارہ گری کا ثبوت ہیں اور..... اور یہ دیکھو..... مٹی کے یہ بت..... یہ سب میرے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ بوکاشی ایک ایک انسان کا سر لاتا گیا اور مجھ سے مٹی کے یہ بت تیار کرواتا گیا۔ برب وادی کے ایک پُر اسرار علوم کے ماہر نے مرتے وقت بوکاشی سے کہا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ بہت تیز ہے بہت جلد وہ ایک بڑے منصب پر پہنچ جائے گا۔ بوکاشی بڑے منصب پر تو پہنچ گیا مگر اس کی اندر کی درندہ صفی نہیں گئی اس کے دل میں یہ بات سما گئی تھی کہ وہ مہمان ہے..... اور ہمیشہ زندہ رہے گا..... اسی سوچ کے ساتھ اس نے پہلے اس جنگلی دھرتی کے بے کسوں پر مظالم کے

”بیٹا! دیوتا نے مجھے میرے کرموں کی سزا بھی تو دے دی ہے ناں۔ جس معذور بچی کیلئے میں جی رہا تھا وہ مر گئی۔ ہاں..... ہاں وہ مجھ بد نصیب کو اکیلا چھوڑ گئی، آ..... آ میں تجھے دکھاؤں.....“

بوکارو مجھے ایک بت کے پاس لے گیا۔ وہ ایک خوب دلڑکی کا بت تھا اس کی آنکھیں بھی کھلی اور نبھتی ہوئی تھیں۔ بوکارو کہہ رہا تھا..... ”دیکھو..... دیکھو کتنی پیاری بیٹی تھی میری..... اپنے..... اپنے ہاتھوں سے میں نے اس کا خوبصورت چہرہ بنایا ہے..... تمہیں..... تمہیں پتہ ہے بیٹا میں..... مرا کیوں نہیں..... میں صرف اس لئے زندہ تھا کہ کسی طرح بھی ہو میں اس آدمی کی مدد کروں جو بوکاشی کو مارنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔“ بوکارو پتہ نہیں اور کیا کچھ بولنا چاہتا تھا اور میں اپنے آس پاس کھڑے ان پتھر کے بتوں کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ان بتوں میں ایک رینا کا بت تھا اور شاید انہی بتوں میں کہیں بودی کی محبوبہ ”میگی“ کا بت تھا۔ پچھلے سال پُر اسرار قتل ہونے والے تین بندوں کے بت تھے اور نہ جانے کتنے لوگوں کے بت تھے..... ان پُر اسرار قتلوں کے بعد سردھڑ سے غائب پایا جاتا تھا۔ سر کہاں جاتا تھا..... سر یہاں بوکاشی کے اس خونی استھان پر آتا تھا اور پھر اس چہرے کی طرف دیکھ کر تین مٹی کے چہرے بنتے تھے۔ ایک چہرہ اسی خونی ندی میں بہتا تھا ایک چہرہ بوکاشی کے محل کے ساتھ تالاب کے قریب آوڑاں ہوتا تھا اور ایک مٹی کا چہرہ برب وادی میں بہاڑ کی چوٹی پر پے بنے ہوئے بھیڑا میں سجایا جاتا تھا۔ درندگی اور سفاکی کا نہ جانے یہ کون سا درجہ تھا۔ یوں لگتا تھا غصے کی شدت سے میری دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔ میں حلق کے بل چیخا۔

”بابا.....! بھیڑا کے چار ہیرے کہاں ہیں؟“

بوکارو غیر یقینی لگا ہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھریں ہوئی تھیں وہ نہ جانے ندامت کے آنسو تھے یا شکر گزاری کے..... بوکارو آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا پھر نہایت گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”بیٹا! میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں.....“ وہ چند لمحے چپ رہا پھر اک گھونٹ سا بھر کے فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”بیٹا! میری ایک ایک بات غور سے سننا۔ یہ نہ ہو کوئی بات رہ جائے اور تم بعد میں کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ۔ بوکارو اپنا منہ میرے کان کے قریب لایا اور سر گوشی کے لہجے میں بولتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

میرے ہاتھ میں تلوار دبی ہوئی تھی اور اعصاب تنے ہوئے تھے۔ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا تھا۔ میں نے اپنی تمام طاقت اور توجہ ایک نقطے پر مرکوز کر لی تھی۔ میں اس اپنی دروازے کی اوٹ میں کھڑا

تھا جس کے اندر بھیڑا کے چار مقدس ہیرے پڑے ہوئے تھے۔ بوکارو دروازہ کھولنے کیلئے تیار کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی مقدس ہیروں کے رکھوالے خونی بن مانس نے بوکارو پر پل پڑنا تھا۔ اس دوران بوکارو کے کہنے کے مطابق مجھے بن مانس کی عقبی طرف سے حملہ کرنا تھا اور بن مانس کو ختم کرنا تھا۔ بن مانس کے ختم ہوتے ہی مجھے ہیرے لے کر یہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ بوکارو کا یہ کہنا بھی تھا کہ بن مانس کو ختم کرنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے ہیرے حاصل کر کے یہ جگہ چھوڑ دینا یہ نہ ہو کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ میں ابھی سوچوں کے بخور میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ بوکارو نے اپنی گیٹ اٹھا دیا۔ یکا یک ایک جھماکا سا ہوا یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے وہ منظر ہی ایسا دہشت ناک تھا کہ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ کوئی دس ہاتھ اونچا سیاہ رنگ کا بن مانس تھا وہ اتنی برق رفتاری سے باہر نکلا تھا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس نے چھینا مارا تھا اور بوکارو کو اچک لیا تھا۔ میں بڑی تیزی سے اس کی عقبی جانب بڑھا۔ میں ہیرے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بوکارو کو بھی بچانا چاہتا تھا مگر میری دل کی تمناد میں ہی رہ گئی تھی سب کچھ اتنا آنا فانا ہوا کہ میں شپٹا کے رہ گیا۔ بوکارو کا جسم دو حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔

اپنی معذور بچی کے مستقبل کے حسین خواب دیکھنے والا اور بوکاشی کی سلطنت کا سارا نقشہ کھینچنے والا تیز رفتار دماغ ابدی نیند سوچکا تھا۔ میں نے بن مانس کی پشت پر کاری والہ کرنا چاہا مگر میرا تلوار والا ہاتھ اوپر کا اوپر رہ گیا۔ بن مانس تیزی سے گھوما اس کا ہاتھ اس زور سے میرے کندھے پر لگا کر میں باقاعدہ ہوا میں اچھلتا ہوا دور جا کر میری تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر خونی ندی میں کہیں گر گئی۔ وہی خونی ندی جس میں پانی کے ساتھ ساتھ انسانی خون بہتا تھا۔ اب میں نہتا تھا اور بن مانس میری جانب بڑھ رہا تھا میں پلک جھپکنے میں اٹھا اور خونی ندی میں داخل ہو گیا۔ بن مانس بڑی سرعت سے میری جانب لپکا۔ اس کی لپک بہت خوفناک تھی۔

وہ دس ہاتھ اونچی چیخنی چنگھاڑتی موت تھی جو میری طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ بن مانس کے ہاتھوں بوکارو کے ہونے والے حشر میں ابھی چند لمحے پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ہر سو نیم تیرگی تھی ایک طرف وحشی بن مانس کا شور اور غراہٹیں تھیں ایک طرف پانی کا شور تو ایک طرف چوگاڈوں کی منحوس آوازیں تھیں۔ میں خونی ندی میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ میرے آس پاس ہر سو پتھر کے بت کھڑے تھے ان پتھر کے چہروں میں اصلی انسانی آنکھیں چمک رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا یہ ساری انسانی آنکھیں مجھ پر قہقہے کس رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں بوکاشی کو نیست و نابود کرنے کا خیال دل سے

نکال دو۔ تم بھی ہماری طرح مارے جاؤ گے۔

میں ان پتھر کی موتیوں میں بھاگا چلا جا رہا تھا اور دیو بیکل بن مانس وحشیانہ انداز میں پتھر کے ان انسانوں کو توڑتا، پھوڑتا، روندتا اور بکھیرتا چلا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرے سر پر پہنچ گیا۔ میری ایک ٹانگ اس کے ہاتھ میں آگئی اس نے مجھے بکڑا اور بے دردی سے گھما کر پھینک دیا۔ میں بیک وقت کئی پتھر کی موتیوں کے ساتھ ٹکرایا اور زخموں سے چور ہو کر خونی ندی میں غوطے کھانے لگا۔ پانی کے اندر ہی ایک جگہ مجھے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر پانی سے باہر نکالا تو بن مانس میرے سر پر کھڑا تھا ابھی میں اٹنے پاؤں پیچھے ہٹنے ہی لگا تھا کہ ایک بار پھر میں اس بدبودار جسم کی گرفت میں چلا گیا اس نے مجھے گھما کر پھینکا تو میں بہت دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ بن مانس ایک بار پھر سے میری طرف بڑھا۔ مجھے خوب علم تھا کہ یہ میرے آخری امتحان کی گھڑی ہے اگر میں ناکام ہو گیا تو دردناک موت میرا مقدر ٹھہرے گی۔ میں اپنے سینے میں دلوں کی ایک بلند لہر لئے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران بن مانس میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں پتھر کے بت کا ٹوٹی ہوا بازو آچکا تھا۔

میں بڑی تیزی سے سوچ چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ بن مانس نے آگے بڑھ کے جونہی مجھے ہانہوں میں جکڑا میں نے بازوؤں کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے پتھر کا ٹوٹا ہوا نوکدار بازو بن مانس کی دہائی آنکھ میں گھونپ دیا۔ پتھر کا نوکدار بازو تقریباً ڈیڑھ فٹ تک آنکھ کے اندر تک گھستا چلا گیا۔ خون کے ایک فوارے نے مجھے سرتا پارنگین کر دیا۔ بن مانس نے چنگھاڑتے ہوئے مجھے چھوڑا اور پشت کے بل خونی ندی میں گر گیا۔ وہ دیو بیکل وجود کئی پتھر کی موتیوں کو لیتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ اس کے گرنے سے پتھر کے کئی ٹکڑے اور پانی کا بلند دھارا دور دور تک پھیل گیا۔ مجھے ایک ہتھیار کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ بلا اتنی جلدی میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ میں دیوانوں کی طرح چاروں طرف چکرانے لگا۔ میری تلوار ندی کے اندھیرے پیندے میں کہیں پڑی تھی۔ ہو سکتا تھا تلوار جہاں گری تھی وہیں کہیں آس پاس ہی پڑی ہو میں اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی بہت سرعت سے ندی کے اس جانب بڑھا۔ ٹھیک وہ لمحہ تھا جب مجھے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بلند ستون گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بلند چھت کے ایک کونے سے پتھر ہلنے اور لڑھکنے لگے۔ معا ایک خیال ذہن میں بجلی کی طرح کوند اور میں دم بخود رہ گیا۔ بوکارو نے کہا تھا کہ بن مانس کو ختم کرنے کے بعد ہیرے لے کر فوراً اس جگہ کو چھوڑ دینا یہ نہ ہو

کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ تو کیا وحشی بن مانس مر چکا تھا۔ کیا..... کیا یہ سب اتنا اچانک اور آنا فانا ہو چکا تھا۔ میں جاننے کیلئے آگے بڑھا تو تصدیق ہو گئی۔ بن مانس جن پتھر کی موتیوں پر گرا تھا ان میں سے ایک تیز دھا اور نوکیلے پتھر نے اس کا سر پاش پاش کر ڈالا تھا۔ اس کا گڑھا لہوندی کے خون رنگ پانی میں ملتا جا رہا تھا۔ میں ابھی اسی منظر میں کھویا ہوا تھا کہ ایک بلند ستون سے تقریباً چار گز کی دوری پر آکر میرے بالکل سامنے گرا۔

میں تیزی سے اسی پاؤں واپس پلٹا۔ میرا رخ اب اس جانب تھا جہاں بھیڑا کے چار مقدس ہیرے پڑے تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو وہاں چاندی کی ایک خوبصورت تپائی پڑی تھی جس پر سونے کا ایک بڑا تھال پڑا تھا۔ چاروں ہیرے اس میں پڑے جگمگا رہے تھے۔ میں نے ہیرے ہاتھ میں لئے تو آپوں آپ ہی ایک خوشی ایک نامانوس سی توانائی نے میری آنکھوں کے گوشے بھگو دیئے۔ باہر بلند ستون گر رہے تھے اور بڑے بڑے پتھر لڑھکنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں نے وہ قیمتی ہیرے جسم کے ساتھ باندھے اور باہر نکلتا چلا گیا۔

میرا رخ اب ان سیڑھیوں کی جانب تھا جو بھیڑا کے غلیظ ترین تالاب کے پیندے میں اترتی تھیں۔ میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے اندھا دھند بھاگا چلا جا رہا تھا۔ میرے آس پاس پتھر گر رہے تھے۔ بڑے بڑے گرنے ہوئے ستونوں نے کئی جگہ میرا رستہ روکا مگر میں ان رکاوٹوں کو پھلانگتا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ بہت جلد میں سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ابھی میں نے آدھی سیڑھیاں عبور کی تھیں کہ ایک خوفناک اور کلیجہ لرزادینے والے منظر نے میرے قدم جکڑ لئے۔ ہزاروں کی تعداد میں جیتی چنگاڑتی بڑی بڑی چمگاڑیں میری جانب بڑھی آ رہی تھیں وہ تعداد میں اتنی تھیں کہ سیڑھیاں پوری کی پوری بھر گئی تھیں۔ بیک وقت کتنی ہی تعداد میں چمگاڑیں تھیں جنہوں نے میرے جسم کو جکڑ لیا۔ آخری لمحے مجھے ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا اور میں نے آخری بچ جانے والی آٹھ دس سیڑھیاں اترنے کی بجائے ہوا میں جست کی۔ میرے دونوں ہاتھ اس انداز میں آگے کو بڑھے ہوئے تھے کہ وہ سیدھے پتھر پرے جا کر لگیں اور پتھر کا دروازہ خوب دھکھل جائے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ جو میں نے سوچا ویسا ہی ہوا۔ میرے ہاتھوں کے دباؤ سے دروازہ کھل گیا اور میں سیدھا بھیڑا کے غلیظ ترین تالاب کے پیندے سے جا لگا۔ پانی میں پہنچتے ہی تمام چمگاڑیں میرے جسم سے علیحدہ ہو گئیں۔ میں ہاتھ مارتا ہوا اگلے ہی لمحے سطح آب پر آ گیا۔

میں تیزی سے تالاب سے باہر آیا اور باہر کی طرف بھاگ نکلا۔ ہیرے لے کر جس وقت میں



ایک زوردار ٹھوکر مار کر اسے نیچے گرایا اور اس کا خود اتار دیا۔

خود کے نیچے سے جو چہرہ نکلا اس نے سب کو ششدر کر دیا۔ وہ کوئی اور نہیں سردار رواؤ تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا شاید کسی کو بھی نہیں آ رہا تھا۔ سنسنی کی ایک لہر تھی جو ہر طرف دوڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور سردار رواؤ کی کھوپڑی میں پیوست ہو گیا۔ اس نے دو چار جھٹکے کھائے اور ساکت ہو گیا۔ لوگ آگے بڑھے اور اس کی لاش کا تیا پانچہ کر دیا۔ اس کا ہنسی لباس اتار دیا گیا جس کے نیچے سے اس کا اصل جسم نکل آیا جس پر بلٹ پروف جیکٹ تھی۔ سب لوگ دیوانگی کے عالم میں اچھل کود کر رہے تھے کہ بوکاشی دیوتا مارا گیا مگر نہیں بوکاشی دیوتا زندہ تھا..... بوکاشی دیوتا کے ہنسی لباس میں چھپا ہوا سردار رواؤ اس کا قائم مقام تھا جس وقت بوکاشی دیوتا بستی کے چکر لگا رہا ہوتا تھا سردار رواؤ بوکاشی کا قائم مقام بن کر ہنسی لباس میں رہتا تھا۔ محترم زو با سار مجھے سب بتا گئے تھے۔ میں بوکاشی دیوتا سے اچھی طرح واقف تھا۔ میری نگاہیں بے چینی سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور سینے کی گھٹن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر بوکاشی دیوتا یہاں سے بھاگ نکلتا تو میں انتقام کی تفتیش میں گھٹ کر مر جاتا۔ میری نگاہیں تمام لشکریوں کا طواف کر رہی تھیں معا میری نگاہ ایک بندے پر جم کر رہ گئی۔ ہاں..... وہ وہی تھا اور کوئی نہیں تھا وہ اس جنگلی دھرتی کا مکروہ ترین چہرہ تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہنسی اعصابا ہوا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا اس کے کھچڑی بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور منہ کا خلا بھیا تک منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا بوگا لے عرف بوکاشی دیوتا تھا۔ بوگا لے جو میری کمر پر موجود تین تلوں کے بارے میں جانتا تھا، جو رابعہ کی پیر کی انگلی کے چٹکی طرف بنے تلوں کا حال جانتا تھا اور پتہ نہیں کیا کچھ جانتا تھا وہ اس کائنات کا رذیل ترین شخص تھا۔ وہ مجھے کے درمیان کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ میں تلوار مضبوط کی، سختی سے جڑے بھینچے اور اس خبیث ترین انسان کی طرف بھاگ نکلا۔ جلد ہی میں نے اسے جالیا۔ شاید وہ مجھ کو اپنی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے بڑی پھرتی سے اپنا اعصابا سیدھا کیا کہ میں اپنا بچاؤ نہ کر سکا اعصابا کی تیز نوک میرے بازو میں اترتی چلی گئی۔ یکدم مجھے میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ سپاہی بوگا لے کو قتل کرنا چاہتے تھے مگر میں نے سختی سے انہیں منع کر دیا اور بوگا لے سے بھڑ گیا۔ میری تلوار کے طوفانی واروں نے بہت جلد اس کا ہنسی اعصابا ہوا میں اڑا دیا۔ وہ نہتا ہوا تو میں نے اپنی تلوار پھینک دی اور ہاتھوں سے اس کے ساتھ لڑنے لگا۔

یہ وہ شخص تھا جو میری پیاری بہن رینا کا قاتل تھا۔ میکی، پوبا شے، انگلی ہیری کرس اور سردار

محل کی برج پر چڑھا اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہت خون خرابہ ہو چکا ہوا تھا۔ ہر طرف آگ دھواں اور لاشیں تھیں۔ میں نے محل کی بلند برجی پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں یہ اعلان کیا کہ ”ہیرے میرے قبضے میں آچکے ہیں اور میں تم سب لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ ہتھیار پھینک دو..... خون خرابہ بند کر دو..... ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔“ میری آواز میدان جنگ کے طول و عرض میں پھیلتی چلی گئی۔ چلتی تلواریں رک گئیں بڑھتے قدم تھم گئے۔ ایک لمحے کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی۔ بہت سے لوگوں کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اتنی دیر میں سردار بابا کو تلوار لئے کالی فوج کے ایک سالار کا سر لہراتا ہوا برجی پہ آ گیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تہمتار ہا تھا اس نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا پورے لشکر میں خوشی اور شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لشکر کی خوشی کے نعرے لگانے لگے اور تلواریں ہوا میں لہرا کر اپنی مسرت کا اظہار کرنے لگے۔ برجی پر میرے اور سردار بابا کو کے علاوہ بوکاشی کی گیارہ عدد بیویاں بھی موجود تھیں۔ بابا کو نے ہیرے مجھ سے لے کر اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ برجی سے اتر کر جب ہم لوگ محل کے وسیع احاطے میں پہنچے تو سپاہی فاتحانہ نعرے لگاتے ہوئے محل میں داخل ہونے لگے۔ تبھی اچانک ایک اندرونی کمرے سے بوکاشی وارد ہوا اور اس نے مجھ کو دو بوج لیا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ مجھ سے چچا کرمانی کرنے والا بوکاشی دیوتا خود ہے۔ میں گھوم کر اس کے دباؤ سے نکلا اور تلوار سونت کر اس کے مقابلے میں آ گیا۔ بہت سے سپاہی آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر میں نے سب کو منع کر دیا۔ میں اکیلا اس سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔ لوہے سے لوہا ٹکرانے لگا۔ بوکاشی پورا کا پورا آہن میں غرق تھا اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ بوکاشی پر تلوار سے وار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ تلوار اس کے جسم پر لگنے کے بعد پانی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہ کسی طلسمی طاقت کا کرشمہ نہیں تھا بلکہ یہ اس کیمیکل کا کمال تھا جو اس کے وجود پر چڑھے ہنسی خود کے اندر موجود تھا۔ میں بوکاشی پر ضرب لگانا نہیں چاہتا تھا بلکہ صرف اس کی تلوار گرانا چاہتا تھا۔ اس کی تلوار گرانے سے پہلے ایک عجیب کام ہوا شاہنواز مجھے سے نکلا اور مجھ پر پل پڑا۔ اگر ایک لمحے کی چوک ہو جاتی تو اس کی تلوار میرا کام تمام کر چکی ہوتی۔ میں نے اپنا پہلو بچایا اور پھر میری تلوار حیرت انگیز تیزی سے گھومی اور شاہنواز کی پشت پہ لگتی ہوئی سینے سے باہر نکل آئی۔ رابعہ مجھ سے چند گز کی دوری پر کھڑی تھی اس کے منہ سے ایک ہنگامی نکلی اور وہ سکتے کی حالت میں چلی گئی۔

یہ ایک ایسا منظر تھا جس نے میرے جسم کے روئیں روئیں کو اذیت کے سپرد کر دیا۔ میں بے پناہ طیش کے عالم میں تلوار چلاتا ہوا بوکاشی پر پل پڑا۔ حیرت انگیز تیزی سے میں نے اس کی تلوار گرانی

”بوکاشی! اپنے جتنے دیوتاؤں کو آواز دینا چاہتے ہو دے لو..... میں تمہیں قتل کرنے لگا ہوں..... اگر کسی کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو تو بلا لو.....“ بوکاشی تھر تھر کانپ رہا تھا اور میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر کھڑا کیا ہوا تھا۔

وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ”ا..... ایلٹی نیوز..... مم..... مجھے معاف کر دو..... مم..... مجھے چھوڑ دو.....“ میرے ذہن میں پتہ نہیں کیا آئی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر میرے قدموں میں پڑا تھا۔

میں اس زور سے چلایا کہ تمام مجھے نے میری آواز سنی۔ میں نے کہا۔ ”بوکاشی بول! ان لوگوں کو بتا تو کیا ہے..... اگر تو نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ تو دھوکا فریب ہے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“ بوکاشی نے حیرت سے پہلے میری جانب دیکھا اور پھر وہ اونچی آواز میں فر فر بولتا چلا گیا۔ وہ اپنے تمام طلسمی رازوں سے پردہ اٹھاتا چلا گیا۔ اس نے اپنی زبانی وہ سب کچھ لوگوں کو بتایا جو میں نے دیکھا تھا اور جو میں سب لوگوں کو بتاتا تو کوئی میری بات کا یقین نہ کرتا..... وہ اپنے تمام کروت بیان کر چکا تو میں گر جئے ہونے لگا۔

”بوکاشی! بول تو گھوڑے کی بید میں ریگنے والا گندہ کیڑا ہے۔“  
بوکاشی یہ سب بھی فر فر بولتا چلا گیا۔

میری آنکھوں سے آنسو گرتے چلے گئے۔ سارا مجمع حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کسی کو اپنی ساعت اور بصارت پر یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہ وہی بوکاشی دیوتا تھا جو کل تک اونچی مندر پر بیٹھ کر لوگوں کی سوچوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ آج دیوانوں کی سی حالت میں خون اور مٹی سے لتھڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ میں نے بازو سے پکڑ کر بوکاشی کو اٹھایا اور اس کا اعصاب اس کے ہاتھ میں تھما دیا پھر میں گر جئے ہونے لگا۔

”بوکاشی! جا تو آزاد ہے..... ہم تیری آزادی کا پروانہ جاری کرتے ہیں۔“ بوکاشی نے حیرت اور بے یقینی سی کیفیت سے میری جانب دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں آگے بڑھا بوکاشی کے ہاتھ سے اس کا اعصاب چھینا اور پوری قوت سے اس کے پیر پے دے مارا۔ اعصاب پاؤں سے آر پار ہو گیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

میں حلق کے بل چیخا۔ ”کتے! اسی طرح تو نے میری پیاری بہن رینا کے نازک پاؤں پر یہی اعصاب مارا تھا ناں..... دیکھ آج وہی اعصاب ہے مگر پیر آج تیرا ہے۔ میں نے تجھے اسی دن کہا تھا کہ مجھے

روبان کا قاتل تھا۔ اس کا ایک بازو کٹا ہوا تھا جو بڑے میدان میں نے ہی ایک دن کاٹا تھا۔ چند منٹوں کی لڑائی میں ہی میں نے اس کا سارا دم خم نکال باہر کیا۔ اس کی دہائی آنکھ پھوٹ گئی، ایک جبرائیل ٹوٹ گیا۔ معا بوکاشی نے ایک سپاہی کی تلوار پیچ لی اور تن کے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار جوگی صورت بندوں نے بوکاشی کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ گہروے رنگ کے لمبے چنے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی لمبی سفید داڑھیاں سینے سے نیچے تک چلی گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں انہوں نے ہاتھوں میں لمبی لمبی مالاں تھام رکھی تھیں ان میں سے ایک چیخ مارتے ہوئے بولا۔

”مورکھ..... دفع ہو جا یہاں سے..... تو..... تو جانتا ہے۔ اگر..... اگر تو نے اس مہمان دیوتا کی جان لینے کی کوشش کی تو..... سب نشت ہو جائیں گے۔ دیوتا اس جنگلی دھرتی کو الٹا دیں گے۔ ایک انسان بھی یہاں زندہ نہیں بچے گا۔“ ایک چپ ہوا تو دوسرا غرایا۔

”لوگو!..... اس باہر کے آدمی کو قتل کر ڈالو..... اگر اس نے تمہارے مہمان دیوتا بوکاشی کو مار ڈالا تو یہیں کھڑے کھڑے زمین الٹ جائے گی اور سب فنا ہو جائیں گے۔“ دوسرا چپ ہوا تو تیسرا جوگی اپنی بکواس کرنے لگا۔

لوگوں میں بچے میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ پورے مجمعے سے بیک وقت بہت سی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ میں نے اپنی گری ہوئی تلوار اٹھائی اور بڑی سرعت سے آگے بڑھا۔ جوگی اس بات سے بے خبر تھے کہ میں ان کے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میری تلوار صاعقہ کی طرح چمکی اور ایک جوگی کا سرتن سے جدا ہو گیا۔ دوسرا اور دوسرے جوگی کی پشت پے لگا اور پیٹ سے تلوار باہر آ گئی۔ تلوار کا تیسرا اور تیسرے جوگی کے سر پے لگا اور اس کا سر دو حصوں میں بٹ گیا۔ چوتھا جوگی اپنی جان بچا کر ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ اس دوران بوکاشی غیض و غضب کی تمام حدیں پھلانگ کر مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنے مختصر وقت میں ہوا تھا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میرے ایک طوفانی وار نے بوکاشی کی ٹانگ گھٹنے کے پاس سے کاٹ ڈالی۔ مجمعے میں..... ایک شور بلند ہو چکا تھا۔ ضعیف العقیدہ لوگ گھبرا کر بوکاشی کے حق میں نعرہ زنی کرنے لگے تھے۔ لوگوں کا ایک ریلہ ہماری طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر سردار ببا کو اور بالی پوری فوج کے ساتھ ان کے سامنے بند باندھے کھڑے تھے۔ بوکاشی نیچے گر چکا تھا اور میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ جب اچھی طرح دل کی بھڑاس نکال چکا تو میں نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا اور غراتے ہوئے بولا۔

مارڈال نہیں تو میں تیری سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ دیکھ بوکاشی آج..... آج میں نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا ہے۔ تو نے رینا کی آزادی کا بھی پروانہ جاری کیا تھا۔ آج میں نے بالکل اسی طرح تیری آزادی کا پروانہ جاری کر دیا ہے۔“

بوگا لے اعصا پاؤں سے نکالنے کیلئے جھکا تو میں نے ایک گری ہوئی تلوار اٹھائی اور بوگا لے کا سرتن سے جدا کر دیا۔ بالوں بھرا سر لڑھکتا ہوا عین رابعہ کے قدموں میں جا گرا۔ میں بوگا لے کے سر پریدہ لاشے پر مسلسل تلوار چلاتا جا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ ”بوکاشی دیوتا! دیکھ میں نے تجھے کہا تھا ناں تو ہزار پردوں میں بھی چھپ جائے تو بھی میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔“ میری مسلسل چلتی تلوار اس کی لاش میں سے گوشت کے چیتھڑے اڑانے لگی تو بیا کونے آگے بڑھ کے میرا ہاتھ روکا اور بھیکے لہجے میں بولا۔

”بس کرو جوان تم نے..... اس دھرتی پے چھائی غلبت کی رات ختم کر دی ہے اٹھو..... اٹھو اور دیکھو یہ تمہارے سامنے موجود چہرے کتنے خوش اور زندگی کی حسین مسکراہٹ سے بھرے ہیں۔“

میں نے نگاہ اٹھائی تو ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ بلی گوریلے، بلی قبیلے کے لوگ، سفید چمڑی والے اور کالی فوج کے جنگجو سب کے چہروں سے زندگی کی لطافت سے مزین مسکراہٹ تھی۔ یہ زبان خاموشی جیسے وہ سب کہہ رہے تھے۔ ”ہمیں ایک مسلسل کرب سے آزاد کرانے والے اجنبی تمہیں سلام.....“ میں زخموں سے چور گھٹنا ٹیک کر زمین سے اٹھا تو سینکڑوں جوانوں نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور خوشی کے ترانے گارہے تھے۔ ایک جانب سے کالی فوج کا ایک جوان آگے بڑھا۔ اس کے نیزے پر جم کینٹی کا سر جھول رہا تھا وہ پکارتے ہوئے بولا۔

”علی بھائی جان آپ نے مجھے پہچانا؟“ میں حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ بول اٹھا۔ ”علی بھائی میں آپ کا چھوٹا بھائی بودی ہوں بودی..... آپ کا یہ بھائی سیلاب میں ڈوب گیا تھا“ مرا نہیں تھا..... یہ بھلا اپنی میگی کے قاتل کو مارے بغیر کیسے مر سکتا تھا۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی۔ میں خوشی سے لرزتا ہوا نیچے اتر آیا اور میں نے بودی کو خود سے لگا لیا۔ اس خوشی میں ایک اور خوشی آنا فنا شامل ہو گئی۔ بلی مسرت میں ڈوبا ہوا ساسا کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ ساسا کی گود میں ایک گول منول بچہ تھا میرے حیران ہونے سے پہلے ہی ساسا نے مجھے بتا دیا کہ اس کا بچہ زندہ تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اسے کہاں سے ملا تو وہ رودی اور پھر کہنے لگی۔

”علی نواز! یہ پر بت پار سے آنے والے بلی قبیلے کے لوگوں کے ساتھ تھا۔ میں نے بلی قبیلے

کی ایک عورت کی گود میں اسے دیکھا تو دیوانی ہو گئی۔ میرے بچے نے مجھے پہچان لیا اور اس عورت نے بغیر کسی عذر کے بچہ مجھے تھما دیا۔“ بچہ ملنے کی وجہ سے ساسا بالکل ٹھیک ہو گئی تھی اب تو اس کے دامن میں دو دو خوشیاں تھیں۔ اس کی تیس مہینوں کی تلاش لا حاصل نہیں رہی تھی اسے اس کا خاوند واپس مل چکا تھا اور یوں لگتا تھا پھولوں تلیوں اور بہاروں کے موسم پھر سے شروع ہونے والے ہیں۔ میں ان دونوں کو دیکھ کر اتنا خوش تھا کہ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے۔ مگر میری اپنی دل کی دنیا بے آباد اور خزاں رسیدہ ہو چکی تھی۔ یہ ایسا اجڑا نخلستان تھا جس پر محبت کا جتنا پانی بھی گرتا اسے شر آور نہیں ہوتا تھا۔ جب دل کا دیا ہی بجھ گیا تھا تو تمنا کیسی اور انتظار کیسا.....

میری پیاری بہن رینا پیش بین تھی اس نے کہا تھا۔ ”علی نواز! رابعہ کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو..... وہ تمہاری قسمت میں..... نہیں ہے..... بلکہ وہ کسی کی بھی قسمت میں نہیں ہے۔“ دو آنسو میرے رخساروں پر پھسلے اور پتھریلی زمین میں جذب ہو گئے۔ اچانک ایک جانب سے کسی نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں نے وہاں دیکھا تو رابعہ زمین پر بیٹھی تھی اور اس کی گود میں انکل مڈر کا سر تھا۔ میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا انکل مڈر آخری سانس گن رہے تھے۔ رابعہ زار و قطار رو رہی تھی۔ انکل مڈر نے انکل ایک کر کہا۔

”علی بیٹا! رابعہ کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانا۔ اس کا میرے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے.....“ اتنے الفاظ انکل کے منہ سے نکلے اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ مجھ پر ایک ایسے پہاڑ کا بوجھ لاد گئے جو میری طاقت سے بہت بھاری تھا۔ میں اس غم میں روتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

وہاں اس عجیب و غریب وادی سے ہماری واپسی تیسرے دن ہوئی۔ وقت رخصت سب لوگ وہاں موجود تھے۔ سردار ببا کو جنگلی دھرتی کا سب سے بڑا سردار بنا دیا گیا تھا۔ بیلہ اس کی نائب تھی۔ بلی بھی..... بلی سے سردار بالی بن گیا تھا۔ وقت رخصت ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جب ہم کشتی پر سوار ہونے لگے تو لیزا بھاگی ہوئی آئی اور اس نے ایک سفید پھول مجھے تھما دیا اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لئے واپس پلٹ گئی۔ یہ وہی لیزا تھی جو اس وادی میں وارد ہوتے ہی تیرہ دن ایک مکان میں میرے ساتھ رہی تھی یہ سنہرے بالوں والی انگریز لڑکی تھی۔ وہ چلی گئی تو میں حیرت سے پھول تکتا رہ گیا۔ کشتی کا ملاح مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ پھول اسے دیا جاتا ہے جس سے سب سے زیادہ پیار کیا جائے۔“

سے تھی۔

”نوئی! میں آج تمہارے گھر سے جا رہی ہوں۔ ایک دن خالہ کے گھر رہوں گی پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پاکستان چھوڑ جاؤں گی۔ میں تم سے معافی نہیں مانگوں گی کیونکہ خود کو معافی کا حقدار نہیں سمجھتی۔ نوئی میں نے تم کو پل پل کانٹوں پر گھسیٹا۔ ایک ایک لمحہ تمہارے پیار کا امتحان لیا۔ جو تم نے کہا میں نے اس کے الٹ کیا۔ میں نے شاہنواز سے پیار کیا، تم سے بے رخی اختیار کی۔ تم نے اپنے پیار کی قسم دی کہ میں بوکاشی دیوتا سے شادی نہیں کروں مگر میں نے وہ بھی کیا۔ میں..... میں بہت بری ہوں..... نوئی..... مگر نوئی..... میں نے جو کچھ کیا خدا کی قسم! صرف اور صرف تمہارے لئے کیا..... نوئی میں بہت چھوٹی تھی جب میری ماں اس دنیا سے چلی گئی۔ میں جان ہی نہ سکی ماں کا پیار کیسا ہوتا

ہے۔ ایک باپ ہی باپ تھا جو مجھ سے بڑا پیار کرتا تھا مگر پھر بھی پیہ نہیں کیوں مجھے کسی کی محسوس ہوتی تھی جیسے..... جیسے میں غیر محفوظ ہوں۔

میری یہ کمی تم نے پوری کی۔ بہت چھوٹی عمر میں تم میری زندگی میں چلے آئے۔ شاہنواز مجھ سے بڑا تھا اور میں ہمیشہ ہی اس سے خوفزدہ رہتی تھی۔ وہ میرا کوئی کھلونا چھینتا تھا تو میں پیروں روتی رہتی تھی اس وقت صرف تم ہی میری مدد کیا کرتے تھے۔ میرے اس چھوٹے سے ذہن میں اس وقت تمہارا بہت بڑا مقام بن چکا تھا۔ کوئی پریشانی کوئی دکھ ہوا کرتا تھا تو میں تمہاری میں بھی تمہیں یاد کیا کرتی تھی۔ نوئی! تم سوچ بھی نہیں سکتے میرے دل میں تمہارے لئے کیسے جذبات تھے پھر ایک دن یوں ہوا کہ ہم لوگ زمبابوے شفٹ کر گئے۔ میری دل کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں نے لمحہ لمحہ، پل پل تمہارا انتظار کیا۔ کوئی رات ایسی نہ گزری جب میں نے تمہیں یاد کر کے آنسو نہ بہائے ہوں۔ کوئی دن ایسا نہ گزرا جب تمہاری سوچ نے میرے دل میں نشتر نہ اتارے ہوں۔ نوئی..... شاہنواز انسان نہیں درندہ تھا وہ اوپر سے جتنا نرم نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی خونخوار تھا، اس کا خوف بچپن سے میرے ذہن پے سوار تھا۔ جوانی کی دہلیز پر پہنچنے تک یہ خوف شدید تر ہو گیا تھا۔ میرے خوف کا یہ عالم تھا کہ شاہنواز جو جو کہتا تھا میں وہ کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ میں تم سے شدید ترین محبت کرنے کے باوجود جو جو کرتی تھی صرف شاہنواز کے بے تحاشا خوف کی وجہ سے کرتی تھی وہ..... وہ کہتا تھا..... اگر تم میری بات نہ مانو گی تو میں..... علی نواز کو قتل کر ڈالوں

اس کی بات سن کر میں حیران رہ گیا۔ کشتی میں میرے علاوہ رابعہ اور بودی سوار تھے۔ بحیرہ ہند میں ہمارا وہ سفر تقریباً چار پہر جاری رہا۔ ہم جزیرہ مدغاسکر کے قریب سے ہوتے ہوئے واپس زمبابوے پہنچے۔ زمبابوے پہنچنے کے پانچویں دن ہم دونوں پاکستان کیلئے روانہ ہو گئے۔ سارے راستے میری رابعہ سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ مجھے یوں لگتا تھا رابعہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر مجھے اس کی کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ طویل سفر کے بعد ہم اپنے پیارے وطن پاکستان کی پھڑی ہوئی دھرتی سے ملے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ لاہور پہنچ کر میں اچانک گھر میں داخل ہوا تو سب لوگ بھونچکے رہ گئے۔ پھر باتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ماں تو خوشی سے تقریباً دو پہر روتی رہی تھی۔ وہ بار بار میرا ہاتھ چومتی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ اس کی خوشی دو چند ہو گئی تھی۔ اس کی سوچ کے مطابق اس کا بیٹا بھی آ گیا تھا اور بہو بھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا شاید اب کبھی نہ ہو سکے۔ رابعہ تقریباً اس گھر میں ایک ہفتہ قیام پذیر رہی۔ نہ کبھی میرا اس سے سامنا ہوا اور نہ کبھی میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔

ایک دن میں دوستوں سے مل کر گھر پہنچا تو مجھے پتہ لگا کہ رابعہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔ ایک ہلکی سی ٹیس نے دل میں سر اٹھایا پھر معدوم ہو گئی۔ میرے دل کو ایک طرح سے قرار آ گیا۔ اب میں ماں سے کہہ سکتا تھا کہ وہ میری دلہن تلاش کرے۔

وہ بڑا ہی ابر آور دون تھا میں شام کو جلد گھر لوٹ آیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا آج رشتے کے متعلق ماں سے بات کروں گا۔ میں کھانا کھا کر کمرے میں کچھ دیر کے لئے لیٹ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد ماں کے پاس پہنچ گیا اس نے محبت سے میرا ہاتھ چوما اور میرا سراپنی گود میں رکھ لیا۔

”ماں! میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں.....“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ”ہاں بول بیٹا! مگر پہلے یہ بتا رابعہ اپنے عزیزوں سے ملنے گئی ہے وہ کب تک لوٹے گی؟“ ماں چہرے پے مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ رابعہ چند دن کیلئے گئی ہے اور واپس لوٹ آئے گی۔ میں نے بات کا رخ موڑ دیا اور ماں سے اور باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں میرے کمرے میں فون کی بیل ہوئی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے فون اٹھایا تو وہ میرے سب سے قریبی دوست عمیر کا فون تھا۔ وہ مجھ سے ایک دوسرے دوست کا فون نمبر پوچھنا چاہ رہا تھا میں نے ساتھ پڑی تپائی کا دراز کھولا اور فون بک ڈھونڈنے لگا۔ فون بک تو نہ ملی تبھی کیا ہوا ایک بڑا کاغذ ضرور ہاتھ آیا۔ کاغذ کی تہہ کھولی تو وہ رابعہ کا خط تھا اس پر ٹیڑھے میٹرھے الفاظ میں جو تحریر لکھی تھی وہ کچھ اس طرح

گا..... نوئی اگر شاہنواز تمہاری زندگی کے عوض مجھے تمہارے منہ پر تھوکنے کیلئے بھی کہتا تو یہ میں کر گزرتی کیونکہ..... کیونکہ نوئی مجھے تمہاری زندگی سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ اسی زندگی کو بچانے کیلئے ہی میں نے بوکاشی دیوتا سے شادی کی۔ اس سے شادی کرتے وقت میری شرط تھی کہ تمہیں زر زوف کی سزا سے چھکارا مل جائے گا۔

نوئی تم ہی بتاؤ کہ تمہاری زندگی بچانے کیلئے میں اور کیا کرتی؟ نوئی میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا..... کوئی بھی نہیں..... میرے دل پے اتنا غم اور اتنا بوجھ ہے کہ برداشت سے باہر ہے۔ شاید میری ماں زندہ ہوتی تو میں اسے اپنا دکھڑا سنا کر اپنا غم ہلکا کر لیتی۔ مگر میرے غم کی تو کہانی بھی سننے والا کوئی نہیں ہے۔ تمہاری بے رخی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی اس لئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تمہاری یہ دنیا، تمہارا شہر، یہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہوں۔

نوئی دو دفعہ میں تم سے محبت کا اظہار کر چکی ہوں۔ تم ذہن پر زور دو گے تو تمہیں یاد آجائے گا۔ ایک دفعہ کیمبرو کے جنگل میں اور دوسری دفعہ آبشار میں بہتے ہوئے جب تم نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میری پیشانی پے لگنے والا زخم تمہیں بچاتے ہوئے لگا تھا میں نے اس زخم کو آج بھی تازہ رکھا ہوا ہے اور ایک اور بات..... برب وادی کے نواح میں اس طوفانی شب اس اندھیرے تہہ خانے میں جہاں تم نے مجھے روستے ہوئے پایا تھا اور ایک چیز میں نے جلدی سے چھپائی تھی اور تمہارے بہت اصرار پر بھی نہیں دکھائی تھی وہ تمہاری اور میری بچپن کی تصویر تھی۔ اس تصویر کو میں نے خود سے کبھی جدا ہونے نہیں دیا۔ اس کی ایک کاپی میں تمہارے پاس چھوڑے جا رہی ہوں جبکہ اصل تصویر میرے پاس ہے۔ میں دنیا کے کسی گمنام گوشے میں بیٹھ کر اس تصویر کو دیکھا کروں گی اور تمہاری یاد میں ڈھیروں آنسو بہایا کروں گی۔ شاید..... شاید تم بھی اس تصویر کو دیکھ کر.....“

خط کی تحریر یہاں تک پہنچتے پہنچتے آنسوؤں کی وجہ سے کافی پھیل گئی تھی۔ اگلا پورا جملہ آنسوؤں کی نذر ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط پکپکا رہا تھا اور میرا پورا وجود زلزلے کی زد میں تھا۔ ہاں اس نے دو دفعہ مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ ایک دفعہ تب جب کیمبرو کے جنگل میں بیٹھے ار نے مجھ سے کہا تھا۔ ”نوئی! تمہیں ہی محبت کا اظہار کرنا ہے۔“ اس وقت مجھے شک سا پڑا تھا مگر میں اس کی بات کے اندر چھپے ہوئے مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ دوسری دفعہ بڑے آبشار میں بہتے ہوئے میں نے رابعہ سے پوچھا تھا کہ ”وہ مجھ سے محبت کرتی ہے ناں۔“ تو اس نے اس کے جواب میں محبت

کا اقرار کیا تھا مگر اس کی آواز شوریدہ سرلہروں کے شور میں دب کر رہ گئی تھی اور..... زمین دوز زر زوف کی سزا سے مجھے ایسے ہی چھکارا نہیں ملا تھا بلکہ اس کے لئے رابعہ نے اپنی عزت کی قربانی دی تھی..... وہ میرے لئے کیا کچھ کرتی رہی تھی اور میں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں نے خط کی پشت پے لگی تصویر پلٹ کر دیکھی تو سینے میں ایک نشتر سا تر گیا وہ میری اور رابعہ کی بچپن کی تصویر تھی۔ میں کیمبرے کی طرف دیکھ رہا تھا جب کہ رابعہ بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلابی مسوڑھوں میں جڑے دانت موتیوں کی مانند دکھ رہے تھے۔ یہ خط ڈیڑھ ہفتہ قبل لکھا گیا تھا۔ ریاؤں کے بند ٹوٹ جانے کے بعد بھی اتنا پانی بستیوں میں نہیں آتا ہو گا جتنا آج میری آنکھوں میں نا..... مجھے یہ شک تو ہمیشہ سے تھا کہ شاہنواز سے رابعہ کی وابستگی کسی دباؤ کا نتیجہ ہے لیکن اس دباؤ کی تیقت اور شدت مجھ پر آج کھلی تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ دباؤ ایک نفسیاتی روگ کی مانند تھا جس نے رابعہ کو ہمیشہ جکڑے رکھا ہے اور مجھ سے دور رکھا ہے۔

میرا سینہ ہانڈی کی طرح کھول رہا تھا اور ہچکیاں سسکاریوں کی صورت میرے منہ سے نکل رہی تھیں۔ میرا دوست عمیر مسلسل فون پر مجھ سے پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ”علی نواز تم ٹھیک ہو..... تمہیں اچانک کیا ہوا کیا ہے؟ میں کب سے بول رہا ہوں تم کوئی جواب بھی نہیں دے رہے۔ یہ وہ آوازیں تھیں جو مجھے دور بہت دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ریسپور پھینک دیا تھا اور ار کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ چھوٹی بہن صائمہ نے میرا راستہ روکا۔ اماں نے مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی۔ ”علی نواز تجھے کیا ہوا ہے؟“ مگر میں دیوانوں کی طرح باہر والے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ بارش تابڑا زبری رہی تھی اور میں اپنے شہر کی گلیوں میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ یہ وہ گلیاں تھیں جہاں میری زندگی نے بیس سال گزرے تھے مگر اب یہ جگہیں میرے لئے اجنبی اجنبی سی تھیں۔ میری نگاہوں میں تیز اپ کا منظر تھا۔ انکل مدثر کی چھت کا ایک ویران کونا تھا اور ایک سسنان دریچہ تھا جس کی دہلیز پر بیٹھ میں اور رابعہ کھیلا کرتے تھے۔ کچھ آنسو تھے جو گرتے تھے اور میرا وجود جھلسا دیتے تھے اور تھوڑی بعد میں شاہنواز سے گڑیا چھین کر واپس رابعہ کو لایا کرتا تھا۔ وہ کھلکھلاتی تھی تو سارا جہان روشن ہوتا تھا۔ میں اسی روشن اجالوں سی مسکراہٹ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا مگر مسکراہٹ شاید میری پہنچ دور بہت دور جا چکی تھی۔

”علی نواز! رابعہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے..... رابعہ کسی کی بھی قسمت میں نہیں.....“ میں تقریباً دو گھنٹے مسلسل شہر کی سڑکوں پر بھاگتا رہا کبھی رک جاتا کبھی پھر بھاگنے لگتا تقریباً

ڈھائی گھنٹے بعد میں رابعہ کی خالہ کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ رابعہ کی دور کی خالہ مجھے بازو سے تھام کر اندر لے گئی۔ مجھے ہٹھایا کچھ دیر بعد میں نارٹل ہوا تو وہ بولیں۔

”سناؤ بیٹا! کیسے آنا ہوا؟“

میں ہیکے لہجے میں بولا۔ ”آئی..... رابعہ یہاں آئی تھی.....؟“

وہ بولیں۔ ”ہاں بیٹا! آج سے تقریباً دس دن پہلے یہاں آئی تھی تین چار دن یہاں رہی تھی پھر چلی گئی تھی.....“

”کہاں چلی گئی..... رابعہ.....؟“ میں روتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ میرے سامنے ایک خوبصورت نازنین چہرہ تھا جس کی آنکھوں سے نیلگوں شعاں پھوٹ رہی تھیں اور جس کی اجالوں جیسی پیشانی پے ہلال کی صورت زخم کا چھوٹا سا ایک نشان تھا جو تازہ تھا..... بالکل تازہ۔

”بیٹا جاتے وقت کہہ رہی تھی کہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پاکستان سے جا رہی ہوں۔ اب شاید کبھی پاکستان کی شکل نہ دیکھوں..... میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں جائے گی تو بولی دنیا بہت بڑی ہے کہیں بھی چلی جاؤں گی..... میں نے کہا کہ زمبابوے واپس جاؤ گی تو وہ بولی نہیں زمبابوے میں اب میرا دل نہیں لگے گا۔ میں ایسی جگہ جاؤں گی جہاں مجھے کبھی کوئی نڈھونڈ سکے..... وہ جہاں چلی گئی مجھے کچھ خبر نہیں۔“

خالہ باتیں کر رہی تھی اور غم کی شدت سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ کچھ آنسو باہر گر رہے تھے اور کچھ حلق کے اندر۔ میرے گلے میں ناکامیوں کا پھندا سا لگ گیا تھا۔ میں راہ زندگی کا لٹا ہوا وہ مسافر تھا جس کا سب کچھ چھن گیا تھا۔ میری نگاہوں میں زمبابوے کے کئی مناظر گڈمڈ ہونے لگے۔ میرے سینے میں ایک بیکراں غلامودار ہو چکا تھا۔ ایسا خلا جس میں اذیت کی مقدار رابعہ کی چاہت سے بھی زیادہ تھی۔ میں میں شکستہ و ریختہ نڈھال وجود لے کر وہاں سے اٹھ پڑا۔ میری ہچکیوں میں شدت آگئی تھی میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے مجھے نسوانی ہچکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے گھوما۔ پردے کے دوسری طرف کھڑا کوئی ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا پھر اس کے رونے میں شدت آگئی۔ میں بڑی سرعت سے اس جانب بڑھا۔ پردہ کے دوسری جانب میری سب سے عزیز متاع میری رابعہ کھڑی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار گر رہے تھے۔ اس کے ترہتر گلابی ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کی پیشانی کے تازہ زخم میں اس کی انتھک وفاؤں کا نصاب لکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں وہی تصویر تھام رکھی تھی جس میں وہ مسکرا کر میری طرف

دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب ہوا تو اس نے اپنے دونوں بازو میرے سینے پے دھر دیئے اور نہایت نجیف آواز میں بولی۔

”نوئی! خالہ کو ایسا کرنے کا میں نے خود ہی کہا تھا۔ مجھے ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی پاکستان ہمیشہ کیلئے چھوڑ جانا تھا مگر ہزار ہا کوشش کے باوجود بھی میں ایسا نہیں کر سکی..... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی نوئی..... تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟“ روتے روتے وہ میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اسے ہانہوں میں بھر لیا اور اس کا ترہتر چہرہ چومتا چلا گیا۔ اس کی پیشانی کے زخم کو اپنے ہونٹوں سے سہلاتا چلا گیا۔ نیلی نگاہیں میری نگاہوں کے آس پاس گھومنے لگیں تھیں۔

”مجھ سے دور جانے کی بات کرو گی تو جان لے لوں گا تمہاری سمجھیں تم.....“ میں نے آنسوؤں سے ہیکے لہجے میں کہا تو رابعہ اس زور سے میرے ساتھ آگئی کہ برسوں کے غم جیسے دور ہو گئے۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کا وجود سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ میرے ہی وجود کا حصہ بن جانا چاہتی تھی۔

رابعہ سے میری شادی ہو چکی ہے اور وہ تین خوبصورت بیٹوں کی ماں بن چکی ہے۔ وہ ایسی بیوی ثابت ہوئی ہے جسے دیکھ کر دل اور آنکھوں میں ٹھنڈک اتر جاتی ہے۔ یہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے کچھ سمجھ ہی نہیں آتی اسکی۔ انسان تمام عمر خواہشات کے پیچھے بھاگتے گزار دیتا ہے۔ کچھ میں منزل ملتی ہے کچھ میں حسرت و ناامیدی ہاتھ آتی ہے۔ میری بیٹوں کی خواہش تو پوری ہو چکی ہے۔ مگر بیٹی کی خواہش نا تمام رہ گئی ہے۔ خدا کرے مجھے بیٹی کی نعمت بھی میسر آ جائے..... اس کا نام میں بہت پہلے سے سوچ چکا ہوں۔

اس کا نام رینا کے علاوہ اور بھلا کیا ہو سکتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے.....؟

=====